فارسی کا کلاسیکی ادب
کلیاتِ غالب فارسی
جلد اوّل
از
مرزا اسداللہ خاں غالب
مرتبہ
سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
مجلس ترقی ادب ۔ لاہور

فاضل مرتب نے غالب کے فارسی کلام کی مرحلہ بہ مرحلہ ترتیب و اشاعت کا جو سراغ لگایا ہے ، اس کے مطابق سب سے پہلے غالب نے کلکتے میں مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش سے ایک دیوان مرتب کیا جس کا مخطوطہ مالک رام صاحب کے پاس موجود ہے ۔ پھر ۱۸۳۴ع میں ''میخانۂ آرزو'' کے نام سے ایک فارسی دیوان مرتب ہوا لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا ، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ یہی ''میخانۂ آرزو'' دراصل ''دیوان فارسی'' ہے جو ۱۸۴۵ع میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ۔ ۱۸۶۳ع میں کلیات غالب فارسی پہلی مرتبہ شائع ہوا ۔ پھر ۱۸۷۲ع میں دوبارہ شائع ہوا اور ۱۸۹۳ع میں سہ بارہ ۔ مالک رام صاحب نے ۱۹۳۸ع میں اور اورینٹل کالج میگزین نے ۱۹۶۱ع میں بھی غالب کا کلام شائع کیا ۔

زیر نظر کلیات کی ترتیب میں مرتب نے جس محنت اور کاوش سے کام لیا ہے اس کا اندازہ موصوف کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے :

''میں نے اپنی ترتیب جدید میں ان سب کتابوں کو سامنے رکھا ہے اور سب کے زوائد کلیات میں لیے ، پھر ان معاصر نسخوں کے بعد متفرقات غالب تالیف مسعود حسین صاحب ادیب ، آثار غالب تالیف جناب قاضی عبدالودود صاحب ، غالب تالیف جناب مہر اور دوسرے مقالات و مضامین ، معاصر اخبارات و رسائل کی چھان بین کی ۔

''غالب کے کلام فارسی کی متداول ترتیب کے ساتھ دوری ترتیب بھی ہو گئی ہے ، یعنی ۱۸۲۳ع ببعد سے ۱۸۴۵ع تک کا کلام پہلے ، ۱۸۴۵ع سے ۱۸۶۳ع تک کا کلام اس کے بعد ، ۱۸۶۳ع سے ۱۸۶۹ع تک کا کلام اس کے بعد ۔ قصائد میں غزلیات ، غزلیات میں رباعیات کی زحمت سے بچانے کے لیے ہر صنف کو اسی کے ساتھ رکھا ہے ۔ حاشیے میں قابل ذکر بات عرض کر دی ہے ۔

کلیات غالب فارسی (جلد اول)

*

طبع اول : جون ۱۹۶۷ء

تعداد ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیِ ادب، لاہور

مطبع : محمود پرنٹنگ پریس گلبرگ، لاہور

مہتمم : سید محمود شاہ

تصاویر و سرورق : مطبع عالیہ لاہور

قیمت جلد اول : روپے

بعونِ صناعِ مکین و مکان بفضلِ خلاقِ زمین و زمان
۱
فارسی کا کلاسیکی ادب
کُلّیاتِ غالب فارسی
(جلد اول)
مرتبہ:
سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
ناشر
مجلسِ ترقیِ ادب
۲- نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ
لاہور

فہرست

صفحه

(مندرجات دیوان طبع اول دهلی)

تعداد اشعار صفحه

(شامل کلیات طبع لکھنو)

(تهنیت عطای ملک ، رام پوری) :

تعداد اشعار صفحه

(بعد ١٨٦٣ ع)

تعداد اشعار صفحه

(زائد از کلیات)

قطعات:

———

عکس شبیہ چاپ اول لکھنو

پیش گفت

از

مرتضیٰ حسین فاضل

خاندان :

امیر خسرو سے غالب تک بر صغیر پاک و ھند میں سینکڑوں شاعروں نے فارسی میں طبع آزمائی کی اور دادِ سخن لی ، مگر شہرت و مقبولیت کی جو سند خسرو نے پائی ، وہ کسی کے حصے میں نہ آئی ۔ وسطی عہد مغل میں بیدل پیدا ھوئے جن کا نام کابل و قندھار پہنچا اور مدتوں ارباب ذوق پر رنگ بیدل غالب رھا ۔ مغل دربار کے آخری تاجدار نے جاہ و جلال ، مال و منال میں صرف قلعۂ معلیٰ ھی پایا تھا ، اس لیے عرفی و ظہوری جیسوں کی پرورش کہاں ھو سکتی تھی اور ابوالفضل و صائب جیسے باکمال کیسے پیش کیے جاسکتے تھے ۔ ھاں حسن اتفاق سے جس طرح ایران کے تیموریوں میں سلطان حسین بایقرا (۸۷۲ھ - ۱۴۶۷ع تا ۹۱۲ھ - ۱۵۰۶ع) نے عبدالرحمان جامی جیسا گلِ سرسبد پا لیا ، تقریباً اسی طرح برصغیر کے تیموریوں میں بہادر شاہ ظفر (۱۲۵۰ھ - ۱۸۳۵ع تا ۱۲۷۳ھ - ۱۸۵۷ع) کے دربار میں نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ ، غالب نظر آتے ھیں ۔

بر صغیر کے مشترک ثقافتی عہد میں غالب شعر و ادب کے حرف آخر قرار پائے اسی لیے ان کا نام اور کام یادگار ھے ۔ گو اپنے خیال کے مطابق غالب کچھ اور بننا چاھتے تھے ، انھیں خانخاناں ، ابوالفضل اور فیضی پر رشک تھا ۔ سپاھی زادہ و نواب ھونے کی بنا پر کسی بڑی ''دستگاہ'' کی تمنا تھی :

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواھشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

غالب نے اُردو نظم و نثر میں جو کچھ لکھا اسے شہرت عام و بقاے دوام حاصل ہے - فارسی میں پنج آہنگ ، مہر نیمروز ، دستنبوی (کلیات نثر)، قاطع برہان ، درفش کاویانی ، کلیات نظم ، مثنوی ابر گہربار ، سبد چین ، سبد باغ دودر کی طباعت و اشاعت تو ہوئی مگر اجنبی حکومت اور حریف قوموں کی سیاست نے اسلامی علوم و السنہ کے خلاف جو مہم شروع کی ، اُس کے نتیجے میں فارسی سے شغف کم ہوتا چلا گیا - فارسی کے شعر آج بھی روزمرہ میں استعمال ہوتے ہیں مگر ان شاعروں کے نام اور کام سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق نہیں -

مرزا محمد اسداللہ بیگ کے اجداد قفقاز و سمرقند سے تعلق رکھتے تھے - کلیات میں ہے :

غالب از خاک پاک تورانیم لاجرم در نسب فره مندیم
ترک زادیم در نژاد همی بسترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعهٔ اتراک در تمامی ز ماه ده چندیم
فن آبای ما کشاورزیست مرزبان زادهٔ سمرقندیم

یہ سلجوقی بلکہ افراسیابی اور پشنگی (بقول غالب) دشت خفچاق سے ہوتے ہوئے سمرقند پہنچے اور ترسم خان سمرقندی کے فرزند قوقان بیگ وطن چھوڑ کر لاہور آ گئے - دہلی میں ذوالفقار الدولہ نجف خان صفوی[1] مختار عام شاہ عالم بادشاہ دہلی کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا - لاہور کی سیاسی افراتفری کی وجہ سے قوقان بیگ دہلی آ کر نواب ذوالفقار الدولہ نجف خان بہادر سے وابستہ ہو گئے - مرزا غالب کے والد عبداللہ بیگ[2] اور چچا نصر اللہ بیگ کی ولادت دہلی میں ہوئی -

---

۱- نجف خان نے شاہ عالم کے آخری دور کو اپنی بہادری اور حسن سیاست سے بڑی تقویت پہنچائی - ان کی وفات ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ع میں ہوئی -
۲- کلیات نثر ، صفحہ ۱۵۴ -

'مہر نیمروز'[1] میں لکھتے ھیں :

''و در دفتر سپہبد شاہ ، ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان توقیع نوکری شاھش نوشتند و بر پرگنہ پھاسو برات روزی وی و سپاھش نوشتند ۔''

قوقان بیگ کے بعد عبداللہ بیگ اور نصر اللہ بیگ فوجی ملازمت سے منسلک ھوگئے ۔ عبداللہ بیگ پہلے نواب آصف الدولہ مرحوم (متوفی ۱۲۱۲ھ ـ ۱۷۹۷ع) ، پھر نظام علی خان آصف جاہ ثانی (زمانۂ[2] حکومت ۱۱۷۵ھ تا ۱۲۱۸ھ) کی فوج میں ملازم ھوئے ۔ لیکن کچھ دنوں بعد راجا بختاور سنگھ والیِ الور کے لشکر میں آ گئے اور:

''چون[3] پنجسال از عمر من گذشت ، پدر از سرم سایہ برگرفت ۔ عم من نصراللہ بیگ خان چون خواست کہ مرا بناز پرورد ، مرگش فراز آمد ، کما بیش پنج سال پس از گذشتن برادر پئی مہین برادر برداشت و مرا درین خرابہ جا تنہا گذاشت ۔ و این حادثہ کہ مرا نشانۂ جانگدازی و گردوں را کمینہ بازی بود ، در سال ھزار و ھشتصد و شش عیسوی بہنگام ھنگامۂ لشکر آرائی و کشور کشائیِ صمصام الدولہ جرنیل لارڈ کیننگ صاحب بہادر بروی کار آمد ۔''

راجا شیودھان سنگھ کی تعریف[4] کرتے ھوئے اپنے والد کی

۱- مہر نیمروز ، مشمولہ کلیات نثر ، صفحہ ۲۶۷ ۔

۲- غالب اور حیدر آباد : نصیرالدین ھاشمی ، نقوش لاھور ، صفحہ ۱۵۹ (خاص نمبر) ۔

۳- کلیات نثر ، صفحہ ۱۵۴ ۔

۴- زیر نظر کلیات میں صفحہ ۲۸۹ پر کیننگ کے نام قصیدے میں بھی اس بات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ھے :

بکودکی شدہ ام ریزہ چین خوان نوال
نہالم از ثمر پیش رس ببار آمد

خدمت گذاری اور رحلت کا بھی ذکر کیا ہے :

زان پس که گشت گوهر من در جهان یتیم
زان پس که کشته شد پدر من بکارزار
کافی بود مشاهده ، شاهد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار
در پنج سالگی شده‌ام چاکر حضور
رنگین سخن طرازم و دیرین وظیفه خوار[1]

۱۲۱۷ھ - ۱۸۰۲ع میں والد کا انتقال ھوا اور چچا نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا - ۱۲۲۱ھ — ۱۸۰۶ع میں چچا بھی میدان جنگ میں کام آئے - راجا الور نے عبداللہ بیگ کی اولاد کے لیے کچھ وظیفہ اور کچھ زمین عطا کی تھی - چچا کے مرنے پر انگریزوں نے یتیم بھتیجوں اور متعلقین کے لیے پنشن مقرر کر دی جو تھوڑی بہت مقدار میں کسی نہ کسی طرح مرزا کو ملتی رھی - ۱۸۵۷ع کے ھنگامے میں جب پنشن ضبط ھوئی تو غالب نے اپنی خاندانی خدمات ِ سپہ گری و جاں‌نثاری جتاتے ھوئے انگریزی حکومت سے دوبارہ اجرائے وظیفہ کا مطالبہ کیا - اسی سلسلے میں لارڈ کیننگ کو ۲۴-دسمبر ۱۸۶۰ع ، یعنی بڑے دن کے موقع پر قصیدے میں لکھا :

ز بندگان شہنشه من آن کسم که مرا
دعا طراز کلام و وفا شعار آمد
بکودکی شده ام ریزه چین خوان نوال
نہالم از ثمر پیش رس ببار آمد[2]

۱- زیر نظر کلیات ، جلد ۲ ، صفحہ ۳۴۶—یہ قصیدہ ۱۸۶۰ع میں لکھا ہے -
۲- زیر نظر کلیات ، جلد ۲ ، صفحہ ۲۹۲ -

غالب کی ولادت :

''بوقت[۱] شب چہار گھڑی پیش از طلوع صبح، روز یکشنبہ ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ'' مطابق ۲۷ - دسمبر ۱۷۹۷ع آگرے میں مرزا غالب پیدا ہوئے۔

کلیات کے نویں[۲] قصیدے میں مرزا صاحب نے اپنا زائچۂ ولادت نظم کر دیا ہے - ان کا خیال ہے کہ روز ازل ہی سے ان کی قسمت میں چکر اور ان کے نصیبے میں پھیر تھے :

مگوی زائچہ کاین نسخہ ایست از اسقام
مگوی زائچہ کاین جامعیست از اضداد

کلیات کے خاتمے[۳] میں ایک جگہ مرزا صاحب نے تاریخ ولادت لکھی ہے جسے مذکورہ قصیدے کا خلاصہ کہہ لیجیے یا مرزا کی نفسیاتی زندگی اور فکری الجھنوں کا آئینہ :

غالب چو ز ناسازی فرجام نصیب
هم بیم عدو دارم و هم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس
هم ''شورش شوق'' آمد و هم لفظ ''غریب''

۱۲۱۲ھ ۱۲۱۲ھ

مرزا غالب کی والدہ عزت النساء بیگم صاحبہ آگرے کے رئیس اور سرکار میرٹھ کے ایک فوجی افسر مرزا غلام حسین خان کمیدان کی صاحب زادی تھیں۔ پیپل منڈی آگرے میں ''کلاں محل'' نامی محل سرا ان ہی کی تھی - غالب نے اپنی زندگی کے بہترین دن یہیں

۱، ۲- زائچہ متعلق بہ قصیدہ ''در منقبت جگر گوشۂ رسول کونینؐ سیدالشہدا'' جلد دوم، صفحہ ۵۴ -

۳- دیوان فارسی، طبع دهلی، صفحہ ۵۰۴، ۵۰۵ -

گزارے ۔ والد کی رحلت اور چچا کے انتقال کے بعد نانا ، نانی نے ان کی ناز برداریاں کیں ۔

غالب نے آگرے میں تعلیم حاصل کی ۔ خیال ہے کہ الف بے اور قرآن مجید جیسے ابتدائی مدارج گھر پر کسی استاد کی مدد سے اپنے نانا یا والدۂ ماجدہ کی نگرانی میں طے کیے ۔ پھر مولوی محمد معظم[1] اور دوسرے اساتذہ سے درس لیا ۔ خود غالب اپنی عربیت کے بارے میں کہتے ہیں :

''میں نے ایام دبستان نشینی میں ''شرح مأة عامل'' تک پڑھا ۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور میں منہمک[2] ہو گیا ۔''

تفتہ کے نام خط میں ہے :

''میں عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں ۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں[3] ۔''

اور دیباچۂ کلیات میں لکھا ہے:

''شخص استعداد مرا پیرایۂ نازش فضلی و تشریف وجود مرا سرمایۂ برازش کمالی نیست ۔ نہ ترانۂ صرف و اشتقاقم بر لب است و نہ زمزمۂ سلب و ایجابم بزبان ۔ نہ خون صراحم بگردن است و نہ نعش قاموسم بردوش ، نہ آبلہ پای جادہ صنائعم و نہ گوہر آمای رشتۂ بدایع[4] ۔''

۱۔ پنج آہنگ میں ''میراعظم علی مدرس مدرسۂ اکبر آباد'' کے نام بڑا عاجزانہ و با احترام خط ہے ۔ ممکن ہے کہ مرزا صاحب کے استاد ہوں (کلیات صفحہ ۱۰۲)

۲۔ خطوط غالب ، جلد ۱ ، صفحہ ۸۲ ۔

۳۔ غالب ، ۲۸ ، بحوالہ دیباچہ دیوان غالب اردو ۔

۴۔ کلیات طبع ہذا ، جلد اول ، صفحہ ۱۰۷ ۔

فارسی میں کمال:

یوں تو پورے ملک میں فارسی ، علمی زبان اور شرفاء کا طرۂ امتیاز تھی لیکن تازہ وارد ایرانی خاندانوں میں تو گھر کی بات چیت بھی فارسی ھی میں ھوتی تھی - مرزا غلام حسین کمیدان کے بارے میں ابھی تک یہ معلوم نہیں ھو سکا کہ وہ ایرانی تھے یا تورانی ، یا مدتوں سے یہیں کے رھنے والے تھے - ھاں عبد اللہ بیگ کے بارے میں قطعی طور سے کہا جا سکتا ھے کہ سمرقند و بخارا کی زبان کے علاوہ اگر کوئی زبان بلاتکلف بول سکتے ھوں گے تو وہ فارسی ھوگی - مرزا غالب نے فارسی ھی کے میٹھے بول سن کر بولنا سیکھا - ھوش سنبھالا تو محسوس کیا :

''فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ھے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزین ھیں جیسے فولاد میں جوھر -'' (خطوط غالب ، جلد ۱ ، صفحہ ۸۳)

دیباچۂ کلیات میں اپنی عربی دانی کا ذکر لکھنے کے بعد فرماتے ھیں :

'' کباب گرمی آتش بی دود پارسیم و خراب تلخی بادۂ پرزور مغی ۱ -''

''قاطع برھان'' طبع اول صفحہ ۷ پر اس ذوق کی تاریخ اور اس رجحان کا پس منظر یہ لکھا ھے :

''شت ھرمزد نام پارسی نژاد فرزانۂ بود از تخمۂ ساسانیان - پس از گرد آوردن دانش، کیش اسلام گزیدہ و خود را عبدالصمد نامیدہ در سال یکہزار و دویست وبست و شش ھجری بطریق سیاحت بہند آمدہ و بہ اکبر آباد کہ پیکر پذیرفتن وخرد آموختن من ھمدران شھر خجستہ بہر بودہ است ، دو سال بکلبۂ احزان من آسودہ است و من آئین معنی آفرینی و کیش یگانہ بینی

۱- دیباچہ کلیات طبع ھذا ، جلد ۱ ، صفحہ ۱۰۷ — 'مغی' اس طرح چھپا ھے کہ ''معنی'' پڑھا جاتا ھے - تصحیح فرمالیں -

ازوی فرا گرفته ام ۔''

ایک خط میں اسی بات کو یوں نقل کیا ہے :

''بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا ۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے ۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے ۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے[1] ۔''

۱۲۲۶ھ — ۱۸۱۱ع میں مرزا غالب کی عمر چودہ سال کی تھی ۔ شادی ہوئے سال سوا سال گزرا ہوگا ۔ انھی دنوں ایک ایرانی[2] سے فیض پانے کا موقع مل گیا جس سے ذہن کا سونا کندن بن گیا ۔

شاعری کا آغاز :

ذوق سخن سنجی اور طبع رسا خداداد انعام ہے ۔ غالب اس نعمت سے فیض یاب اور اس احسان خداوندی سے سرفراز تھے ۔ نو دس برس کی عمر میں گنگنانا اور گیارہ بارہ برس کے سن میں شعر لکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ۔ مرزا صاحب نے اپنی شاعرانہ

۱- مکاتیب غالب ، طبع ۱۹۴۹ع ، صفحہ ۶۰ ۔ مکتوب بنام نواب خلد آشیاں یوسف علی خان صاحب ۔

۲- مولانا حالی نے 'یادگار غالب' میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ ملا عبدالصمد ایک فرضی نام تھا ۔ میرے خیال میں اس شخص کو بالکل فرضی شخصیت ماننا مشکل ہے ۔ رہا ''بے استاد'' کہلانا اور اس سے بچاؤ تو آخر شعر و شاعری میں بھی تو بےاستادے ہی تھے ۔ اس سلسلے میں مالک رام صاحب اور عبدالودود صاحب اور دوسرے محققین نے بہت بحثیں کی ہیں جن کے اعادے کا یہ موقع نہیں ہے ۔

صلاحیتوں کا متعدد مرتبہ ذکر کیا ہے؛ مثلاً سلطان محمد میسوری کو لکھتے ہیں :

(الف) ''روشن ترک این کہ در دہ سالگی آثار موزونی طبع پیدائی گرفت ، تا لختی سرمایۂ دید و دانست فراز آمد ۔ زبان انداز گزارش وکلک آیین نگارش یافت[1] ۔''

(کلیات نثر، صفحہ ۹۳۶)

کلیات فارسی کے خاتمے مکتوبہ ۱۲۵۳ھ میں تحریر کیا ہے :

(ب) ''از روزی کہ شمارۂ سنین عمر از احاد فرا ترک رفت ، و رشتۂ حساب زحمت یازدهمین گرہ بخود بر گرفت ، اندیشہ در روارو گام فراخ برداشت ، وکریوہ و مغاک بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد ۔''

(کلیات طبع اول صفحہ ۵۵۳ ببعد ۔ دیوان طبع دهلی، صفحہ ۴۰۵)

۱۸۵۷ع میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے :

(ج) ''بارہ برس کی عمر سے کاغذ ، نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں ۔''

(خطوط غالب ، طبع الہباد ، مکتوب بنام قدر ، فروری ۱۸۵۷ع)

قدر بلگرامی هی کو لکھتے ہیں :

(د) ''قبلہ! ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا ۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا :

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا ۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع هو گیا ۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا ، اوراق یک قلم

۱۔ یہ خط 'پنج آهنگ' طبع اول و دوم دهلی میں نہیں ہے ۔ 'پنج آهنگ' مشمولہ کلیات میں ہے ۔

چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔''
(عود ہندی، طبع اول میرٹھ، صفحہ ۱۰۹۔ عود ہندی طبع مجلس ترقی ادب، مرتبہ راقم، صفحہ ۳۹۰)

آخر میں یہ کہہ کر بات ختم کر دی :

(٥) ''حضرت! فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے، شعر سننا تو ممکن ہی نہیں - بہرا ہوں، شعر دیکھنے سے نفرت ہے - پچھتر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ سال بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔ [۱]''

ان بیانات سے معلوم ہوا کہ :

۱ - دس گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی (۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ع - ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ع)

۲ - چودہ پندرہ برس کے سن میں یہ شوق فن کی منزلوں میں داخل ہوا (۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ع)

۳ - پچیس برس میں یہ دور ختم کر دیا (۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ع)

۴ - نسخۂ حمیدیہ ٥ - صفر ۱۲۳۷ھ مطابق یکم نومبر ۱۸۴۱ع کا مکتوبہ ہے - گویا مرزا غالب نے آردو سے توجہ ہٹا لی - شاید انھی دنوں تخلص بھی بدل لیا ہو -

فارسی شعر گوئی :

مرزا غالب کی کتابوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انھیں ابتدا ہی سے بیدل، ظہوری سے دلچسپی تھی - وہ بیس پچیس برس تک آردو میں شعر کہتے رہے - آس زمانے کا جو ذخیرہ دستیاب ہو سکا ہے،

۱- خطوط، جلد ۱، صفحہ ۱۷۷ -

اس سے ثابت ہے کہ مرزا صاحب کو فارسی پر عبور ہے ۔ وہ مشکلات فن اور دشوار پسند شاعروں کو سمجھ بھی سکتے ہیں اور ان کے طرز میں کامیاب پیش کش تیار کرنے پر بھی قادر ہیں ۔ انھوں نے اس اسلوب میں آردو شاعری کر کے بڑی حد تک ناپسندیدگی کا سامنا کیا ، لہذا کوئی بعید نہیں کہ جس خود اعتمادی اور ذوق برتر پسندی نے دبی قوتوں کو ابھارا ہو اور وہ صرف فارسی میں شعر کہنے لگے ہوں ۔ اب تک ان کا تخلص اسد تھا[۱] مگر اس خیال کے آتے ہی شرکت تخلص سے بھی ہاتھ اٹھایا ۔ مولانا حالی فرماتے ہیں کہ :

"انھوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے ، گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا ۔"
(یادگار غالب ، طبع دوم ، صفحہ ۹۷)

اگر یہ روایت صحیح ہے اور سردست اس کی تردید مشکل ہے ، تو اس کا ماحصل یہ ہوگا کہ غالب گیارہ بارہ نہ سہی ، چودہ پندرہ برس کی عمر سے ظہوری کے طرز و کلام سے استفادہ کرنے اور فارسی میں شعر کہنے کے قابل ہو چکے تھے ۔ اس روایت کے علاوہ ہمارے پاس کوئی شہادت ایسی نہیں جس کی بنا پر ہم غالب کے ابتدائی فارسی کلام کا سراغ لگا سکیں ۔ ہاں نسخۂ حمیدیہ میں ایک قطعہ درج تھا جو طبع اول آگرہ کے صفحہ ۲۸۹ پر چھپ چکا ہے ۔ یہ قطعہ دیوان فارسی طبع اول دہلی اور کلیات طبع اول لکھنو میں بھی موجود ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارسی کلام میں سب سے قدیم شعر یہی ہیں جو مرزا غالب نے لکھے، کیونکہ تقریباً یہ مانا جا چکا ہے کہ غالب نے اپنا پہلا باقاعدہ دیوان وہی مرتب کیا

۱- اس زمانے میں میر امانی اسد ایک شاعر گزرے ہیں ۔
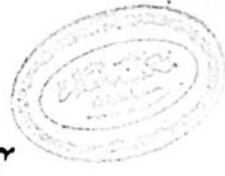
جو ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ع کا مخطوطہ بھوپال سے ملا ، اس میں یہ قطعہ موجود ہے :

بہر ترویج جناب والی یوم الحساب
ضامن تعمیر شارستان دلہای خراب

غالب کہہ چکے ہیں کہ پچیس برس کی عمر میں ''دیوان آردو کو دور کیا ، اوراق یک قلم چاک کیے'' یعنی اب آردو چھوڑ کر فارسی کی طرف مائل ہوئے ۔

''فاتحہ'' کا قطعہ جسے محترم امتیاز علی عرشی صاحب[1] اور مصحح ''نسخۂ حمیدیہ'' کی نقل کے مطابق پہلا قصیدہ (ورق ۴ پر ختم ہوتا ہے) لکھا گیا ہے ، دیوان میں اس قدر کاٹ چھانٹ کے بعد داخل کیا گیا جس سے گمان ہوتا ہے کہ قطعے کے ساٹھ شعر بالکل ابتدائی مشق کا نمونہ تھے ۔ مرزا نے ان میں سے تھوڑے سے شعر لیےاور انھیں بھی بڑی تبدیلیوں کے ساتھ شریک اشاعت کیا ۔ باقی شعر چھوڑ دیے ۔

غالباً ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ع سے ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۸۲۵ع تک غالب کے افکار و آلام بڑھتے گئے ۔ گھریلو الجھنیں ، آمدنی و خرچ کا عدم توازن ، سسرال میں نوا بی کے ٹھاٹھ اور ان کی گانٹھ گرہ میں کوڑی نہ تھی ۔ انگریزی حکومت سے جو پنشن مقرر ہوئی تھی وہ بھی سسرال والے دیتے تھے ۔ غرض مرزا گھبرا کر گھر سے نکلے (غالباً محرم ۱۲۴۲ھ مطابق اگست ۱۸۲۶ع میں یہ سفر شروع ہوا) ان کا خیال تھا کہ کلکتہ میں دعوی دائر کریں گے اور لگے ہاتھوں کمپنی کے سربراہوں کے ذریعے حکومت برطانیہ سے ''ملک الشعرائی'' جیسا کوئی خطاب حاصل کر لیں گے ۔ دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے لکھنو بھی پڑتا تھا ، سوچا کہ چلو وہاں بھی قسمت آزمائی کریں ۔ ممکن ہے دربار اودھ

۱- دیباچۂ دیوان غالب ، صفحہ ۷۶ ، طبع انجمن ترقی اردو ہند ، دہلی ۔

سے کچھ مل جائے - لکھنو پہنچے تو یہاں بادشاہ اور آغا میر کے لیے جو مدحیہ خامہ فرسائی کی ، وہ فارسی ہی میں تھی - لکھنو میں پانچ مہینے ٹھہر کر مشاعروں میں شریک ہوئے - ممکن ہے کہ فارسی شعر پڑھے اور سنے ہوں - اس زمانے میں لکھنو فارسی کا دبستان تھا - ایرانی اور ہندوستانی افاضل کے مجمعوں میں بحث و مذاکرات بھی ہوئے ہوں گے - تقریباً پانچ ماہ بعد یہاں سے کلکتے کے لیے چلے اور اله آباد ، بنارس ، عظیم آباد جیسے شہروں میں ٹھہرتے ہوئے کلکتہ پہنچے (۴ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۸۲۸ع — ذکر غالب صفحہ ۵۷) فورٹ ولیم کالج اب مدرسۂ عالیہ تھا - مدرسۂ عالیہ کے اہتمام سے انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا - مرزا نے بھی مشاعرے میں شریک ہو کر ہمام تبریزی کی زمین میں یہ غزل پیش کی:

تا کیم دود شکایت ز بیان برخیزد
بزن آتش که شنیدن ز میان برخیزد

(دیکھیے 'عود ہندی' بترتیب راقم ، طبع مجلس صفحہ ۱۴ - کلیات غالب طبع ہذا ، جلد ۳ - ذکر غالب ، **صفحہ ۶۳**) -

"پانچ ہزار آدمی فراہم تھے" اور مرزا پر اعتراضات کی بھرمار تھی - بات بڑھی اور پارٹیاں بن گئیں - یہاں کی بحثوں میں انھیں ایرانی ادیبوں اور تحریکوں کا علم ہوا - کلکتہ کے افاضل و ادبا سے مذاکرات کا موقع ملا جس سے ان کی طبیعت کندن ہو گئی اور فطری صلاحیتوں کو چار چاند لگ گئے - مباحثات اور علمی مسائل کی الجھنوں کے ساتھ دماغی تکلیف ، یعنی مقدمے کی ناکامی اور مقصد پورا نہ ہونے کے تصور سے وہ گھبرا گئے - انھوں نے دعا ، خوشامد اور درخواستوں کا سلسلہ شروع کر دیا مگر کچھ نہ ہوا - آخر وطن کے لیے رخت سفر باندھا اور اتوار کے دن

٢ جمادی الثانیه ١٢٤٥ھ مطابق ٢٩ نومبر ١٨٢٨ع کو دھلی پہنچ گئے مگر عالم یہ تھا :

قمر در عقرب و غالب به دهلی
سمندر در شط و ماهی در آتش

غالب کی فکر اور فن پر کلکتے کا بڑا اثر ھے - وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ھیں :

"من و خدا که اگر متاهل نبودمی و طوق ناموس عیال بگردن نداشتمی ، دامن برهرچه هست افشاندمی و خود را دران بقعه رساندمی -" (کلیات نثر ، صفحه ١٣٦)

ھمارے لیے یہ سفر ایک سوغات کا پیش خیمہ ثابت ھوا ، یعنی غالب نے اس سفر میں عرفی و نظیری کی یاد تازہ کر دی - اتنے عمدہ قصیدے لکھے کہ پھر ان کا جواب نہ دیا جا سکا - ایسی اچھی مثنویاں نظم کیں جو ظہوری و بیدل و غنیمت کو فراموش کرنے کا سبب قرار پائیں -

ترتیبِ کلامِ فارسی کا پہلا مرحلہ :

کلکتے میں مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش سے غالب نے ایک دیوان مرتب کیا جس کے دیباچے میں لکھا :

"چون در آغاز خار خار جگر کاوی شوقم همه صرف نگارش اشعار اردو زبان بود ، در مسلک این تحریر نیز همان جاده گذارده و همان راه سپرده شد - هر آئینه این چمنستان را دودر بروی هم کشودم - نخستین در را باشعار هندی بگوهر آمودم - دومین در چون آغوش شوق بروی پارسیان وا ست و نام این صحیفه بزبان ادا شناسان—گل رعنا—" (کلیات نثر ، صفحه ٥٩)

عرشی صاحب فرماتے ھیں :

"اس کا ایک مخطوطہ محبی مالک رام صاحب کو دست یاب

ہوا ہے۔ وہی میرے پیش نظر ہے۔ اس کا ناپ ۲ / ۹۱ × ۶ ہے۔ مسطر تیرہ سطری ہے ۔ کاغذ ولایتی باریک اور سفید ہے ۔ خط معمولی نستعلیق ہے ۔ متن کی روشنائی کالی ہے۔ تخلص شنجرف سے لکھا گیا ہے۔ جدولیں نیلی اور شنجرفی ہیں۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے نشان بھی پائے جاتے ہیں۔ گل رعنا میں پہلی مرتبہ فارسی کلام مرتب شکل میں ظہور پذیر ہوا۔

ترتیبِ کلامِ فارسی کی دوسری منزل:

کلکتے سے واپس آکر غالب کے لیے دہلی میں زندگی دوبھر ہو گئی۔ سسرالی جھگڑے، مقدمے کے قرضے، دوستوں کی بے رخی سے گھبرا کر شعر و شاعری سے دل بہلانے لگتے تھے۔ علی بخش خان کہتے ہیں:

''در آغاز سال یک ہزار و دو صد و پنجاہ و یک ہجری شمس الدین خان را بقضای آسمانی آن پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد و آں خود از غایت شہرت بشرح احتیاج ندارد و بعد آن ہنگامہ ہمدران ہنگام از جیپور بدہلی رسیدم وکاشانۂ برادر والا شان وآموزگار مہربان مولانا غالب زاد افضالہ فرود آمدم ۔ دراں ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمی بہ 'میخانۂ آرزو'، سر انجام است، تازہ فراہم آمدہ و پیرایۂ اتمام پوشیدہ بود۔'' (کلیات نثر پنج آہنگ، صفحہ ۳)

۱۰- جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ مطابق ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ع جمعرات کے دن نواب صاحب کو پھانسی دی ہے (ذکر غالب، صفحہ ۷۵)۔ علی بخش خان اسی سلسلے میں جے پور سے دہلی آئے اور مرزا صاحب ہی کے یہاں ٹھہرے ۔ غالب کو ان سے بڑی محبت تھی۔ علی بخش نے غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ ''میخانۂ آرزو'' پر مرزا نے فارسی نثر میں جو کچھ لکھا تھا اسے سبقاً سبقاً مرزا سے پڑھا۔

یعنی ''میخانۂ آرزو'' کے نام سے ایک فارسی دیوان ۱۲۵۰ھ مطابق

۱۸۳۴-۵ع میں مرتب ہو گیا تھا ۔ یہ دیوان یا کسی دیوان پر یہ نام ابھی تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا ۔ میرے خیال میں شاید اس نام کی حیثیت بھی ”پرتوستان“ جیسی ہے، یعنی دیوان پر یہ عنوان نہ لکھا جا سکا ۔

دیوان کی تکمیل آخری مرحلے میں :

'پنج آهنگ، میں نواب حشمت جنگ بہادر کے نام خط ہے :

”از دیر باز گاہ گاہ این آرزو از دل سر بر زدی کہ عریضہ نگار گردم وسرمایہ چہل سالۂ جگر کاوی خویش یعنی مجموعۂ اشعار فارسی بوالا حضرت فرستم ۔“ (پنج آهنگ، صفحہ ۱۰۴ دهلی ۱۸۵۳ع ۔ کلیات نثر ۲۱۱ لکھنو ۱۸۸۴ع)

اور دیوان فارسی طبع دهلی کے خاتمے میں لکھا ہے کہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷-۸ع میں میری عمر اکتالیس سال کی ہے اور دیوان مرتب کر چکا ہوں ۔ اس لیے میرے خیال میں وهی 'میخانۂ آرزو' سرانجام نواب حشمت جنگ کو ۱۲۵۱-۲ھ میں بھیجا گیا اور ۱۲۵۳ھ میں اسی پر نظر ثانی کر کے مقدمہ و خاتمہ لکھا ۔ یہی مجموعہ ”دیوان فارسی“ کہلایا اور اسی کی متعدد نقلیں بانکی پور پٹنہ، رام پور، علی گڑھ اور لاهور میں موجود ہیں ۔

لاهور کا خطی نسخہ مجھے محترمی جناب ڈاکٹر وحید مرزا صاحب کے پاس دیکھنے کو ملا ۔ اس مخطوطے کا ترقیمہ یہ ہے :

”تمت، تمام شد ۔ بتاریخ بست و سیوم شوال ؟۱۲۵ هجری مطابق بست و یکم جنوری ۱۸۳۸ع مطابق سنہ احد جلوس بہادر شاہ ۔ از درستی این دیوان فراغ دست داد ۔“

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی ستمبر ۱۸۳۷ع ۔ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ میں ہوئی ۔ ۱۲۵۳ھ ہی کو مرزا غالب کی عمر اکتالیس سال کی ہوتی ہے، اس لیے یہ نسخہ اہم ترین اور شاید قدیم تر ہے ۔

اس کے علاوہ ۱۲۵۴ھ اور ۱۲۵۷ھ کے نسخے میں دیباچہ و خاتمہ کی یکساں عبارتیں ہیں اور کلام بھی نادر و غیر مطبوعہ کہیں معلوم نہیں ہوتا ، اس لیے شاید یہ کہنا قرین قیاس ہوگا کہ دیوان غالب کی پہلی باقاعدہ ترتیب نے جنوری ۱۸۳۸ع میں آخری شکل اختیار کی ؛ یہی دیوان غالب کے فارسی کلام کا پہلا مجموعہ تھا جو شایع ہوا ۔

دیوان کی کیفیت و ترتیب :

یہ دیوان دیباچے سے شروع ہوتا ہے۔ دیباچے کے بعد صفحہ ۲۱ سے منظومات کا آغاز ہوتا ہے جسے ایک نظر میں دیکھیے :

صفحہ	عنوان	عدد	اشعار
۲۱	قطعات	۴۱	۳۸۶
۵۰	مثنویات	۵	۶۵۵
۹۴	فاتحہ	۳	۷۶
۹۹	نوحہ	۳	۴۰
۱۰۲	ترکیب بند	۲	۱۴۶
۱۱۳	قصائد	۳۱	۱۸۶۱
۲۴۱	غزلیات	۳۰۹	۳۳۴۹
۴۸۵	رباعیات	۸۴	۱۶۸

مجموعی اشعار: ۶۶۸۱ (چھ ہزار چھ سو اکاسی)

رباعیات کے بعد صفحہ ۵۰۲ سے ''تقریظ'' یعنی خاتمے کی عبارت شروع ہوتی ہے جو صفحہ ۵۰۶ کی بارھویں سطر پر ختم ہوتی ہے اور پانچویں سطر میں میزان اشعار ''شش ہزار و ششصد و ہفتاد و دو بیت'' بتائی گئی ہے ۔

دیوان کی طباعت :

فارسی دیوان کی ترتیب کے بعد نامعلوم اسباب کی بنا پر اس کی

اشاعت شروع ہونے کے بجائے آردو دیوان کی طباعت کا کام شروع ہو گیا - سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں بہادر سے مرزا غالب کے دوستانہ تعلقات تھے - ان کے پریس میں یہ دیوان کم از کم سال سوا سال رہ کر شعبان یا رمضان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ع میں شایع ہوا - آردو دیوان کی طباعت کے ساتھ ساتھ سید محمد صاحب نے فارسی دیوان چھاپنے کی تجویز پیش کی ہوگی - چنانچہ جان جاکوب کو غالب نے لکھا ہے :

''نہان نماناد کہ نقش مطبع سید الاخبار[۱] انگیختۂ طبع یکی از دوستان روحانی منست ہمانا کارفرمای این نو آیین کدہ آن می سگالد کہ درین کارگاہ نقشہای بدیع انگیزد و فروریختہ ہای خامۂ غالب بینوا را بقالب انطباع فرو ریزد - ازان جملہ دیوان ریختہ کہ در ناتمامی تمام است، عجب نیست کہ ہمدرین ماہ بتمامی، وانگاہ بنظر سامی رسد -

...پنج آہنگ و دیوان فارسی ، ہریکی وابستہ بفراہم آمدن درخواستہای خریدارانست بہنگام خود پی ہم بخدمت خواہد رسید -'' (پنج آہنگ ، طبع ۱۸۵۳ع ، صفحہ ۳۰۳—کلیات ۱۷۴)

اس خط میں تاریخ نہیں ہے - لیکن جناب عرشی صاحب اسے اکتوبر ۱۸۴۱ع مطابق شعبان ۱۲۵۷ھ کا مانتے ہیں (دیکھیے علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، صفحہ ۱۱۵)- اسی سال دیوان کی طباعت کی تحریک شروع ہو گئی اور یہ خبر بھی دور دور پھیل گئی کہ فارسی دیوان چھپ رہا ہے - تاریخ تو نہیں معلوم مگر ناطق مکرانی نے دیوان مانگا (متفرقات غالب ، صفحہ ۱۶) تو جواب میں غالب نے لکھا :

''ایں جا ہمدمان نقشی نہ بخواست من انگیختہ اند و مجموع

۱- یہ پریس ۱۸۴۸ع میں بند ہو گیا (صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ، صفحہ ۳۲ ، طبع دہلی)

گفتار مرا از قصیدہ و قطعہ و غزل و مثنوی بکالبد انطباع ریختہ اند۔ یک نسخہ بہر شما می فرستم۔'' (کلیات نثر، صفحہ ۲۴۴)

اس کے بعد 'باغ دودر' میں تفضل حسین خان کے نام مکتوب مورخہ ۱۰- مارچ ۱۸۴۵ع میں درج ہے:

''دریں روزہا دیوان فارسی من کہ کم و بیش ہفت ہزار بیت دارد، منطبع می شود۔ غالب کہ در عرض دو ماہ بپایان رسد۔'' (دومین در، صفحہ ۱۴۱- تاریخ تحریر ''یکم ربیع الاول ۱۲۶۱ھ'')

مگر ۴[1] ربیع الاول ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۴۵ع کے مکتوب بنام جواہر سنگھ جوہر میں یہ تفصیل ہے:

''دیوان فارسی در مطبع منشی نورالدین احمد[2] منطبع می شود و نوبت انطباع تا قصائد رسیدہ است۔'' (باغ دودر، دومین در صفحہ ۱۰۹)

اس تفصیل کے بعد مکتوب بنام نیکش میں ہے:

''دیوان فارسی من از دہلی تا مدراس و حیدرآباد و از لاہور تا ہرات و شیراز رسیدہ۔ قصیدہ مدح شاہ جنت آرامگاہ دران مندرج است و عالمی آنرا نگرستہ۔ این ننگ بر خود کی روا دارم کہ آنرا بنام دیگری ناسور کنم۔'' (دومین در، صفحہ ۱۶۳)

چونکہ ۲۶[3] صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۴۷ع کو امجد علی شاہ

۱- ''باغ دودر'' میں تاریخیں ہیں سنہ نہیں ہیں۔ میں نے تقویم سے لکھا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ناطق مکرانی کے خط مطبوعہ متفرقات غالب اور جواب مطبوعہ 'پنج آہنگ' کی تاریخیں متعین کی جا سکتی ہیں۔

۲- محمد عتیق صدیقی کہتے ہیں کہ نورالدین احمد نے دارالسلام نامی پریس محلہ حوض قاضی میں ۱۸۴۵ع میں قائم کیا تھا۔ (صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، حاشیہ صفحہ ۱۹۳)

۳- قیصرالتواریخ، جلد ۱، صفحہ ۳۸۵، طبع نول کشور ۱۹۰۷ع۔

نے رحلت فرمائی اور ان کی شان میں مدحیہ قصیدہ طبع زیر بحث کے صفحہ ۱۹۸ پر چھپ چکا ہے، اس لیے یہ خط مارچ (؟) ۱۸۴۷ع کا ہوگا۔
اس کے بعد ۲۷ اپریل ۱۸۴۷ع کو لکھتے ہیں:

''این سخن دو محل دارد ، یا خود آنست که مجموعۂ نظم منطبعہ مطبع منشی نورالدین احمد آنجا رسیدہ است ، و آنچه جز آن گفته باشم می‌خواهند ؟ همانا، اگر چنین باور دارید که پس از انطباع آن اوراق جز قصیدۂ تہنیت فتح پنجاب هیچ نگفته ام و اگر آنست که آن دیوان را کس دران دیار نبرده است؟ می بایست که آن مجموعه می‌خواستند ، نه اشعار پراگنده۔ بہرحال اگر بنویسند یک جلد دیوان بشما فرستم تا آنرا از جانب من به همایون خدمت حضرت مولانا (رجب علی خان ارسطو جاه) پیش کشند ۔[1]''

اس کے بعد اب بحث کو طول دینا نہیں چاہتا[2] ۔ خلاصہ یہ ہے کہ دیوان فارسی ۱۸۴۵ع کے وسط کے قریب چھپ گیا ۔ اپریل ، مئی یا جون کا مہینہ معین کیا جا سکتا ہے ۔

اس نسخے کا طول ساڑھے ستائیس سینٹی میٹر اور عرض تقریباً انیس سینٹی میٹر ہے ۔ کاغذ دبیز اور ہلکا سفید ہے ۔ کتابت بہت اچھی نہیں ، پندرہ سطری مسطر ہے ۔ صفحات پانچ سو چھ ۔ پھر دو صفحے[3] کا غلط نامہ اور ایک صفحے پر قطعات تاریخ نیر رخشان ۔ یہ ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا ۔

نواب علی بہادر خان کو غالباً ۱۸۴۹ع کے بعد ایک خط میں

۱- 'باغ دودر' دومین در، صفحہ ۱۱۱ ، خط بنام جوہر ۔
۲- مختلف حضرات نے اس کی اشاعت میں متعدد خیالات ظاہر کیے ہیں ۔
۳- ملاحظہ ہو عکس سرورق جلد اول میں اور عکس صفحۂ آخر جلد سوم میں ۔

غالب نے لکھا:

''مردم را سو بسو گماشتم، رفتند۔ دیوان فارسی و دیوان ریختہ فراچنگ نیامد۔'' (پنج آہنگ[1]، طبع ۱۸۵۳ع، صفحہ ۴۲۹)

کلیات کی تدوین:

دیوان فارسی کی اشاعت کے بعد 'پنج آہنگ' ۱۸۴۹ع میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد غالب دربار ظفر سے وابستہ ہو کر تاریخ نگاری میں الجھ گئے۔ ۵۵-۱۸۵۴ع میں 'مہر نیمروز' کی اشاعت ہوئی۔ پھر رستخیز بیجا نے 'دستنبو' لکھوائی۔ حالات ذرا رو براہ ہوئے تو قاطع برہان' منشی نول کشور کو چھپنے کے لیے دی (۱۸۶۱ع) جو ۱۸۶۲ع میں چھپ کر آئی[2]۔ اس درمیان میں لوگوں نے توجہ دلائی کہ فارسی دیوان میں جدید کلام کا اضافہ ہونا چاہیے۔ کچھ عزیزوں اور دوستوں نے بطور خود کلیات جمع کر لیا تھا۔ طے یہ پایا کہ کلیات بھی منشی نول کشور چھاپیں۔ اس لیے نواب ضیاء الدین خان سے ان کا نسخہ عاریۃً مانگنے کے لیے خط لکھا:

''آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھیے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں؛ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شہرت پائے، میرا دل خوش ہو، تمہاری تعریف کا قصیدہ اہل عالم دیکھیں، تمہارے

۱- یہ خط 'پنج آہنگ' طبع ۱۸۴۹ع میں موجود نہیں ہے۔

۲- میر مہدی مجروح کو ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ع کے خط میں لکھتے ہیں:
''کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔'' (خطوط غالب، جلد اول، طبع الہ آباد ۱۹۴۱ع، صفحہ ۲۷۲)

بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے ، اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں ۔''

مطبوعہ کلیات کے خصوصیات :

مندرجۂ بالا خط پر تاریخ نہیں لیکن ۱۸۵۹ع کے آخر بلکہ ۱۸۶۰ع کے کسی مہینے میں لکھا گیا ہے ۔ اس عبارت سے کلیات کے نسخوں ، نسخوں کی کیفیتیں اور سندی نسخے کا حال معلوم ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ منشی نول کشور نے نواب صاحب کے نسخے کو متن کی بنیاد قرار دیا ۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس کی کتابت امیر اللہ تسلیم نے کی ہو ۔ اور خود مرزا کی تصریح کے مطابق تصحیح ۱ مولوی ہادی علی نے کی ۔

تصویر اور زائچہ :

خطوط میں زائچے کے متعلق کسی قسم کے اطلاعات موجود نہیں ۔ ممکن ہے کہ حکیم مومن خان نے اس سلسلے میں مدد کی ہو ، کیونکہ مرزا صاحب ان سے تقویم حاصل کیا کرتے تھے (دیکھیے کلیات نثر صفحہ ۱۲۵) ۔ اور یہ بھی قطعی طور پر کہنا مشکل ہے کہ موجودہ تصویر قلمی تھی یا عکسی؟ اور اس کا مصور کون ہے ، مگر بعض قرائن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اصل تصویر قلمی تھی ۔ اور کیا بعید ہے جو میاں محمد افضل کی وہی تصویر ہو جو میر مہدی اور مرزا صاحب کے درمیان کم و بیش سوا سال موضوع گفتگو رہی ۔ ان میں سے پہلا مکتوب ۸ دسمبر ۱۸۶۰ع کا ہے ، دوسرا ۹ جنوری ۱۸۶۱ع اور تیسرا ۸ مارچ ۱۸۶۱ع (یا ۱۸۵۸ع) کا ۔ پہلے میں

۱- دیکھیے 'خطوط غالب' بنام قدر بلگرامی ۔ مولوی صاحب نول کشور پریس کے بہت عمدہ مصحح تھے ۔ مئی ۱۸۶۲ع کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب اور مصحح پریس سے غیرحاضر ہیں ۔

لکھا ہے: ''میاں محمد افضل تصویر لے گئے ہیں، انتظار کرو۔'' دوسرے میں لکھتے ہیں: ''نقل ابھی تیار نہیں ہوئی۔'' تیسرے میں کہا ہے: ''میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں، جلدی نہ کرو۱۔''

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، یہ تصویر پہلی تصویر ہے جو شایع ہوئی۔ اودھ اخبار کے دو اشتہاروں کی ضروری عبارتیں جو انتہائی مفید ہیں، ملاحظہ ہوں:

''...خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست، بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خان صاحب بہادر دھلوی نے جد و جہد تمام سے جمع فرمایا...(تعریف دیوان) ...تمام کتاب ۳۰ ۱/۴ جز میں چھپ کر تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصنف کی بھی یادگار ہے۔ سابق میں سوائے محصول پیشگی قیمت چار روپے قرار دی تھی اور بعد ختم کتاب پانچ روپے درج کی تھی۔ اب چونکہ رفاہ عام منظور ہوا، قیمت کا گھٹا دینا ضرور ہوا...(جن لوگوں سے پیشگی قیمت لے لی گئی ہے انہیں محصول معاف) اور جو صاحب اب طلب کریں گے ان سے چار روپے قیمت لیں گے۲...''

(اودھ اخبار، ۱۳-مئی ۱۸۶۳ع صفحہ ۳۳۵، نیز ۲۰-مئی ۶۳ع)

۱- دیکھیے اردوے معلیٰ طبع اول صفحہ ۱۵۸، ۱۵۸، ۱۵۹ علی الترتیب - ان دنوں کلیات کی طباعت شروع ہو گئی تھی (دیکھیے مکتوب بنام قدر بلگرامی، ۲۴ مئی ۱۸۶۲ع)

۲- خالی مقامات نقل کرتے وقت چھوڑ دیے تھے، طویل عبارت کا خلاصہ بریکٹ میں لکھ لیا تھا۔

پھر ۳ جون ۱۸۶۳ع کے اعلان میں یہ اضافہ ہوا:

''بوجہ طیاری (کذا) تصویر جناب مرزا صاحب موصوف کلیات بخدمت شائقان تقسیم ہونا ملتوی تھا، اب طیار ہوگئی[1]۔''
(اخبار مذکور، صفحہ ۳۹۰)

۱۸۶۳ع کے کلیات میں یہ تصویر صفحہ ۱۴۱ کے مقابل چھپی ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ ۱۸۷۲ع کے ایڈیشن میں یہی تصویر چھپی تو اس کے دونوں ستونوں پر ''قائم علی'' کا نام ہے۔ لیکن یہ عکس ذرا بگڑ گیا ہے[2]۔

۱۱ جون ۱۸۶۳ع کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک کلیات مرزا صاحب کو نہیں ملا۔ اگست ۱۸۶۳ع کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ میر مہدی مجروح کو نسخۂ مطبوعہ مل گیا۔ پھر ستمبر ۱۸۶۳ع کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ مرزا کو بھی کتاب مل گئی۔ اس کے بعد منشی نول کشور اتفاقاً نومبر کے آخر یا دسمبر ۱۸۶۳ع کے آغاز[3] میں دہلی گئے اور مرزا نیز مرزا کے علاوہ دوسرے اکابر سے بھی ملے جس کا حال اودھ اخبار میں شایع ہوا۔

مطبوعہ نسخے کا تعارف:

یہ ایڈیشن اپنی جامعیت، صحت، حسن طباعت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ اکیس سطری مسطر پر پانچ سو پچپن صفحات میں مقدمہ و

۱- یہ مضمون بعض احباب نے بلا حوالہ نقل کیا ہے۔ میں اسے نگار، لکھنو جون ۱۹۵۰ع میں شایع کر چکا ہوں۔

۲- منشی نول کشور کے مطبع والوں نے ۱۸۹۳ع کے مطبوعہ کلیات پر ''بار دوم'' لکھ دیا ہے، جس سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، حالانکہ وہ تیسرا ایڈیشن ہے، اس میں تصویر و زائچہ بھی نہیں ہے۔

۳- مخدومی جناب مہر صاحب اسے ۱۸۶۱ع میں بتاتے ہیں (غالب، طبع چہارم، صفحہ ۴۰۹)

خاتمہ و اشعار غالب ہیں ۔ خاتمے کی آٹھویں سطر کے بعد میر مہدی مجروح کے نام کا تعارف ہے جسے جلی قلم سے تقریباً چار سطروں میں لکھا گیا ہے ۔ پھر ترسٹھ فارسی شعروں کا قطعہ ہے ۔ صفحہ ۵۵۸ پر یہ قطعہ پندرہ سطروں میں ختم ہوتا ہے ۔ پھر نسیم ، اشک ، تسلیم ، اشرف اور رعنا کے قطعات ہیں جو صفحہ ۵۶۰ پر ختم ہوتے ہیں ۔ دیوان کی تقطیع طول میں پچیس سینٹی میٹر اور عرض میں سولہ سینٹی میٹر ہے ۔

میرے نسخے میں صفحہ ۱۴۱ کے مقابل تصویر اور صفحہ ۱۹۸ کے مقابل میں زائچہٴ ولادت بھی ہے ۔ کاغذ ولایتی ہلکا ہے جو ایک صدی گزارنے کے بعد بہت خستہ ہو گیا ہے ۔

اب یہ نسخہ بھی نایاب ہو چکا ہے ۔ چنانچہ سرورق کا عکس چھاپنے کے لیے بہت جستجو کی مگر لاہور میں دوسری کاپی مجھے دستیاب نہ ہو سکی ۔ یقیناً بعض حضرات کے پاس موجود ہوگی لیکن سراغ نہ ملا :

کلیات کی ترتیب :

صفحہ	عنوان	عدد	اشعار
۲	دیباچہ	۸۵ سطریں	۱۵۲
۱۱	قطعات	۵۹	۶۷۲
۴۷	فاتحہ ۲	۲	۶۵
۵۰	نوحہ	۵	۶۲
۵۴	مخمس	۱	۲۵
۵۵	ترکیب بند	۳	۲۳۰

۱۔ یہ عدد میزان میں شمار نہیں کیے ہیں ۔

۲۔ تیسرا قطعہ دیوان میں بہ عنوان فاتحہ ہے اور کلیات میں بہ عنوان نوحہ ہے ۔

٦٧	ترجیع بند	١	٥٦
٧٠	مثنویات	١١	٢٠٤٣
١٧٠	قصائد	٦٤	٣٦٥٨
٣٠٣	غزلیات	٣٢٢	٣٤٩٥
٥٣٧	رباعیات	١٠٥	٢١٠
٥٥٢	تقریظ	٤٦	٥

ہمارے شمار کے مطابق دس ہزار پانچ سو سولہ شعر ہیں جبکہ غالب نے ان کی تعداد دس ہزار چار سو چوبیس لکھی ہے اور ڈاکٹر گیلانی نے اپنی کتاب ''غالب ، ہز لائف اینڈ ہز پرشین ورک'' طبع دوم ، صفحہ ٩٦ پر دس ہزار چھ سو بتیس تعداد تحریر کی ہے۔

زیر نظر کلیات :

دیوان فارسی میں بقول غالب ١٨٤٤ع بلکہ ١٨٤٥ع تک کا تقریباً تمام کلام موجود تھا ۔ اس کے بعد جو کچھ لکھا ، ناظر حسین مرزا ، شہاب الدین خان ، ضیاء الدین خان وغیرہ اپنے اپنے نسخوں میں لکھواتے رہے ۔ ان پر نظر ثانی کے بعد کلیات نظم کی اشاعت ہوئی ۔ ١٨٦٣ع سے ١٨٦٨ع تک جو کچھ لکھا ، اسے تین مجموعوں میں بترتیب شایع کیا گیا ۔

(الف) 'مثنوی ابر گہربار' طبع اکمل المطابع دہلی ١٨٦٤ع-١٢٨٠ھ۔
اس مجموعے میں مثنوی دوبارہ شریک اشاعت کی گئی ۔ اس کے ساتھ نیا کلام ، قصیدے دو ، قطعے تین ، رباعیاں دس۔

(ب) سبد چین : ابھی ایک حبسیہ جو پرانی چیز ہے ، محفوظ تھا ۔ ادھر غالب قصائد و قطعات بھی لکھتے رہے تھے ، اس لیے مثنوی 'ابر گہربار' چھوڑ دی اور حبسیہ ، چھ قصیدے ،

ایک ترکیب بند ، ایک ترجیع بند ، یک مثنوی ، کچھ قطعات ، نو غزلیں ، کچھ متفرق اشعار ہیں۔ محمد مرزا خان کے مطبع سے ۱۸ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ مطابق اگست ۱۸۶۷ع میں شایع ہوئی۔ ۱۹۳۸ع میں مالک رام صاحب نے تصحیح و ترتیب و اضافات کے ساتھ دوبارہ دہلی سے چھپوائی۔

(ج) سبد باغ دودر: سبد چین کے بعد پھر کچھ اشعار دستیاب ہوئے ، اس لیے اس پر نظر ثانی اور اضافے کے بعد نثر کو بھی جمع کر کے دو حصوں پر مشتمل کتاب تیار کی گئی۔ جس کے نخستین در میں ۵۴ قطعے ، ایک ترکیب بند ، ایک ترجیع بند ، دو مثنویاں ، سات قصیدے ، گیارہ غزلیں ، سولہ بیتیں ، بیس رباعیاں اور ایک مخمس ہے۔ اس کتاب کا منحصر بفرد نسخہ جناب محترم سید وزیر الحسن صاحب عابدی کی ملکیت میں ہے اور پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میگزین میں اگست ۱۹۶۱ع میں پہلا حصہ شایع ہوا۔

میں نے اپنی ترتیب جدید میں ان سب کتابوں کو سامنے رکھا ہے اور سب کے زوائد کلیات میں لیے۔ پھر ان معاصر نسخوں کے بعد متفرقات غالب تالیف جناب مسعود حسن صاحب ادیب ، آثار غالب تالیف جناب قاضی عبدالودود صاحب ، دیوان غالب خطی ، یادگار غالب مولانا حالی ، مکاتیب غالب تالیف جناب عرشی ، غالب تالیف جناب مہر اور دوسرے مقالات و مضامین ، معاصر اخبار و رسائل کی چھان بین کی۔ اصول یہ قرار دیے:

۱ - قدیم تر کتاب کو جو بہرحال مسودہ ، مبیضہ ، کاپی ، پروف اور مطبوعہ شکل میں غالب کی اصلاحوں سے آراستہ ہو چکی تھی ، اسے متن و اصل قرار دیا ، یعنی اس کی ترتیب کو پہلے نقل کیا۔ پھر اس حصے کے خاتمے پر کلیات کا متعلقہ اضافہ ،

اس کے بعد دوسرے مآخذ سے دریافت کردہ ذخیرہ درج کیا؛ مثلاً دیوان طبع دھلی ۱۸۴۵ع میں ۳۱ قصیدے تھے - یہ قصیدے کلیات میں اس ترتیب سے نہیں ھیں - میں نے دیوان کی ترتیب سے پہلے اکتیس قصیدے لیے ھیں- اس کے بعد کلیات طبع نول کشور ۱۸۶۳ع کے قصائد از ۳۲ تا ۴۶ - سات قصیدے کلیات میں نہ تھے ، وہ میں نے بڑھا دیے ، ۶۵ تا ۷۱ - اسی طرح قطعات ، مثنویات ، غزلیات وغیرہ -

۲ - اہتمام کیا ھے کہ تمام ممکن مآخذ کو سامنے رکھا جائے اور اگر کوئی تاریخ یا تلمیح ھو تو بہ قدر ضرورت و اطلاع اختلاف نسخ و ذکر واقعہ و تاریخ بھی کر دیا جائے -

۳ - حتی الامکان جن مآخذ کا حوالہ دیا ھے ، انھیں بار بار دیکھا ھے ، سنین کو تقویم طبع انجمن ترقی اردو کراچی اور تقویم طبع مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی سے مطابق کیا ھے -

۴ - دیوان غالب کا ایک بہت اھم قلمی نسخہ محترمی جناب ڈاکٹر وحید مرزا صاحب کے پاس دیکھا تھا اور ایک دن میں جو فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا ، وہ حاصل کیا - اس کے سرورق پر مطبوعہ نسخے کی عبارت تھی اور ترقیمہ میں بہت قدیم تاریخ - باقی قلمی نسخوں کے بعض اندراجات مالک رام صاحب ، قاضی عبدالودود صاحب اور عرشی صاحب کے مضامین سے حاصل کیے -

۵ - کوشش تھی کہ دیوان کے صفحات کے ھندسے آردو میں اور کلیات کے ھندسے انگریزی میں قوسین کے اندر رکھے جائیں- چنانچہ مسودے میں یہی اھتمام تھا - اتفاق سے محمود پرنٹنگ پریس کے مالک جناب سید محمود شاہ صاحب کی علالت نے مسودے کے ابتدائی حصے اور اس کے مطبوعہ حصے کو بھی

زد میں لے لیا ۔ چنانچہ حصہ قطعات و مثنویات میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی ۔ دوسرا حصہ موصوف نے اپنی نگرانی میں چھپوایا مگر صفحات کی صراحت حاشیہ پر ناموزوں سمجھی گئی ۔ غزلیات کا مسودہ مجھے مل گیا ، اس لیے میں نے اسے دوبارہ دیکھا ۔ مآخذ کے صفحے اور اشعار کی تعداد جو پہلے دونوں حصوں میں حذف ہو گئی تھی ، ذیلی حواشی میں درج کر دی ۔

۶ ۔ بعض اہم نسخوں کے عکس، غالب کی تصویر شریک اشاعت طبع اول لکھنو ، زائچہ اور ایک تحریر کا عکس بھی شایع ہو رہا ہے ۔ پہلی جلد میں دیوان کے سرورق اور تصویرغالب کا عکس ، دوسری جلد میں کلیات طبع لکھنو کا سرورق اور زائچہ ، تیسری جلد میں دیوان کا آخری صفحہ اور ایک دیوان قلمی کا عکس ہے ۔

۷ ۔ کلیات کی ضخامت کے پیش نظر مجلس نے اسے تین جلدوں میں چھاپ کر کتاب کو خوبصورت بنا دیا ہے ۔

اس نسخے کے خصوصیات :

۱ ۔ غالب کے کلام فارسی کی متداول ترتیب کے ساتھ ساتھ دوری ترتیب بھی ہو گئی؛ یعنی ۱۸۲۳ع ببعد سے ۱۸۴۵ع تک کا کلام پہلے، ۱۸۴۵ع سے ۱۸۶۳ع تک کا کلام اس کے بعد ، ۱۸۶۳ع سے ۱۸۶۹ع تک کا کلام اس کے بعد ۔ قصائد میں غزلیات ، غزلیات میں رباعیات کی زحمت سے بچانے کے لیے ہر صنف کو اسی کے ساتھ رکھا ہے ۔ حاشیے میں قابل ذکر بات عرض کر دی ہے ۔

۲ ۔ کلیات طبع نول کشور کے اشعار سے ایک ہزار سے زائد شعر

مہیا کیے ہیں ۔ تفصیل تعلیقات میں آئے گی ۔

۳ ۔ بر صغیر میں غالب کے کلیات فارسی کے کم و بیش چھ ایڈیشن نکلے، لیکن شاید ہر نسخہ پہلے نسخے سے زیادہ مغشوش ہوتا گیا ۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے پہلی مرتبہ کلیات کو اس اہتمام کے ساتھ ٹائپ میں شایع کر کے نہ صرف میری ہمت افزائی فرمائی بلکہ غالبیات میں پاکستان کی علمی برتری بھی ثابت کی ہے ۔

فاضل ہیچمدان

۳۱ - دسمبر ۱۹۶۶ع

مقدمہ

از

سید عابد علی عابد

غالب کی شخصیت اور فن

(۱)

نظر ثانی کی ضرورت

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے جس فضا میں غزل سرائی شروع کی ہے، وہ اس کی طبیعت کی آپچ اور اس کے جوہر تخلیق کی تاب ناکی کے لیے مطلقاً سازگار نہ تھی - اردو اشعار کے متعلق یہ اعتراضات ہوئے کہ بے معنی ہیں اور انہیں یہ شعر سنایا گیا:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

برسر مشاعرہ ان سے خطاب کیا گیا:

کلام میر سمجھے اور اور کلام مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس قسم کی باتوں کے جواب میں غالب نے اپنے نفس معنوی کے گرد کئی طرح کے خط حصار کھینچے، مثلاً یہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ بھی کہا:

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

لال قلعه جو ان دنوں ثقافت ، شائستگی ، علم و هنر اور تهذیب اور تمدن کا محور تها ، اس صنعت گری اور تفریحی رنگ شعر پر مٹا هوا تها جس کے نمونے ذوق اور اس کے هم خیال معاصرین کے کلام میں ملتے هیں۔ غالب کو نظر آ رها تها که متقدمین میں جو ابهام ، فقرے بازی ، ضلع جگت اور استادانه صنعت گری تهی، اسی نے ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اور جهاں مشکل قافیوں اور ردیفوں میں پهلوانان سخن داد قافیه پیمائی دے رهے هیں، وهاں شعر کا وه پهلو بهی زوال پزیر طبیعتوں کو لذت بخش رها ہے، جسے عصر حاضر کا مفکر (Collingwood) شعر کے تفریحی پهلو کی شعبده گری کهتا ہے[1]۔

یه تفریحی شعبده گری اور استادانه چابک دستی ایک قسم کی هاتھ کی صفائی تهی۔ شاعر جادوگر کی طرح یا مداری کی طرح هوا میں مختلف رنگ کے گولے اچهالتا تها اور واپس آتے آتے یا تو ان گولوں کا رنگ بدل جاتا تها یا ان کی صورت تبدیل هو جاتی تهی۔ اس تفریح میں بهی ایک لطف ہے اور غالباً زوال پزیر ذهن جو دقت معانی کی گرهیں کهولنے سے عاجز هوتے هیں، هاتھ کی اس صفائی کو نه صرف پسند کرتے هیں، بلکه اسے کمال سخن وری سمجهتے هیں۔ ایسے حالات میں شعر کهنے کی استعداد کا مطلب یه هو جاتا ہے که انسان کو علوم شعریه پر عبور هو، علم قافیه سے لگاؤ هو، صرف و نحو سے اطلاع هو، عروض میں دسترس کامل هو اور لفظوں کی شعبده گری کے اس شیوۂ خاص میں کمال حاصل هو جهاں ذهن پر بوجھ کم پڑتا ہے اور تفریح زیاده هوتی ہے۔ معانیٔ دقیق کی گرهیں کهولنے کے لیے صرف ذوق سلیم هی کی نهیں مطالعے کی بهی ضرورت هوتی ہے۔ جب مطالعه

۱- Principles of Art

صرف علوم شعریہ تک منحصر ہو جاتا ہے اور نظریں معانی اور مغز سے ہٹ کر پیکر و ہیئت پر مرکوز ہو جاتی ہیں تو اس قسم کے اشعار سننے والوں کو عجیب لطف دیتے ہیں:

آنکھیں عاشق کو نہ تو اے بت رعنا دکھلا
پتلیوں کا کسی ناداں کو تماشا دکھلا

سوال بوسہ کو ٹالا جواب چین ابرو پر
برات عاشقاں بر شاخ آہو اس کو کہتے ہیں

وصف چشم اور وصف لب اس شوخ کا کہنے کو ہیں
آج ہم درس اشارات و شفا کہنے کو ہیں

قمریاں بولیں ، پپیہے کوکیں کان کی بات مری غل ٹھہرے
تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھہرے

کیا ہتھیلی پہ دعائے خفقاں لکھی تھی
ہاتھ سینے پہ جو رکھا تو کلیجہ ٹھہرا

اس پری کا وہ مری لاش کو کاندھا دینا
تخت تابوت کا وہ تخت سلیماں ہونا

ان حالات میں شعر کہنا ایک ملکہ یا استعداد مخصوص تصور کیا جاتا ہے ، جوہر تخلیق سے اس کا تعلق نہیں رہتا ۔ شرفا جو علوم و فنون حاصل کرتے ہیں ، اس میں قافیہ پیمائی بھی شامل ہوتی ہے ، فرق یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پیمائی بے عیب ہوتی ہے ، با اصول ہوتی ہے ، اگرچہ معنویت کے لحاظ سے اس کا گھٹیا پن سب پر روشن ہوتا ہے۔

غالب نے اپنے لیے اس راستے پر سفر کرنا ناممکن پایا کہ وہ شعر سے تفریح طبع کا سامان مہیا کر سکے۔ ایک تو اس نے اپنی فطرت کی یک آہنگی کے تحفظ کے لیے خط دفاع یہ کھینچا کہ اپنے اشعار کے بے معنی ہونے کا اعتراف کر لیا، دوسرا خط جو غالب کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے، یہ ہے کہ اس نے اپنی اردو شاعری کو اپنے مرتبے سے فروتر جان کر دعویٰ کیا کہ اس کی شاعری کا اصل جوہر فارسی میں نظر آتا ہے۔ غالب پر جو کچھ بیتی ہے، اس سے سمجھوتا کرنے کے لیے غالب نے اسی دعوے پر قائم رہنے کو اپنی عافیت گردانا ہے کہ اس کے شاعرانہ کمال کے اسرار و رموز فارسی شاعری میں کھلتے ہیں۔

صرف یہ ہی نہیں کہ غالب نے اپنے اردو اشعار کے اشکال کا اعتراف کیا بلکہ اس نے بتدریج یہ بھی کیا کہ پچیس سال کی عمر تک خاصا مجموعہ اردو اشعار کا مہیا کر لیا جس میں خیال بندی، معنی آفرینی اور تخیل کی بے اعتدالی کی طلسم کاری بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔

غالب کی شخصیت کی جو تصویر بتدریج ہمارے سامنے پیش ہوتی رہی، وہ یہ تھی کہ وہ نہایت خوددار تھا، رئیسانہ آن بان رکھتا تھا، اپنے نسب پر اسے ناز تھا، شاعری کو ذریعۂ عزت تصور نہیں کرتا تھا اور اس بات کا مدعی تھا کہ میرا پیشہ دراصل سپاہ گری ہے۔ وزیر حسن نے غدر سے پہلے کی دلی کی جو تصویر کھینچی ہے، غالب کے خد و خال اس چوکھٹے میں کسی طرح صحیح نہیں بیٹھتے۔[1]

جوں جوں غالب سے عقیدت بڑھتی چلی گئی اور حالی نے اس کی مروت، فراخ حوصلگی، شعر فہمی، سخن سنجی، حسن بیان،

۱- دیدار۔

خود داری ، سلامتیٔ طبع ، محققانہ نظر ، حق پسندی اور راست گفتاری کی عقیدت مندانہ تصویر کشی کی ، توں توں ہمارے سامنے ایک جعلی غالب آنے لگا جسے خوشامد سے نفرت تھی اور جسے اپنے متاع سخن پر اتنا غرور تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا[1]۔

بے شک غالب کو اپنے کلام کی بلندی کا شعور تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ سمجھتا تھا کہ میں ایسی فضا میں پنپ رہا ہوں جو میرے لیے بالکل موزوں نہیں ، لیکن حالی نے غالب کی شخصیت کی جو تصویر کشی عقیدت مندی کی بنا پر کی ہے ، وہ کسی طرح صحیح نہیں ۔

بات یہ ہے کہ غالب کو سلطنت مغلیہ کا چراغ بجھتا ہوا نظر آ رہا تھا ، اور وہ سمجھتا تھا کہ جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہا ہوں، وہ نہ صرف اس اعتبار سے زوال پذیر ہے کہ اچھے شعر کی قدردانی نہیں ہوتی بلکہ اس اعتبار سے بھی مردود ہے کہ معاشرت کے ہر دائرے میں انحطاط ، فساد اور تخریب کے آثار موجود ہیں[2]۔

غالب کا یہ خیال تھا کہ مغلوں کا عہد حکومت اب کسی اعتبار سے سودمند نہیں رہا ، انگریزوں کا نیر اقبال اب نصف النہار پر ہے ۔ جو تہذیب و تمدن انگریز اپنے ساتھ لائے ہیں ، وہ جان دار اور توانا ہے ، اور جن معاشری کوائف میں عام لوگ گھرے ہوئے ہیں ، وہ ہر طرح زوال پذیر ہیں ۔ مختلف انگریزوں کی تعریف میں اس نے جو مدحیہ قصیدے کہے ہیں ، ان کے سرسری مطالعے

---

۱ - یادگار : ۵۶ ، ۵۷ تا ۸۱ ۔
۲ - مشائخ : ۳۳۸ تا ۳۶۰ ۔

سے معلوم ہوگا کہ وہ انگریزی تہذیب ہی کو ہندوستان کی مستقبل کی تہذیب سمجھتا ہے (ان قصیدوں کے متعلق اور بھی عبرت انگیز باتیں ہیں جن کا ذکر ابھی آتا ہے)۔

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں آزادی کی تحریک نے جنم لیا اور دھلی میں وہ شعلے بھڑک اٹھے جن میں مغلیہ اقتدار کو جل کر خاک ہو جانا تھا، تو غالب اس ہنگامے سے کم و بیش بالکل غیر متاثر رہا۔ بے شک اسے دوستوں کے مرنے کا غم ہے لیکن اس کے خطوط شاھد ہیں کہ انگریزوں کے مرنے کا بھی اسے بے حد رنج ہے کہ کچھ اس کے ممدوح تھے، کچھ دوست تھے اور کچھ معتقد تھے[1]۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ غالب کے دوست مفکر، دانش ور، تو سب کم و بیش بہت بڑی اکثریت میں ۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لیں اور غالب اس ہنگامے سے بالکل غیر متاثر رہے؟ میں بڑے تامل کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غالب کو شروع ہی سے لال قلعے میں جاہ و منصب نہیں ملا تو وہ عمر کا خاصا حصہ اس کوشش میں ضائع کرنے پر مجبور ہوا کہ اسے پنشن ہی اتنی مل جائے کہ وہ رئیسانہ آن بان سے اور امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر سکے۔ پنشن کے لیے غالب نے جو دوڑ دھوپ کی ہے اور اس سلسلے میں اس نے جس طرح انگریز افسروں کی مدح سرائیاں کی ہیں، وہ ایک نہایت عبرت انگیز داستان ہے[2]۔

غالب کی زندگی میں ابتلاے اسیری ایک اہم مقام رکھتا ہے اور اس کی شخصیت کی تکمیل کے اجزاے لازم میں شامل ہے۔

۱۔ دیکھیے خطوط اردو، معاصر، عہد۔
۲۔ غالب ۹۸ تا ۱۲۳۔

اگرچہ غالب کے عقیدت مندوں نے اس واقعے کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ وہ جب چوسر کھیلتا تھا تو برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلتا تھا[1]۔ لیکن جن لوگوں کو قانون سے سرسری سی بھی واقفیت ہے، وہ اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر جوا کھیلنا یا چوسر کھیلنا کوئی ایسا جرم نہ تھا کہ فوجداری میں اس کا مواخذہ ہو سکے، ہاں جب کسی کا گھر قمار بازی کا اڈا بن جائے، لوگ باقاعدگی سے وہاں جوا کھیلتے ہوں اور روپے کے لین دین میں صاحب مکان بھی یوں دخیل ہو کہ کوئی ہارے یا جیتے، اسے کچھ حصہ ضرور ملے، تو ایسا شخص قانونی گرفت میں آجاتا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ غالب کے ہاں بھی قمار بازی پیشہ ورانہ طور پر ہوتی ہوگی، ورنہ یہ ممکن نہیں کہ غالب کے لیے خود بہادر شاہ ریزیڈنٹ کے نام چٹھی لکھیں اور جواب ملے کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا[2]۔

بات وہی ہے جو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ غالب بہر حال اور بہر صورت روپیہ کمانا چاہتا تھا تاکہ اس کا شمار بھی رئیسان شہر میں ہو۔ عرشی نے یہ بات کھول کر لکھ دی ہے کہ غالب غربت میں بھی لوازمات امارت کا پابند تھا[3]۔

اب رفتہ رفتہ غالب کی ایک صحیح تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آتی جا رہی ہے۔ اسے اپنے خاندان کی بزرگی پر ناز ہے، اس کا رشتہ اچھے خاندان میں ہوا ہے لیکن سوئے اتفاق سے مالی حالات ایسے نہیں کہ اپنے معزز اور اپنے مال‌دار اقربا سے مساویانہ

---

۱ - غالب : ۱۲۴ -
۲ - غالب، ۱۲۶ -
۳ - مکاتیب، ۴۷ -

سلوک کر سکے ۔ حرمان زدگی یا احساس ؟ غالب کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور وہ بہر حال روپے کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔

قمار بازی والے معاملے کے سلسلے میں ابوالکلام آزاد کا بیان یہ ہے :

''خواجہ صاحب (حالی) نے اس معاملے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ کوئی بات نہ تھی ، محض چوسر اور شطرنج کا شوق تھا ، اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام کچھ بازی بھی بد لیا کرتے تھے ، کوتوال چونکہ دشمن تھا اس لیے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا ، حالانکہ اصلیت بالکل اس کے خلاف ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیرالدین مرحوم کے لفظوں میں ''مرزا نے اپنے مکان کو جوئے بازی کا اڈا بنا رکھا تھا ۔''

جو تفصیلات مجھے سر امیرالدین مرحوم سے معلوم ہوئی ہیں ، وہ حسب ذیل ہیں :

غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعے کے پچاس روپے تھے ۔ چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنی چاہتے تھے اس لیے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے ۔ اس زمانے میں دہلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں نے گزران وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے ، ان میں ایک قمار کا بھی مشغلہ تھا ۔ گنجفہ عام طور پر کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت رکھتی تھیں ۔ مرزا بھی اس کے شائق تھے ، رفتہ رفتہ ان کے ہاں چاندنی چوک کے بعض جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ ''جوا بازی'' شروع ہوگئی ۔ قمار کا عام قاعدہ ہے کہ

صاحب مجلس (یا یوں کہا جاتا ہے کہ مہتمم قمار خانہ) کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے، جو بھی جیتے، فی صد کچھ حصہ صاحب مجلس کا ہوگا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں جمنے لگیں تو وہ صاحب مجلس ہوگئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول ہونے لگی۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے، اس لیے اس میں بھی کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے۔

انگریزی قانون اسے جرم قرار دیتا تھا لیکن شہر کی رسم یہ ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انھیں از راہ تجاہل رئیسانہ تفریحوں کے ذیل میں تصور کیا جاتا تھا۔

عرصے تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ رہتی تھی، اس لیے ان کے خلاف نہ تو کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا، نہ قانونی اقدام کا اندیشہ تھا۔ انھیں میں ایک کوتوال قتیل کے شاگرد مرزا خانی تھے جن کی نسبت خواجہ نصیر نے کہا ہے:

نصیرالدین بے چارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی

(یہ مرزا خانی پھر لکھنؤ میں مقیم ہوگئے تھے، میرے عزیز دوست مرزا محمد عسکری لکھنوی انھیں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، غالباً وہ ان کے جد تھے)۔

لیکن غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرے سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ شاعر تھا، نہ نثر طراز کہ غالب کا

قدرشناس ہوتا ، نرا کوتوال تھا ۔ اس نے آتے ہی سختی کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی اور جاسوس لگا دیے ۔ حکام سے قول لے لیا تھا کہ جب تک میرا کوئی جرم ثابت نہ ہو، میرے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے ورنہ میں شہر کو جرائم سے پاک نہیں کرسکوں گا ۔ اس زمانے میں بعض دوستوں نے مرزا غالب کو بار بار فہمائش کی کہ ان مجلسوں کو ملتوی کر دیں لیکن وہ خبردار نہ ہوئے ۔ وہ اس زعم میں رہے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی ۔ بالآخر ایک دن عین ایسے موقع پر کہ مجلس قمار گرم اور روپوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں ، کوتوال پہنچا اور دروازے پر دستک دی ۔ اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے، صاحب مکان یعنی مرزا صاحب دھر لیے گئے[1] ۔

قمار بازی کے قصے سے رہائی ہوئی تو معلوم ہوا کہ جہاں آبرو گئی، آبرو مندانہ ملازمتوں کے سلسلے بھی مسدود ہوگئے ۔

اب صرف ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار کی خاندانی پنشن پر گزارہ کرنا پڑتا تھا ۔ آخر احباب کے صلاح مشورے سے شیخ نصیرالدین عرف کالے میاں کی سفارش سے اور حکیم احسن اللہ خاں کے ایما پر غالب کو بہادر شاہ نے جولائی ۱۸۵۰ء میں تاریخ تیموریہ لکھنے پر مامور کیا ۔ پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی ، نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ کے خطابات سے سرفراز فرمائے گئے[2] ۔

جس زمانے میں بہادر شاہ کے دربار سے غالب کا سلسلۂ ملازمت قائم تھا ، ان دنوں بھی غالب کا طرز عمل ایسا نہ تھا کہ اطاعت شاہانہ یا شکر گزاری پر محمول کیا جا سکے ۔ اس زمانے

۱- نقش : ۲۹۲ -
۲- نادرات : ۸۵ -

میں ان کی دو غزلیں ملازمت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ دونوں غزلوں کا لہجہ خراب ہے اور جو شعر ملازمت سے متعلق نہیں، ان کا مفہوم کم از کم ملازم شاہ کے شایان شان نہیں۔ ایک غزل میں کہتا ہے:

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے
بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

دوسری غزل میں کہتا ہے:

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اس مقطع پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ اب وہ رئیسانہ ٹھاٹھ نہیں کہ کسی کے ملازم نہیں ہیں۔ اب شاہ کو دعا دینا پڑے گی، قصیدۂ مدحیہ لکھنا پڑے گا، خوشامد بہر حال کرنا پڑے گی۔ ممکن ہے کہ یہ احتمال غلط ہو لیکن مجھے شعر کے لہجے سے بو سی آتی ہے کہ غالب کو ملازمت اور وہ بھی پچاس روپے کی، پسند نہیں آئی۔ خطابات کو تو اس نے بالکل بے معنی سمجھا۔ اودھ کا نواب بادشاہ بن گیا تھا، غالب کو دو تین ایسے خطاب مل گئے تو ایسی کون سی بڑی بات ہوئی۔ آئیے اب ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ ظفر نے جو غالب کی پرورش کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ غالب کے معاصرین میں سے اکثر امرا اور دانش وروں نے ۵۷ء کی تحریک میں عملاً حصہ لیا۔ غالب کے تعلقات سرکار انگریزی سے ہمیشہ خوش گوار رہے۔ ۵۷ء کے دنوں

میں وہ گھر میں گوشہ گیر رہا ۔ شہر دہلی کے اندر باغیوں کے ساتھ بہ باطن بے گانہ و بہ ظاہر آشنا وقت گزارتا رہا تا آں کہ انگریزی فوج نے دوبارہ شہر فتح کیا لیکن باوجود تعلق قلعہ کے غالب کے دامن وفاداری پر دھبا نہ آیا[۱]۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ ''مرزا غالب نے انگریزی حکام سے تجدید مراسم و روابط کی خاطر ایک کتاب بنام ''دستنبو،، مشتمل بر حالات غدر لکھی تھی ۔ چونکہ یہ کتاب افسران بالا کو پیش کرنی مقصود تھی ، اس لیے مرزا کی یہ خواہش تھی کہ اچھی چھپے[۲]۔

مطلب واضح ہے کہ غالب ہر حالت میں سرکار انگریزی پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ میرا اگر قلعے سے کوئی تعلق تھا ، تو وہ مجبوری کا تھا ورنہ میں خیرخواہ اور وفادار سرکار انگریزی کا ہوں ۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ قصیدوں کے متعلق کچھ عبرت انگیز واقعات اور بھی عرض کروں گا ۔ مالک رام نے بہ تحقیق ثابت کر دیا ہے کہ خاصے ایسے قصیدے جو غالب نے بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں لکھے تھے ، ان کے عنوان سے بادشاہ کا نام مٹا دیا اور کہیں کسی انگریزی افسر کا نام کر دیا اور کہیں ملکہ وکٹوریا کا ۔

غالب کی یہ کوشش کہ اسے زندگی میں رئیسانہ آن بان میسر ہو اور اس کی انتہا سے بڑھی ہوئی خوداری پر کسی قسم کا حرف نہ آئے ، دو تین نہایت ناگوار واقعات پر منتج ہوئی ۔ ایک تو برہان قاطع کا قضیہ اور اس سلسلے میں

۱- مکاتیب : ۴۹ ، ۵۰ -
۲- نادرات : ۲۹ -

غالب کے فوجداری مقدمے کا حشر، دوسرے نواب رام پور سے ایسے تعلقات کی ابتدا جن میں نام کو بھی خودداری موجود نہ تھی۔ میں ان دونوں قضیوں کو مجملاً لکھتا ہوں اور اس سے ثابت صرف یہ کرنا چاہتا ہوں کہ غالب عمر بھر ایک ذھنی کش مکش میں مبتلا رھا کہ رئیسانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا چاھتا تھا اور اس کے سامان مہیا نہ ھوتے تھے، اپنی آبرو کا تحفظ چاھتا تھا اور بے آبروئی ھو کر رھتی تھی۔ ان تمام باتوں کا اثر اس کے کلام پر بہت گہرا پڑا ھے اور صرف یہی بات پیش نظر رکھ کر میں مذکورہ بالا واقعات کا اجمالی بیان پیش کرتا ھوں۔

(۲)

”باد مخالف“ اور ”برھان قاطع“ کا قضیہ

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ غالب نے اپنے اردو کلام کی نامقبولیت کے پیش نظر اپنے نفس معنوی کے گرد ایک حصار مدافعت کھینچ لیا تھا جس کے کئی پہلو اور گوشے تھے، لیکن بہر حال اس حصار کا اھم ترین خط دفاعی یہ تھا کہ اردو میں میرے کلام کی جو بھی صورت ھو، بہر حال میں فارسی کا محقق اور عالم ھوں، اس زبان کے رموز و اسرار پر نظر رکھتا ھوں اور اساتذۂ اھل ایران کے کلام کا تتبع میں نے اس تحقیق سے کیا ھے کہ اب مجھ سے زبان اور بیان میں کوئی غلطی سرزد ھی نہیں ھو سکتی۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاھر ھوگا، غالب اس سلسلے میں اپنے ایک استاد کی نشان دھی بھی کرتا ھے جس کا ایرانی نام وہ ”ھرمزد“ بتاتا ھے اور اسلامی نام عبدالصمد۔ اس استاد کے وجود تاریخی سے بحث ذرا آگے آتی ھے،

اس مرحلے پر مجملاً بیان کرنا مقصود ہے کہ غالب نے جو فارسی دانی کے دعوے کیے تھے، ان کا حشر کیا ہوا اور ان کی حقیقت کیا ہے؟

عجیب بات ہے کہ غالب کو یہ بات معلوم تھی کہ ہندوستان میں جو ایرانی نثار و شعرا اور سخن طراز ہیں، وہ ہندوستانیوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ علی حزین جس بد دماغی سے برصغیر ہندوپاکستان کے شعرا سے پیش آتا تھا، وہ استشہاد کی محتاج نہیں۔ معلوم نہیں اس حقیقت کے پیش نظر غالب کو یہ خیال کیسے ہوا کہ اہل زبان اس کی زبان دانی کا لوہا مان جائیں گے اور وہ ان کے گروہ میں شامل ہو کر ایرانی شناسان ہندی نژاد کو مردود ٹھہرائے گا۔ غالب کی طبیعت کے رجحان کے پیش نظر یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی تھی کہ وہ ہندی نژاد فارسی شناسوں کی جماعت کا ساتھ دیتا لیکن ہوا یہ کہ اس نے اپنے آپ کو علی حزین کے گروہ میں شمار کیا اور بر صغیر ہند و پاکستان کے استادان فن کو ایرانی زبان کے رموز واسرار سے نا بلد سمجھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ غالب جب کلکتے گیا (۱۸۲۸ء) تو وہاں اس نے غزل پڑھی جس کا شعر ہے:

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہم چو موے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عالم مفرد ہے، ہمہ کے ساتھ اس کا ربط بہ اجتہاد قتیل درست نہیں ہے۔ کفایت خاں رئیس ہرات بھی مشاعرے میں موجود تھے، انھوں نے ''ہمہ عالم،، کی سند سعدی و حافظ کے کلام سے پیش کی لیکن اس سے مخالفین کا اطمینان نہیں ہوا۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ ''زمیاں برخیزد،، صحیح نہیں ھے۔

تیسرا اعتراض ''کدہ،، کے استعمال پر تھا ۔

غالب نے ان اعتراضات پر جل کر کہا کہ ''میں فریدآباد کے کھتری بچے کا قول نہیں مانتا ۔،،

کلکتے میں غالب کے معترضین کی تعداد کافی تھی اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ عبدالغفور نساخ نے یہ لکھی ھے کہ کلکتے کے قیام میں غالب کا ملنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے تھا، ان لوگوں نے ان کے کلام کی خاطر خواہ تعریف و توصیف کی بلکہ کفایت خاں نے کلکتے کے شاعروں میں صرف غالب ھی کی قدر افزائی کی - حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتے کے بہت بڑے تاجر تھے - ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نام مقیم تھے - انھوں نے مجلس عام میں کھڑے ھوکر کہہ دیا تھا کہ اس درجے کا شاعر آج سر زمین ایران میں کوئی نہیں، یہ باتیں مخالفین برداشت نہیں کر سکتے تھے ۔

مرزا غالب نے اعتراض سے تنگ آ کر ایک مثنوی ''باد مخالف،، لکھی جس میں سخن پروران کلکتہ سے معذرت کی، لیکن اس مصالحت میں بھی کئی تیر و نشتر چھپے ھوئے تھے[1] - یہ مثنوی سید مسعود حسن رضوی نے بہ تمام و کمال شائع کر دی ھے اور اس کے اشعار کی ترتیب بھی درست کر دی ھے[2] ۔

اس مثنوی میں غالب نے جو موقف اختیار کیا ھے، اس کی صورت وھی ھے جو حالی نے بہ تفصیل بتائی ھے: ''اھل ھند میں

۱- احوال : ۲۰۴ تا ۲۰۶ -

۲- متفرقات: ۱۱۵ تا ۱۴۰ -

سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں - میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے، اس لیے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے - انھوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوائی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا (قتیل نو مسلم تھے، اسلام لانے سے پہلے ان کا نام دلوائی سنگھ تھا اور فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے) - غالب نے ''باد مخالف،، میں جو موقف اختیار کیا ہے، اصولی طور پر وہ اس لیے غلط ہے کہ غالب خود بر صغیر ہند پاکستان میں پیدا ہوا، یہیں پرورش پائی، یہیں کے فارسی دانوں سے مستفید ہوا، یہیں کے علما اور اکابر مفکرین سے فیض حاصل کیا - اگر وہ اس فضا میں پرورش پا کر اساتذۂ ایران کا ہم پلہ ہو سکتا ہے تو قتیل اور واقف نے کیا گناہ کیا ہے - باقی رہا یہ سوال کہ غالب کو ایک نہایت جلیل القدر استاد مل گیا تھا تو میں اس قصے کو بالکل تسلیم نہیں کرتا ہوں اور اس کے شواہد ابھی پیش کرتا ہوں - پہلے ''باد مخالف،، کے وہ اشعار سن لیجیے جن کا مقصد بظاہر معذرت اور طلب عفو تھا لیکن جن کا نتیجہ سخت دل آزاری کی صورت میں ظاہر ہوا - کلکتے کے لوگوں سے خطاب کر کے کہتا ہے :

آں رہ و رسم کارسازی کو
شیوۂ میہماں نوازی کو

کار احباب ساختن رسم است
میہماں را نواختن رسم است[1]

۱- مراد یہ ہوئی کہ مہمان زبان اور بیان کے معاملے میں کسی کو خاطر میں نہ لائے اور اپنے آپ کو عرفی اور نظیری کا مثیل سمجھے تو میزبان اس کے ان دعووں کو سچا سمجھیں اور بر خود غلط مہمان کی دل دہی کریں -

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ، پھر خطاب ہوتا ہے :

به من این خشم و کین دریغ دریغ
من چناں تاں چنیں دریغ دریغ[۱]

اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے غالب نے معترضین سے یوں خطاب کیا ہے جیسے وہ فارسی کی مبادیات سے بالکل آگاہ نہ ہوں ۔ اعتراضات کا جواب دینے کے بعد صرف اس اعتبار سے کہ لوگ غالب کو سفیہ نہ کہیں ، شوخ چشم نہ سمجھیں ، زشت خو تصور نہ کریں ، بے حیا اور ہرزہ گو کے القاب سے ملقب نہ کریں ، رندانہ اور بے باکانہ گفتگو کا ملزم نہ گردانیں ، غالب کو ننگ دہلی نہ سمجھیں ، اس نے قتیل کی تعریف میں کچھ شعر بھی کہہ دیے ہیں جنہیں مدح کی بجائے شدید قسم کی ہجو ملیح کہا جا سکتا ہے ۔ مثلاً :

فیضے از صحبت قتیلم نیست
رشک بر شہرت قتیلم نیست
مگر آناں کہ پارسی دانند
ہم بریں قول و عہد و پیمانند
کہ ز اہل زباں نہ بود قتیل
ہرگز از اصفہاں نہ بود قتیل
لاجرم اعتماد را نہ سزد
گفتہ اش استناد را نہ سزد

۱- مراد یہ ہوئی کہ غالب پر جو اعتراضات کیے گئے ، وہ بددیانتی اور کینہ پروری پر مبنی تھے ۔ یہ اچھی معذرت ہو رہی ہے- پھر دوسرے مصرع میں اپنا جو بلند مقام بتایا ہے ، اس کا تو جواب ہی نہیں ۔

ان اشعار کے بعد جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اگرچہ اصفہان کا نہیں لیکن اس کی زبان مستند ہے، وہ اسیر کی، صائب کی، عرفی کی، نظیری کی، سعدی کی، طالب کی، خاقانی کی اور ظہوری کی تعریف کرتا ہے، اور پھر کہتا ہے کہ احباب کو خوش کرنے کے لیے اور جنگ کو صلح میں بدلنے کے لیے میں قتیل کی تعریف کرتا ہوں (ہر چند کہ وہ اس کا سزا وار نہیں ہے) ۔

قتیل کی تعریف میں جو شعر کہے گئے ہیں، ان کا نقل کرنا بے کار ہے۔ ان اشعار میں غالب نے قتیل کو انوری اور خاقانی سے بڑھا دیا ہے۔ یا تو یہ صورت تھی کہ قتیل کسی طرح مستند ہی نہ تھا یا پھر یہ صورت ہوئی کہ انوری اور خاقانی اس کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے ۔ اب آپ خود انصاف فرمائیے کہ یہ صلح ہوئی یا اعلان جنگ ۔

حالی نے غالب کا یہ شعر اگرچہ بہ ظاہر صحیح ترتیب سے نقل نہیں کیا لیکن بہرحال مطلب واضح ہے :

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را
چہ شناسد قتیل و واقف را[1]

میں اس بات کا اصولی جواب دے چکا ہوں کہ غالب نے قتیل کو جن اعتراضات کا ہدف بنایا ہے اور واقف کو جن الزامات کا ملزم ٹھہرایا ہے، خود غالب کی ذات بھی انھی اعتراضات کا

۱- یادگار : ۲۳ - تعجب کی بات ہے کہ مجھے متفرقات میں صفحات ۱۱۵ سے ۱۴۰ تک یہ شعر نہیں ملا ، البتہ احوال میں یہ شعر درج ہے (صفحہ ۲۰۶) - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسعود حسن رضوی سے سہو ہوا ہے اور غالباً یہ سہو کتابت ہے ورنہ وہ تصریح کر دیتے کہ میرے نسخے میں یہ مشہور شعر نہیں ملتا -

ہدف بنتی ہے ۔ غالب کسی طرح بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے فارسی زبان کے اسرار و رموز کے سلسلے میں دوسرے فارسی شناسان ہندی نژاد پر اصولاً کوئی تفوق حاصل ہے۔ ملا عبدالصمد کا مسئلہ میں ابھی طے کرتا ہوں ، پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کیا قتیل اور واقف اتنے گئے گزرے ہوگئے کہ غالب ان کے متعلق یہ کہہ سکے کہ میں ان کو جانتا بھی نہیں ، خاطر میں بھی نہیں لاتا ۔ خواجہ احمد فاروقی نے اس سلسلے میں جو تفصیلی بحث کی ہے ، وہ بہت مفید ہے[1]۔

اکرام الحق[2] کا بیان ہے کہ قتیل کا خاندان بٹالے کا رہنے والا تھا لیکن وہ خود دہلی میں پیدا ہوا ، تاریخ ولادت ۱۱۷۲ ہجری ہے ۔ اس کو فرید آبادی بھی کہتے ہیں اور غالب نے فرید آبادی کہہ کر بڑی حقارت کا اظہار کیا ہے ، لیکن اس کا کیا علاج کہ فرید آباد دہلی کا ایک محلہ ہے ۔ ''نشتر عشق،، کے بیان کے مطابق ۱۲۳۳ ہجری میں وفات ہوئی ، لیکن صاحب ''شمع انجمن،، ۱۲۴۰ھ بتاتے ہیں ۔ قتیل نے شمالی ہندوستان کی خوب سیر کی اور فارسی میں اچھی خاصی استعداد بہم پہنچائی ۔ معاملہ بندی میں اس کی مشہور غزل نظیری کے تتبع میں ہے :

ما را بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت
خود سوے ما نہ دید و حیا را بہانہ ساخت
دستے بدوش غیر نہاد از رہ کرم
ما را چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت

۱- احوال : ۱۹۳ تا ۲۱۲ -
۲- فی الهند : ۶۰ -

آمد برون خانه چوں آواز ما شنید
بخشیدن نوال گدارا بہانه ساخت
خون قتیل بے سرو پا را به پاے خویش
مالید آں نگار و حنا را بہانه ساخت[1]

نورالعین واقف اکرام کے قول کے مطابق بٹالے کے رہنے والے تھے - آرزو یه کہتے ھیں که واقف شرفاے پنجاب میں سے ھے - اس کا باپ یا جد انبالے کا قاضی تھا اور انباله مضافات لاھور میں ایک قصبه ھے - واقف خان آرزو کا شاگرد ھے - شیخ محمد اکرام نے "ارمغان پاک" میں تاریخ وفات ۱۱۹۰ ھجری اور جاے وفات بہاول پور بتائی ھے ، سند پیش نہیں کی - اکرام کے قول کے مطابق وہ چھبیس صفر ۱۲۰۲ ھجری میں فوت ھوا اور بٹالے کے

۱- میں سمجھتا ھوں که یه شعر (فی الهند ٦۰) قتیل کے تمام ادبی گناھوں کا کفارہ ھیں - اس زمین میں اور استادوں نے بھی معرکے کی غزلیں کہی ھیں ، مثلاً یه دو شعر مجھے یاد ھیں ، اگرچه معلوم نہیں کس کے ھیں :

زاهد نه داشت تاب جمال پری رخاں کنجے گرفت و یاد خدا را بہانه ساخت
رفتم به مسجدے که به بینم جمال دوست دستے به رخ کشید و دعا را بہانه ساخت

اکرام نے لکھا ھے که اس زمین میں نظیری کی بھی غزل ھے اور اس کا یه شعر نقل کیا ھے :

مستانه می گذشت نظیری به کوے یار آنجا رسید و سستی پا را بہانه ساخت

مجھے یه شعر نظیری کی غزلیات (مطبوعه مبارک علی) لاھور میں نہیں ملا ، ھو سکتا ھے که اکرام صاحب کے سامنے نظیری کا کوئی اور نسخه ھو ، یوں کسی سخن آشنا دوست سے یه سنا بھی نہیں که اس زمین میں نظیری کی غزل ھے - نظیری کا جو ایرانی ایڈیشن شائع ھوا ھے ، وہ میری دسترس میں نہیں اس لیے به تحقیق نہیں کہه سکتا -

باہر قبرستان موسوم بہ ''گنبد قاضی'' میں دفن ہوا۔ اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم ۷۰ برس کی عمر پائی ، تخمینہ یہ ہے کہ بارھویں صدی ھجری کے اوائل میں پیدا ہوا ہوگا۔ مذہباً شیعہ تھا ، اگرچہ کسی حد تک تصوف کو بھی اس کے عقیدے میں دخل تھا۔ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی استعداد کا مالک تھا ، سیر و سیاحت بہت کی ہے ، دکن بھی پہنچا ہے اور زیارت بیت اللہ سے بھی مشرف ہوا ہے ، آزاد وضع اور درویش مزاج تھا۔ اکرام الحق کے پاس ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو ۱۲۷۸ ھجری کا لکھا ہوا ہے۔ ان کی انتقادی رائے یہ ہے کہ واقف کی شاعری کی بڑی خصوصیت مضمون آفرینی ہے[1] ۔

حال ہی میں پنجابی ادبی اکیڈیمی نے غلام ربانی عزیز کا ترتیب دیا ہوا 'دیوان واقف' شائع کیا ہے۔ غلام ربانی کے قول کے مطابق اس نے ۱۱۹۰ ھجری مطابق ۱۷۷۸ء میں وفات پائی۔ اسے اکثر لاھوری بھی کہتے ہیں۔ ربانی نے اس دیوان کی ترتیب میں 'دیوان واقف' کا وہ خطی نسخہ استعمال کیا ہے جو اس کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا۔ واقف نے اس کی تصحیح بھی کی تھی اور مختلف مقامات پر امضا بھی کیا تھا[2] ۔

واقف کا یہ دیوان بڑی تقطیع کے ۸۴۵ صفحات کو محیط ہے۔ اس دیوان میں وہ غزل موجود ہے جو واقف کا شعری کارنامہ ہے اور جسے پڑھنے کے بعد اس کی جلالت قدر کا صحیح اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ میں یہ غزل پوری نقل کرتا ہوں تاکہ

۱- فی الہند : ۲۳۷ تا ۲۵۶ -

۲- واقف : الف تا یا

اس کے اسلوب کلام کا اندازہ ہو جائے اور غزل میں جو موڈ کا تسلسل ہے ، اس سے بھی پڑھنے والوں کو آگاھی حاصل ہو جائے۔ اس غزل کی زبان ، اس کا لہجہ ، اس کا روزمرہ ، اس کا محاورہ اور اس میں ایک سپردگی کی خاص کیفیت ظاہر کرتی ہے کہ واقف کو فارسی زبان پر نہ صرف قدرت حاصل تھی بلکہ وہ اس زبان کے رموز و اسرار سے کاملاً آگاہ تھا اور غالب کا واقف کو حقارت سے مسترد کردینا سخت ناانصافی کی بات ہے :

هر غنچه بشکفت الا دل من اى وا دل من اى وا دل من
ناله چو بلبل شبها دل من عاشق دل من شیدا دل من
در کنج هجراں جاں داد آخر بے کس دل من تنها دل من
ویرانهٔ عشق معمورۂ حسن مجنوں دل من لیلا دل من
باسنگ طفلاں یا رب چه سازد نازک دل من مینا دل من
مقبول دیر و مردود کعبه کافر دل من ترسا دل من
نے خوں شداز غم نے آب از درد آهن دل من خارا دل من
از ربط الفت دارد تپیدن آں جا دل او ایں جا دل من
گر دیده رازش افشا نه کردی زینساں نگشتی رسوا دل من
گه می فشارد گه می گزارد یارب چه دارد غم با دل من
در کوئے خوباں تا راهش افتاد غلطید در خوں صد جا دل من
رحمی نداری با یک مسلماں کافر دل من ترسا دل من
گفتی که دارد ایں گونه خوارت مرزا دل من آقا دل من
دارد سر من دارد سر او پنهاں دل او پیدا دل من
واقف سرشکم رنگین بر آمد امروز خوں شد گویا دل من[1]

میں اس ضخیم دیوان سے مزید غزلیں بھی نقل کر سکتا ہوں لیکن بے کار سمجھتا ہوں کہ جس اسلوب کلام کا اظہار اس

۱- واقف : ۶۵۹ -

غزل میں ہوا ہے، اس کی تائید مزید کے لیے شہادتیں مہیا کروں۔ واقف کے پورے دیوان میں زبان اور بیان پر عبور کی یہی کیفیت ملے گی اور غالب کی حقیقت ناشناسی واضح ہوگی۔

غالب نے اپنے وجود معنوی کی مدافعت کے لیے جو خط دفاعی تیار کیا تھا کہ میں فارسی زبان کا محقق ہوں اور اس زبان کے رموز و اسرار کا رازدار ہوں، کلکتے میں اس خط کی شکست و ریخت شروع ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب ذہنی طور پر اندر ہی اندر سلگتا رہا اور سوچتا رہا کہ زبان دانی کے میدان میں اس کی جو بے آبروئی ہوئی ہے، اس کی تلافی کرے۔ اس کا موقع اسے یوں ملا کہ جب وہ ''دستنبو'' کے لکھنے سے فارغ ہوا تو خانہ نشینی کے دنوں میں مطالعے میں وقت گزارنے لگا۔ اس کے پاس ان دنوں صرف ''برہان قاطع'' تھی۔ (تالیف محمد حسین تبریزی)۔ خود مؤلف ہندوستان میں پیدا ہوا تھا اور بیش تر عمر دکن میں گزری تھی۔ غالب نے اس کتاب پر اعتراضات کیے اور اپنی کتاب کا نام ''قاطع برہان'' رکھا۔ یہ تصنیف ۱۸۶۰ عیسوی میں مکمل ہوئی (مطابق ۱۲۷۸ ہجری)۔ اس کی طباعت ۱۲۷۸ ہجری میں ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی ہندوستان کے عام فارسی دانوں نے جو کلکتے میں غالب کا موقف اور طرز عمل دیکھ چکے تھے، ہنگامہ برپا کر دیا اور غالب کو تا دم زیست اس ہنگامے سے نجات نہ ملی[1]۔ اور ابوالکلام آزاد کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں غالب قلعے سے بالکل بے تعلق نہیں ہوا۔ لیکن نہ صرف قرائن اس بات کے موید ہیں کہ اس نے اپنا بیش تر وقت خانہ نشینی میں گزارا بلکہ خارجی

۱- غالب: ۳۳۴، ۳۳۶۔

شہادتیں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں[1]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''برہان قاطع،، اغلاط سے پاک نہیں لیکن کس لغت کے متعلق دعوی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اغلاط سے پاک ہے؟

میرے سامنے نول کشور کا نسخہ ہے (بار سوم)، یہ ۱۱۳۵ صفحات کو محیط ہے، بڑی تقطیع ہے، ہر صفحے پر دو کالم ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کلمات کس کثرت سے درج ہوں گے۔ برہان قاطع کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایران والوں نے ایک مفصل اور تحقیقی فارسی فرہنگ کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی تو انھوں نے ''برہان قاطع،، کو متن قرار دیا۔ یہ لغت محمد معین کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے اور اس پر علی اکبر دہ خدا، ابراہیم پور داؤد، علی اصغر حکمت اور سعید نفسی کے مقدمات شامل ہیں۔ ابراہیم پور داؤد نے بتایا ہے کہ ''دساتیر،، جو لغت کی ایک جعلی کتاب ہے، فارسی زبان پر لعنت کی طرح مسلط ہو گئی اور اس کے مختلف کلمات مختلف لغات میں شامل ہو گئے۔ برہان میں بھی یہ مجعول کلمات ملتے ہیں لیکن یاد رہے کہ غالب بھی اس بات سے آگاہ نہیں کہ ''دساتیر،، ایک مجعول فرہنگ ہے اور اس سے استشہاد کرنا بالکل غلط ہے۔ اسی طرح علامہ علی اکبر نے بتایا ہے کہ فارسی کے مشہور لغت فرہنگ شعوری میں بھی ہر قسم کے اغلاط ملتے ہیں۔ خود برہان قاطع کے متعلق علی اصغر حکمت نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ برہان قاطع میں کیا خوبیاں ہیں اور تسلیم کیا ہے کہ اس میں نقائص موجود ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ یہ نقائص تمام پرانی لغات

۱- نقش آزاد: ۲۹۹ تا ۳۰۳ لیکن دیکھیے احوال، یادگار غالب، غالب نامہ، نقد غالب اور نادرات۔

میں موجود ھیں۔ آخر میں لکھا ھے کہ برھان قاطع اپنے اثر اور زمانے کے اعتبار سے نہایت مفید معلومات رکھتی ھے اور ایک بلند مرتبے کی حامل ھے۔

غالب نے 'برھان قاطع' پر جو اعتراضات کیے ھیں ان کے متعلق محمد معین کا فیصلہ یہ ھے کہ بعض معاملات میں غالب سچا ھے، بعض اعتراضات غلط ھیں اور بہت سے مواقع ایسے ھیں کہ غالب نے نزاع لفظی کو مدار اختلاف بنا لیا ھے۔

ایرانی مصنفوں کی یہ آرا پڑھنے کے بعد کوئی شبہ نہیں رھتا کہ برھان قاطع ایک نہایت مستند لغت ھے اور اگر غالب نے اس میں کچھ غلطیاں نکال بھی دیں تو کوئی حشر برپا نہیں ھوگیا کہ ھر لغت میں غلطیاں موجود ھوتی ھیں جیسا کہ میں خود فرھنگ غالب کی بعض غلطیاں پیش کروں گا[1]۔

'فرھنگ انجمن آرائے ناصری' جو ایرانی الفاظ کی ایک مستند لغت ھے، غالب کے بعض اعتراضات کو صحیح تسلیم کرتی ھے لیکن اکثر 'برھان قاطع' کی تائید ھی کا پہلو مصنف کی تحریر سے نکلتا ھے۔

غالب کی علمی اور تحقیقی قابلیت اور 'برھان قاطع' کے قصے کے متعلق تفصیلی معلومات کا تذکرہ قاضی عبدالودود نے اس انداز میں کیا ھے کہ اب یہ معاملہ تیقن کی حدود میں جا پہنچا ھے کہ غالب کی تحقیق و تدقیق نہایت ناقص تھی[2]۔

اس بیان سے یہ مقصود نہیں کہ غالب کو فارسی زبان کے مزاج سے آگاھی نہیں یا وہ فارسی کی شعری روایات سے بے خبر ھے، صرف

۱- برھان: مقالات پور داؤد، علی اکبر دہ خدا، علی اصغر حکمت سعید نفسی، محمد معین، بالخصوص صفحہ ۱۱۳-

۲- نقد: ۳۴۵ تا ۵۴۴-

یہ کہنا مطلوب ہے کہ لسانی تحقیقات میں غالب کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ بات آگے چل کر واضح ہوگی کہ اگرچہ اس کا ذخیرۂ الفاظ بہت محدود نہیں لیکن جن کلمات کو وہ ٹھیک پہچانتا ہے، انھیں اس طرح پہچانتا ہے جس طرح پہچاننے کا حق ہوتا ہے، لیکن ابھی اس بات کی گرہ کشائی کا وقت نہیں آیا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، غالب کو نہ صرف اپنی فارسی دانی پر ناز تھا بلکہ اس بات پر بھی غرور تھا کہ وہ لسانی اعتبار سے فارسی کلمات کے رگ و ریشہ سے واقف ہے۔ جب برہان قاطع اور اور قاطع برہان کا سلسلہ اپنی ہنگامہ آرائی کے عروج پر پہنچا تو غالب نے آخر کار فیصلہ کیا کہ عدالت کے ذریعے اپنی علمیت اور فضیلت جمہور پر ثابت کرے۔ یہ فیصلہ کس قدر غلط تھا، مقدمے کے انجام نے ثابت کر دیا۔ مشرق میں یہ دستور ہے کہ جس شخص کو فوجداری مقدمے میں ماخوذ کیا جاتا ہے، عموماً ہم دردی اسی کے ساتھ ہوتی ہے اور گواہان استغاثہ کو بہ سہولت قانونی اصطلاح میں بٹھایا جا سکتا ہے۔ غالب نے ۱۸۶۷ء میں مولوی امین الدین مصنف 'قاطع قاطع' پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش کرنے کا فیصلہ کیا کہ اس تصنیف میں کثرت سے فحش اور ناشائستہ الفاظ تھے۔ غالب نے استغاثے میں فحش کلمات اور اشارات کی نشان دہی کی اور مدعاعلیہ نے 'قاطع قاطع' کو اپنی تصنیف تسلیم کرتے ہوئے جرم کے ارتکاب سے انکار کیا۔ جتنے فحش اشارات تھے، اُن کی نہایت رکیک اور بیہودہ تاویل کی۔ اس کے باوجود غالب کے خلاف پڑھے لکھے آدمی بہ حیثیت گواہ پیش ہوئے اور انھوں نے امین‌الدین کی تاویلات رکیک کی تائید کی۔ جب غالب پر یہ بات واضح ہوئی کہ اگر مقدمہ جاری رہا تو غالباً فیصلہ ان کے خلاف ہوگا، علم اور فضیلت کی دھاک تو کیا بیٹھے گی،

مزید بے آبروئی ہوگی، تو غالب نے آخر کار ۲۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو اپنے وکیل عزیزالدین کے ذریعے عرضی دی کہ مجھ میں اور مولوی امین الدین میں رؤسائے شہر نے سمجھوتا کرا دیا ہے، باہم رضامندی ہوگئی ہے، مقدمہ داخل دفتر کیا جائے۔ چنانچہ اوبرین صاحب بہادر کی عدالت سے مقدمہ خارج ہوا اور کاغذات داخل دفتر ہوئے۔

عمر کے اس مرحلے پر جب غالب کا خیال تھا کہ اب لوگ نہ صرف اس کے مقام سخن سرائی سے آگاہ ہیں اور اس کی فضیلت علمی پر مطلع ہیں بلکہ اس کی رئیسانہ آبرو کے بھی محافظ ہیں، اس مقدمے کا خارج ہونا قیامت ہوگیا۔ اسے طبعاً سخت رنج گزرا ہوگا کہ ہر طرح اس کی بے آبروئی کی گئی اور اس کی تضحیک کا سامان بہم پہنچایا گیا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس کی وفات جو اس قضیے کے ایک سال بعد واقع ہو جاتی ہے، کسی حد تک اس ذہنی کوفت کو بھی اس حادثے میں دخل ہوگا جو اسے اٹھانا پڑی۔ مقدمے کی تفصیلات اب 'احوال غالب' میں دیکھی جا سکتی ہیں [1]۔

ہرمزد یا عبدالصمد کی داستان

میں نے کہا تھا کہ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا یقین ہے کہ ہرمزد یا عبدالصمد ایک وجود فرضی ہے اور غالب نے مصلحتاً اس کی تخلیق کی ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ قاضی عبدالودود نے لکھ دیا ہے، اس پر اضافہ ناممکن ہے، اسی لیے میں انھی کے بیانات کی نہایت مختصر تلخیص پیش کرتا ہوں [2]۔ جہاں

۱- احوال، مضمون ڈاکٹر مولوی عبدالحق: ۱۳۹ تا ۱۷۱۔

۲- احوال: ۲۲۴ تا ۲۶۵ - علی گڑھ میگزین، غالب کا ایک فرضی استاد: ۶۵ تا ۷۷۔

میں نے قاضی صاحب کی تلخیص کے سلسلے میں خود کسی رائے کا اظہار کرنا چاہا ہے، وہاں متن کی بجائے حاشیے سے کام لیا ہے۔

قاضی صاحب کے دلائل کہ ہرمزد یا ملاعبدالصمد وجود خارجی نہیں رکھتا تھا اور غالب کی ذہنی تخلیق تھا، ان تین بنیادوں پر استوار ہیں:

(۱) غالب کے سوا قطعاً کوئی شخص اس بات کا مدعی نہیں کہ میں نے ہرمزد یا عبدالصمد کو دیکھا ہے یا اس سے باتیں کی ہیں۔ جو شخص بھی عبدالصمد کا ذکر کرتا ہے، غالب ہی کے حوالے سے کرتا ہے۔

(۲) خود غالب کے بیانات عبدالصمد کے سلسلے میں متضاد ہیں۔ کبھی تو وہ کہتا ہے کہ اس شخص نے مجھے فارسی زبان کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا اور کبھی کہتا ہے کہ مجھے خدا کے سوا اور کسی سے فیض تلمذ حاصل نہیں ہوا۔

(۳) حالی کے بیانات عبدالصمد کے سلسلے میں مبہم ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے غالب کے متضاد بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ ناکامیاب رہے۔

قاضی صاحب کا خیال ہے کہ غالب نے عبدالصمد کی تخلیق اس لیے ضروری سمجھی کہ اسے قاطع برہان کی تحریر کے وقت عام لوگوں کی صریح مخالفت کا علم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بے استادا نہ کہلائے اور اپنے دعووں کے اثبات کے لیے ایک ایسے آدمی کا سہارا لے جو ایرانی نژاد ہو اور جس کا فرمودہ فارسی دانان ہندی نژاد کے لیے سند ہو۔

مالک رام نے قاضی صاحب کے اس موقف کو صحیح تسلیم نہیں کیا لیکن ان کے دلائل جن کا خلاصہ خود قاضی صاحب نے احوال میں درج کر دیا ہے، نہ صرف یہ کہ قاطع نہیں ہیں بلکہ اتنے کم زور ہیں کہ غور اور تعمق کے بغیر ان کی تردید کی جا سکتی ہے[1]۔

حالی کے متعلق قاضی صاحب کا یہ بیان بالکل درست ہے کہ اس نے مرزا غالب کے متضاد بیانات کی مطابقت میں ٹھوکر کھائی اور غالباً اس لغزش کی وجہ حالی کی غالب سے وہ عقیدت تھی جو شیفتگی اور فریفتگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

حالی کہتا ہے: ”کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدائے فیض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چوں کہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔“ مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جا بجا اس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اس کو بہ لفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے، یاد کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے، مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد ان کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر

۱۔ احوال: ۲۳۴ تا ۲۶۵۔ مالک رام کے اعتراضات کا جواب استدراک (۲۰۸) سے شروع ہوتا ہے

آئی اور قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔

اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبدائے فیض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ ایک جگہ مرزا نے مبدأ فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے اور وہ شعر یہ ہے:

آنچہ در مبدأ فیاض بود آن من ست
گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں من ست

ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

بہ اخذ فیض ز مبدا فروزم از اسلاف
کہ بودہ ام قدرے دیر تر دراں درگاہ
ظہور من بجہاں دو ہزار و بست و دویست
ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

ملا عبدالصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اس کی مادری زبان اور اس کی قوم کی مذہبی زبان تھی، عربی زبان کا بھی جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے، بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اس کی صحبت بہت کم میسر آئی مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغرسن میں ایسے شفیق، کامل اور جامع اللسانین استاد کا مل جانا ان نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا مگر اس کے فیض صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ''اگر حاصل شود خواندہ

و نا خوانده برابر است ، و اگر حاصل نشود هم خوانده و ناخوانده برابر ۔،، معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی حسن قابلیت اور حسن استعداد نے ملا عبدالصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا ۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا ، یہ فقرہ لکھا تھا : ''اے عزیز ! چہ کسی کہ بایں ہمہ آزادی ہا گاہ گاہ بخاطر می گذری ۔،، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا ، اس میں ہرگز مضائقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ ''قاطع برہان،، اور ''درفش کاویانی،، کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے ، اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحدالاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ اوفی[1] تہ نشین کر دی تھیں[2] ۔

ہمارے انشاپردازوں میں حالی سے زیادہ مخلص ، دیانت‌دار اور باضمیر شخص ملنا دشوار ہے ۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے ، اس میں تذبذب ، انتشار ، بے ربطی اور استخراج نتائج میں غلطیاں اس قدر ہیں کہ حالی کی وضع احتیاط کے پیش نظر یہی کہنا پڑتا ہے کہ بیان حقیقت میں کوئی ایسی چیز سدراہ تھی جو حالی کے لیے گتھی بن گئی کہ کسی طرح سلجھتی ہی نہ تھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز عقیدت تھی اور یہ عقیدت ہی کے کرشمے ہیں کہ حالی نے جو کچھ لکھا ہے ، اس کا بہ کمال دیانت خلاصہ پیش

۱- اولیٰ ؟

۲- یادگار : ۱۳ تا ۱۵ -

کیا جائے تو اس کی صورت یہ ہو گی:

(الف) عبدالصمد نہایت عالم اور فاضل استاد تھا۔ اس نے فارسی زبان کے تمام اسرار و رموز اور پارسیوں کے مذہبی خیالات و افکار مرزا کے ذہن نشین کر دیے تھے۔

(ب) غالب عبدالصمد سے چودہ برس کی عمر میں ملا ہے اور اس استاد اجل نے غالب کے پاس صرف دو سال قیام کیا ہے، اس لیے عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ عبدالصمد نے غالب کو فارسی زبان کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ بھی کر دیا لیکن بالکل آگاہ بھی نہیں کیا۔ مرزا کو فارسی پر قدرت تام بھی حاصل ہو گئی لیکن اس زبان کے متعلق غالب کو عبدالصمد سے کچھ معلومات بھی حاصل نہ ہو سکیں۔

بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی، حالی صراحت سے کہتا ہے کہ غالب کے بیانات کے مطابق غالب نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے جس کا نام عبدالصمد رکھا ہے۔ لیکن غالب کے اس بیان کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک آدمی تھا۔ اب غور فرمائیے حالی کیا کہہ رہا ہے۔ غالب تو تصریح کر رہا ہے کہ میں نے ایک کردار تخلیق کیا ہے۔ کوئی خارجی شہادت اس کردار کے وجود کا اثبات نہیں کرتی لیکن حالی کا پھر بھی یہ دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا۔

جہاں تک غالب کے دعووں کا تعلق ہے تو ان کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جہاں دو بیانات جو بہ صراحت و

بہ وضاحت ایک دوسرے کی ضد ہوں ، ایک شخص سے منسوب کیے
جائیں گے تو یہ نتیجہ حتماً نکلے گا کہ ایک بیان غلط ہے۔ عام
لوگ جس جرم کو حلف دروغی کہتے ہیں (حلف اٹھا کر عدالت مجاز
میں یہ سمجھ کر جھوٹی شہادت دینا کہ شہادت جھوٹی ہے۔
یا اس بات پر یقین رکھ کے کہ میں جھوٹی بات کہہ رہا ہوں ،
عدالت میں کوئی بات کہنا جو چاہے سچ ہی کیوں نہ ہو)
اس میں فرد قرار داد جرم صریح متضاد اور متناقض بیانات کے
متعلق یوں مرتب کی جاتی ہے کہ تم نے یعنی ملزم نے دو
بیانات دیے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں ، تو ظاہر ہے کہ ایک
بیان جھوٹا ہے۔ ایسی صورت میں استغاثے کے لیے یہ ضروری نہیں
کہ وہ کسی ایک بیان کو غلط ثابت کرے ، صریحاً متضاد
بیانات میں سے کسی بیان کو جھوٹا سمجھ کر عدالت ملزم کو
سزا دے سکتی ہے۔ اگر صورت ارتکاب جرم کی نہ ہو اور بحث اس
بات پر ہو کہ جس شخص نے صریحاً متضاد بیانات دیے ہیں ،
اس کی شہادت کو کیا رتبہ دیا جائے ؟ تو طبعاً عدالت کا فیصلہ
یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے کسی بیان پر اعتماد نہیں کیا
جا سکتا ۔ حالی کے جوش عقیدت سے قطع نظر کر لیجیے ، غالب
کے پاس تو کوئی جواز ہی نہیں کہ وہ کذب صریح کا مرتکب ہو۔
مالک رام صاحب نے غالب کی مدافعت میں اگرچہ بہت زور لگایا ہے
لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھی کہ مزید تحقیقات کی عدم موجودگی
میں یہی سمجھا جائے گا کہ عبدالصمد ایک وجود فرضی تھا ۔
اس سلسلے میں غالب کے بیانات سے قطع نظر کر لیا جائے گا
اور دوسری خارجی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ
میں پہلے کہہ چکا ہوں اور قاضی عبدالودود ثابت کر چکے ہیں ،
عبدالصمد کے موجود فی الخارج ہونے کی کوئی مستند دلیل اس

وقت تک ہماری دسترس میں نہیں ہے اور جتنے خارجی قرینے موجود ہیں وہ سب نہ تو حالی کی مطابقت کی کوشش کی تائید کرتے ہیں، نہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غالب کا کون سا بیان سچا ہے۔ ایسی صورت میں غالب کے دونوں متناقض بیانات کو غلط تسلیم کرنا پڑے گا۔

غالب نے ملا عبدالصمد کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ فارسی میں دو حرف متحدالمخرج بلکہ قریب المخرج موجود نہیں۔ س ہے ث و ص نہیں، ت ہے ط نہیں، الف ہے ع نہیں، غ ہے ق نہیں، ز ہے ض اور ظ نہیں۔ اس صورت میں یہ کیوں کر روا رکھا جا سکتا ہے کہ دو حرف متحدالمخرج ذ اور ز فارسی میں موجود ہوں[۱]''

(۳)

پنشن کے سلسلے میں اس نے جو کوشش کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی عام روش سے آگاہ تھا، یعنی یہ کہ رسوخ اور وجاہت خاندانی بڑی چیز ہے لیکن اس کے

۱۔ احوال : ۲۳۶ ۔ واضح رہے کہ فارسی میں ذال اور دال کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور محض عبدالصمد کے حوالے سے حل نہیں ہو سکتا ۔ اس سلسلے میں بہت معرکے کے مقالے لکھے گئے ہیں ۔ دال اور ذال کے محل استعمال کے متعلق محقق طوسی کی یہ رباعی مشہور ہے :

آنانکہ بہ پارسی سخن می رانند در معرض دال ذال را بنشانند
ما قبل وے ار ساکن جز ''واے'' بود دال است وگرنہ ذال معجم خوانند

''واے'' سے مراد حروف علت کا مجموعہ ہے (یعنی واؤ، الف اور یای) ، اگر دال سے پہلے کا حرف ساکن ہے تو دال ذال پڑھا جائے گا بشرطیکہ حروف علت میں سے کوئی حرف ما قبل موجود نہ ہو۔ مثلاً استاد، دال سے پہلے حرف علت ہے تو دال کی بجائے ذال پڑھا جائے گا ۔ (جمع اساتذہ) اسی طرح لوذ کہ حرف علت ماقبل موجود ہے۔ کتابت میں یہ طریقہ دیر تک ملحوظ رہا اور مسودات میں اب بھی نظر آتا ہے ۔

ساتھ دولت دنیوی بھی ہونی چاہیے - فارسی میں مشہور ہے
کہ علم زر و دولت کے بغیر ذلیل و خوار ہوتا ہے - بے شک
غالب کو سخن طرازی کا مقام سحر سازی کی حد تک
میسر ہوا تھا صرف یہ ہی نہیں کہ اس کے کلام میں ایجاز تھا
بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ سراسر
اعجاز تھا - اس کے باوجود اس کی فن کاری کی جو قدر کی گئی
اور اس کی خاندانی وجاہت کو بار بار جو مہلک ضربیں پہنچیں ،
انھیں برداشت کرنا اور پھر زندگی سے سمجھوتا کرنا غالب ہی
کا حصہ تھا - میں اس بات کی تفصیل آگے چل کر بیان کرتا ہوں
کہ غالب نے ان ذہنی صدمات سے کس طرح سمجھوتا کیا جو
برابر عذاب کی صورت میں اس پر نازل ہوتے رہے - لیکن اس مرحلے
پر صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی خاندانی وجاہت کے استحکام
کے لیے ، اپنی آبرو کے تحفظ کے لیے ، علم و فضل میں اپنی
دھاک بٹھانے کے لیے ، سخن طرازی میں اپنا لوہا منوانے کے لیے
اس نے جتنی کوششیں کیں ، ان میں نظر بظاہر اسے نہ صرف
ناکام یابی ہوئی بلکہ خاندانی وجاہت تو مستحکم ہونے کی
بجائے عملاً غارت ہی ہو کر رہ گئی - اگرچہ عمر کے آخری حصے
میں ، جب لال قلعے سے اس کا تعلق قائم ہوا ، اسے خطابات
عطا کیے گئے تھے اور اس کی فارسی دانی اور علم و فضل کا
قولاً و فعلاً اعتراف کیا گیا تھا لیکن غالب جانتا تھا کہ
معاشرے کی صورت کچھ ایسی ہے کہ رئیس جب تک خاندانی وجاہت
کے ساتھ رئیسانہ ٹھاٹھ بھی نہ رکھتا ہو ، اس کے بہت سے
کمالات محجوب و مستور رہتے ہیں - پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس نے
مختلف بادشاہوں اور اکابر کی مدح میں قصیدے کہے - یہاں تک
کہ مطلب براری کے لیے معمولی انگریز حاکموں کو بھی

ظہیر فاریابی۱ کی طرح ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ مدح ہجو ملیح بن گئی، اگرچہ انگریز حکام اس سے بے خبر رہے۔

سب سے دردناک واقعہ جس نے دھلی میں غالب کی خاندانی وجاہت کو صدمہ پہنچایا اور جو اس کی عام بے آبروئی کا باعث بنا، انگریز حاکم فریزر کا قتل ہے۔ یہ داستان اگرچہ دراز اور دل چسپ ہے لیکن مقدمہ اس کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے بغایت اجمال بیان کرتا ہوں۔ پہلے محمد اکرام کے لفظوں میں یہ سن لیجیے کہ غالب کی خاندانی آن بان کا کیا عالم تھا، پھر یہ دیکھیے کہ خاندان لوھارو اور فریزر کے تعلقات کی کیا صورت پیدا ہوئی اور آخر میں ملاحظہ فرمائیے کہ اس سلسلے میں غالب کی بے آبروئی کی نمود کس طرح ہوئی۔

غالب کی خاندانی وجاہت، رئیسانہ آن بان، عالی نسبی اور ناز و نعم کی پرورش کا ذکر کرتے ہوئے محمد اکرام لکھتے ہیں:

مغلوں کا بیشتر زمانہ دھلی میں گزرا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ اکبر آباد میں ہے بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی وہی بلدۂ حسن و شعر ہے۔ مرزا اسد اللہ خان خود ترکی نسل سے تھے اور ان کے دادا ان کے پہلے

۱- ابوالفضل طاہر بن محمد، ظہیر فاریابی (نواح بلخ)، وفات ۵۹۸ ہجری۔ شفق: ۱۸۰، ۱۸۱ - یہ وہی مشہور شاعر ہے جس نے قزل ارسلان کی تعریف میں یہ مشہور شعر کہا ہے:

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا   تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دھد

اسی شاعر نے نظامی کو ثروت سے بہرہ یاب ہوتے ہوئے دیکھ کر مشہور قصیدہ کہا ہے: مرا ز دست هنر هائے خویشتن فریاد

بزرگ تھے جنھوں نے مرزا کی پیدائش سے فقط پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنایا . . . . . -

غالب کے ننھیال کی نسبت ہماری واقفیت بہت محدود ہے لیکن جو خط انھوں نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا ننھیال آگرے کے ممتاز ترین گھرانوں میں سے تھا اور وہاں انھیں ہر طرح کا عیش و آرام اور ہر طرح کی آزادی میسر تھی - ایسی آزادی کا اثر ایک نوجوان امیر زادے پر جس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہو، جو ہو سکتا ہے وہی غالب پر ہوا - نواب اعظم الدولہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

''اسد اللہ خان، مرزا نوشہ، از سمرقند مولدش، جوان قابل و یارباش و دردمند، ہمیشہ بخوش معاشی بسر بردہ . . در خاطر متمکن غم ہائے عشق مجاز، تربیت یافتۂ غم کدۂ نیاز-''

غالب نے اپنے خطوں میں اس رنگین زمانے کی طرف کئی جگہ اشارہ کیا ہے - ان کے ایک ابتدائی فارسی قصیدے کی تشبیب ہے:

آں بلبلم کہ در چمنستاں بشاخسار
بود آشیان من شکن طرۂ بہار
ہر غنچہ از دمم بفضائے شگفتگی
فیض نسیم و جلوۂ گل داشت پیش کار
ہر جلوہ را ز من بتقاضائے دلبری
از غنچہ بود محمل نازے بہ رہ گزار
ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ شاہداں
فہرست روز نامۂ اندوہ انتظار
ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرود و شعر
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

لیکن اس آزادی اور مطلق العنانی کے باوجود مرزا کی تعلیم سے بے پروائی نہیں برتی گئی۔ مرزا کی والدہ خود پڑھنا لکھنا جانتی تھیں اور قرین قیاس ہے کہ انھوں نے مرزا کی تعلیم کا خاص خیال رکھا ہوگا۔ معاصرانہ تذکروں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مرزا کے ایک استاد نظیر اکبر آبادی تھے[1] . . . .

مرزا ابھی تیرہ برس کے تھے کہ میر محمد کاظم بے قرار جو ولی عہد شاہ دہلی ظفر کے استاد تھے، ایک سفارت پر الفنسٹن صاحب کے ساتھ سندھ گئے اور ان کی جگہ ذوق ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے۔ اس وقت ولی عہد کے استاد کا مشاہرہ چار سو روپے ماہوار تھا لیکن ولی عہد کی تخت نشینی کے وقت اس کا استاد شاہ ہو جانا قدرتی امر تھا اس لیے اس تقرر سے مرزا کا راستہ بند ہو گیا۔ جب ہم یہ واقعات دھیان میں رکھتے ہیں تو یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ذوق کی زندگی میں غالب کا استاد شاہ نہ ہونا بہادر شاہ کی بد ذوقی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اتفاقی حوادث کا نتیجہ تھا۔

۱۔ اکرام صاحب کا یہ بیان کہ غالب نظیر اکبر آبادی کا شاگرد تھا، بہ ظن غالب "گلستان بے خزاں" پر مبنی ہے (۱۷۱)۔ آسی بھی یہ کہتے ہیں کہ غالب نظیر اکبر آبادی کا شاگرد تھا اور ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ "پروفیسر شاہباز نے تلمذ غالب کے متعلق متضاد بیانات جمع کر کے آخری رائے یہ دی ہے کہ غالب کو . . . . . آگرے کے ممتاز ملاؤں میں . . . . دونوں کی طرف رجوع کرنا پڑا (یعنی خلیفہ معظم اور میاں نظیر اکبر آبادی، دیکھیے نظیر ۶ تا ۷)۔ اس کے مقابلے میں قاضی عبدالودود سوانح عمری بے نظیر تالیف پروفیسر شاہباز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھلایا نہ اردو . . . . عبدالصمد . . . . کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہ تھا (احوال : ۲۰۱)۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ غالب نے شاہباز کے قول کے مطابق نظیر کو بھی اپنا کلام نہیں دکھایا، میری رائے آگے آتی ہے۔

غالب کے لیے اس سال کا آور بھی زیادہ اہم واقعہ مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحب زادی امراؤ بیگم سے شادی تھی۔ مرزا کی کئی تحریروں سے بالخصوص اس دردناک مرثیے سے جو انھوں نے ۲۰ برس کی عمر سے پہلے لکھا، یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ وہ شادی کو ''دام سخت،، ہی سمجھتے رہے اور ''اڑنے سے پہلے،، گرفتار ہو جانا انھیں بہت ناگوار تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کے لیے یہ شادی ہزار آسانیوں کا موجب ہوئی۔

غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف جن کے متعلق آزاد نے ''آب حیات،، میں کئی صفحے لکھے ہیں، ذوق کے شاگرد تھے اور نہایت پاکیزہ اور موثر شعر کہتے تھے۔ فخرالدولہ نواب احمد بخش جنھوں نے لارڈ لیک کی فتوحات میں نام پیدا کیا تھا، مرزا الٰہی بخش کے بھائی تھے۔ نواب اور نواب کی اولاد سے غالب کے تعلقات کا ذکر بعد میں آئے گا لیکن مرزا کے سسرال پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی شادی ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو نہ صرف جاہ و ثروت کے لحاظ سے ممتاز اور رو بہ ترقی تھا بلکہ شعر و شاعری سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا[۱]۔

ان دنوں سرکار انگریزی سے مرزا غالب کے خاندان کو جو جاگیر عطا ہوتی تھی، اس کی رقم کا ادا کرنا نواب احمد بخش والئ لوہارو کے ذمے ڈال دیا گیا۔ غالب کا دعویٰ تھا کہ پنشن کی رقم دس ہزار روپے سال ہے، نواب فقط تین ہزار تسلیم کرتے تھے جس میں مرزا کا حصہ ساڑھے سات سو روپے بنتا تھا۔ ۱۸۲۶ء میں مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش معروف جو نواب

۱- غالب نامہ : ۳ تا ۶

احمد بخش کے بھائی تھے، فوت ہو گئے۔ اس وقت مرزا کی عمر انتیس تیس سال کی تھی اور تمام عمر عیش و عشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش و مسرت کا سر چشمہ خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے ابتدائی توقعات کی بنا پر قرضے دیے تھے، وہ اب مختصر پنشن دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑا صدمہ اس موقع پر یہ ہوا کہ اس کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہو گیا[1]۔

مہر[2] کے قول کے مطابق اب غالب نے جون ۱۸۲۷ء میں کوشش شروع کی کہ اگر نواب سے سمجھوتا نہیں ہو سکتا تو سرکار انگریزی کا سہارا لیا جائے۔ غالب اسٹرلنگ سے ملا جو ان دنوں چیف سیکرٹری تھے، ان کی تعریف میں پچپن شعر کا ایک فارسی کا قصیدہ کہا اور انھوں نے مدد کا وعدہ کیا۔

سوئے اتفاق دیکھیے کہ اسٹرلنگ کا انتقال ہوگیا، اس موقع پر بھی غالب نے ایک قطعہ وفات لکھا۔ مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف ہوا۔ اس نے پھر براہ راست گورنر جنرل کے پاس اپیل کر دی، یہ اپیل بھی مسترد ہوئی، اور غالب کے خلاف فیصلہ صادر ہوا۔

غالب نے اس مقدمے کے سلسلے میں ولیم فریزر ریزیڈنٹ دھلی کی مدد پر بہت اعتماد کیا تھا کہ اس سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے اور مرزا کو امید تھی کہ اس کی مدد سے جاگیر کا عقدہ حل ہو جائے گا اور نواب لوھارو کو شکست ہوگی۔ فریزر کی تعریف میں بھی غالب کا ایک پر زور قصیدہ موجود ھے جس کا مطلع ھے:

ز جیب افق مہر چوں سر برآرد
مے از سبز مینا به ساغر برآرد

۱- غالب نامه : ۲۳
۲- غالب : ۱۹۸ تا ۱۱۴

غالب اسی امید میں مگن تھا کہ فریزر کے ذریعے اس کی خاندانی وجاہت مستحکم ہو جائے گی اور مالی حالت درست کہ بائیس مارچ ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر (ریزیڈنٹ دہلی) ہلاک کر دیا گیا[۱]۔ اس معاملے کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ ۱۸۲۲ء میں احمد بخش والئ لوہارو نے اپنے دوسرے بیٹوں کی رضامندی حاصل کرکے اپنے سب سے بڑے لڑکے شمس‌الدین کو اپنا وارث مقرر کیا۔ جب احمد بخش کی وفات ہوئی تو بھائیوں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ ریذیڈنٹ دہلی تک معاملہ پہنچا اور آخر مرکزی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ لوہارو کا علاقہ (ریاست فیروز پور جھرکا کا ایک حصہ) شمس‌الدین کے چھوٹے بھائیوں کو دے دیا جائے۔ شمس‌الدین کو یہ بات ناگوار گزری اور آخر ۱۸۳۳ء میں پھر مرکزی حکومت نے لوہارو کا انتظام بھی شمس‌الدین کی اپیل پر اس کے سپرد کر دیا۔ اس وقت فریزر گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا، اس نے شمس‌الدین کی مخالفت شروع کی اور اس کے بھائیوں کو ترغیب دلائی کہ وہ کلکتے جا کر اپنے معاملے کا فیصلہ کروائیں۔ ظاہر ہے کہ شمس الدین کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ سپیر کے قول کے مطابق نواب شمس‌الدین نے ایک شخص مسمی کریم خاں کو جسے بھرمارو کہتے تھے، دہلی بھیجا کہ فریزر کا کام تمام کروائے۔ جان لارنس نے جو ان دنوں پانی پت تھا، دہلی پہنچ کر مقدمے کی تفتیش میں مٹکاف کی مدد کرنی شروع کی۔ آخر کار یہ بات کھل گئی کہ قاتل کریم خاں ہے۔ کریم خاں کا ایک ساتھی سلطانی گواہ بن گیا، اس کی شہادت کی بنا پر اور دوسرے خارجی قرائن کے پیش نظر رسل کالوین نے نواب شمس‌الدین کو پھانسی کی سزا دی، چنانچہ ۳۔ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب شمس‌الدین

۱۔ غالب نامہ : ۳۸

اور کریم خاں کو پھانسی دے دی گئی - مرتے وقت نواب شمس الدین نے ایک سبز قبا پہن رکھی تھی - اسے مہرولی میں دفن کیا گیا اور اس کا مزار زیارت گاہ عام بن گیا[1] -

نواب شمس الدین سے عوام کو بہت ہمدردی تھی - یہ وہی شمس الدین ہے جس نے داغ کی والدہ چھوٹی بیگم کو اپنے گھر ڈال رکھا تھا - داغ کے متعلق دشمنوں کا یہ بیان ہے کہ اس کی ماں شمس الدین کی منکوحہ نہ تھی ورنہ نواب کے مرنے کے بعد دعویٰ کرتی کہ جائداد میں سے داغ کو بھی حصہ ملے -

غالب کو فریزر کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ ایک خط میں اس نے لکھا :

"یکے از ستم گران خدا ناترس کہ بعذاب ابدی گرفتار باد! ولیم صاحب بہادر را کہ ریزیڈنٹ دھلی و غالب مغلوب را مربی بود، در شب تاریک بضرب تفنگ کشت و مرا غم مرگ پدر تازہ کرد[2] -"

اکرام لکھتے ھیں: ان دنوں جو صاحب دھلی میں مجسٹریٹ تھے، وہ غالب کو جانتے تھے - انھوں نے غالب سے تفتیش جرم کے سلسلے میں مدد لی اور سرکاری تفتیش کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب شمس الدین اور اس کا ایک سپاھی مجرم قرار دے دیے گئے - نواب اور غالب کے تعلقات تو عوام کو معلوم ھی تھے، دھلی کے لوگ لے اڑے کہ نواب بے گناہ ھے اور غالب اور فتح اللہ بیگ خاں نے کینہ وری سے حکام کو اس کے خلاف بھڑکا رکھا ھے -

نواب شمس الدین سے جنھیں مسٹر کالون کی مزید تحقیقات کے بعد سوم اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری بازار کے باھر شارع عام

۱- شام : ۱۸۲ تا ۱۹۰
۲- غالب نامہ : ۳۹

میں پھانسی دی گئی ، عوام کو بہت ہمدردی تھی ، اور غالب کے متعلق اگرچہ عوام کا خیال بے بنیاد ہی ہو ، تاہم یہ خیال عام ہونے کے بعد ان کا غالب سے جو برتاؤ ہوگا ، وہ ظاہر ہے۔ مرزا نے ناسخ کے نام اس زمانے میں جو دو خط لکھے ہیں ، ان سے بھی پتا چلتا ہے کہ اس کے لیے یہ وقت کس ابتلا اور آزمائش کا تھا اور وہ غصے اور عداوت سے کس طرح بے قابو ہو رہا تھا ۔ خواجہ محمد شفیع نواب شمس الدین کی شہادت کے وقت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں :

یوسف زنداں میں ہے ، شمس الدین خاں کشمیری دروازے کے باہر قید ، آج سنگار کیوں ہو رہا ہے؟ رہائی کا حکم آگیا ؟ نہیں ، آج قید ہستی سے رہائی ہے ؟ نہا دھو ، پوشاک پہن ، عطر مل ، باہر نکلا ، بسم اللہ کہہ کر پھانسی کے تختے پر قدم رکھا ، بھنگی جو کھڑا تھا ، اسے ہٹا دیا ، اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال کر جان بحق تسلیم ہوا ۔ اہل دربار زار زار رو رہے تھے ، دلی نے اس نوجوان جانباز کو حسرت و یاس سے دیکھا[۱] ۔

بات یہ ہے کہ ۱۸۳۵ء میں در اصل ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بیج بو دیے گئے تھے ۔ مسلمان بلکہ بر صغیر ہند پاکستان کے تمام عوام سمجھ چکے تھے کہ انگریز اس ملک کے ثقافتی نظام کو غارت کرنا چاہتے ہیں ۔ راجوں مہاراجوں کو ، نوابوں کو اور اکابر امرا کو راہ سے ہٹا دینا چاہتے ہیں کہ کہیں کوئی منچلا پھر سلطنت مغلیہ کی پرچھائیں حقیقت میں تبدیل نہ کر دے ۔ نواب شمس الدین کی موت در اصل دہلی کے لوگوں کے لیے اس بات کی رمز تھی کہ اب انگریز اکابر امرا کو بے باکانہ قتل کر دینے میں کوئی رکاوٹ نہیں دیکھتے ۔ بالا کوٹ کی جو تحریک ۱۸۳۱ء

---

۱ - سنبھالا ، ۳۵ تا ۴۰

میں ختم ہوگئی تھی ، اس کی چنگاریاں ابھی تک سلگ رہی تھیں۔ مولانا محمد اسماعیل اور ان کے دوسرے رفقائے کار نے آزادئی وطن کی جو پہلی تحریک چلائی تھی، وہ بظاہر ختم ہو چکی تھی[1] لیکن دہلی کے وہ لوگ جو بظاہر میلوں ٹھیلوں میں مصروف تھے، دراصل انگریزوں کے استیصال کا خواب دیکھ رہے تھے۔

وزیر حسن کے قول کے مطابق[2] دلی کی جان اس کی آن بان تھی۔ غالب نے اس اجتماعی آن بان کی رمز کو نہ پہچانا ۔ وہ کبھی دلی کی اس معاشرت کا جزو نہ بن سکا جس کی تصویر وزیر حسن نے کھینچی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو لال قلعے کے مفکروں، دانش وروں اور شاعروں سے بلند پایہ سمجھتا رہا ۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اب مغلوں کی حکومت ایک سایہ ہے۔ انگریزوں کا نیر اقبال نصف النہار پر ہے۔ اب اگر کوئی مدح کے قابل ہے تو وہ انگریزی حکومت ۔ اب انگریزی حکام ہی کی مدد سے آبرو، رسوخ، وجاہت اور منصب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی کلیات میں نہایت ادنیٰ درجے کے انگریز حاکموں کی تعریف میں بھی قصیدے ملتے ہیں ۔ ذہنی طور پر غالب نے اپنے آپ کو دہلی کے معاشرے کا جزو کبھی نہ سمجھا ۔ وہ اس نئی انگریزی تہذیب کا مداح اور دل دادہ تھا جو بظاہر ملک میں امن و امان قائم کر رہی تھی، ڈکیتی کا استیصال کر رہی تھی لیکن بہ باطن مغلیہ اقتدار پر کاری ضرب لگا چکی تھی ۔ اب صرف یہ باقی تھا کہ بہادر شاہ کو تخت سے اتار کر قلعہ سلاطین سے خالی کرا لیا جائے۔ مرزا قویش سے یہ سمجھوتا ہو بھی چکا تھا اور یہی وجہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر اپنے اس نا خلف لڑکے سے آزردہ تھا ۔ غالب عمر بھر

۱- رومال : ۱۰، ۱۱

۲- دیدار : ۷

یہ سمجھتا رہا کہ وہ تنہا ہے، اگرچہ اس کی انانیت نے اس کا اعتراف کبھی نہیں کیا اور اس نے اپنے آپ کو اور پڑھنے والوں کو یہ کہہ کر فریب دیا:

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب کی پنشن بحال ہوگئی لیکن اس کی مالی حالت درست نہ ہوئی، اسے جاہ و منصب حاصل نہ ہوا۔ انگریزی حکومت سے جو اس نے توقعات باندھی تھیں، وہ باطل ثابت ہوئیں اور آخر میں ریاست رام پور اس کی مدد نہ کرتی تو معلوم نہیں کہ اس جلیل المرتبت فن کار اور خاندانی وجاہت کے شکار کا کیا حشر ہوتا۔

(۴)

نواب سید یوسف علی خاں بہادر فردوس مکانی کی تاریخ ولادت بقول عرشی دوشنبہ پانچ ربیع الثانی ۱۲۳۱ ھجری مطابق ۵ مارچ ۱۸۱۶ عیسوی ہے۔ انھوں نے یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو مسند حکمرانی پر جلوس کیا۔ ہنگامہ ۵۷ء میں حکومت ہند نے تعاون کے سلسلے میں القاب بھی دیے اور ایک لاکھ بیس ہزار آمدنی کا جدید علاقہ بھی بخشا گیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم معقول حد تک حاصل کی تھی، فارسی میں خلیفہ غیاث الدین[1] عزت کی شاگردی اختیار کی جو مشہور لغت "غیاث اللغات" کے مصنف ہیں۔ مرزا غالب سے بھی فارسی میں استفادہ کیا تھا۔ عربی میں اور فلسفہ و حکمت میں مفتی

۱۔ خلیفہ غیاث الدین کی یوں تو اور بھی تصانیف موجود ہیں لیکن 'غیاث' کو بجا طور پر ان کا کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ غالب تو اس لغت کی افادیت سے منکر ہوں گے لیکن مرزا محمد قزوینی جیسے فاضل ایرانی محقق نے اس لغت کی افادیت کا اعتراف کیا ہے اور مصنف کی تعریف کی ہے۔

صدرالدین آزردہ[1] اور مولانا فضل حق خیر آبادی[2] سے تلمذ تھا۔

---

۱ - مفتی صدرالدین آزردہ کی تاریخ ولادت ۱۲۰۲ ھجری ہے۔ وہ اور مولوی فضل حق ہم سبق تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدرالصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ علم و فضل کے ساتھ ذوق سلیم بھی نہایت اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے اجلاس میں جب ایک قرض خواہ نے غالب پر دعویٰ دائر کر دیا تھا تو مدعا علیہ سے یہ شعر سنا:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نتیجہ یہ نکلا کہ دعوے کا روپیہ اپنی جیب سے ادا کر دیا۔ ۱۲۸۵ ھجری ۲۴ ربیع الاول تاریخ وفات ہے۔ علما : ۴۶ تا ۵۴۔

خم خانۂ جاوید میں (جلد اول، ۱۹۰۸ء صفحہ ۶۰) ان کے یہ تین شعر بھی درج ہیں:

مکھڑا وہ غضب، زلف سیاہ فام یہ کافر
کیا خاک جیے کوئی، شب ایسی سحر ایسی
نقشے تو بہت صانع قدرت نے بنائے
پر بن نہ سکا پھر دھن ایسا کمر ایسی
بالیں پہ کھڑا روتا ہے راتوں کو مسیحا
کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی

میں نے دوسرے شعر کی صورت یوں سنی ہے:

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دھن ایسا کمر ایسی

۲ - فضل حق خیر آبادی ۱۲۱۲ ھجری میں پیدا ہوئے۔ منطق اور فلسفے میں انھیں تخصص حاصل تھا۔ جن دنوں یہ دلی میں ریزیڈنٹ کے محکمے کے سررشتہ دار تھے، ان دنوں ان کے ہاں شام کو اکثر اکابر علما اور ارباب ذوق کی نشست رہا کرتی تھی، مثلاً صہبائی، علوی، مومن، غالب، نیر، نصیر، ذوق، عیش، احسان، تسکین۔

آزاد کا بیان ہے کہ غالب کے دیوان کے انتخاب میں دو آدمی شریک تھے: ایک فضل حق اور دوسرے مرزا خانی خان کوتوال شہر دہلی۔ ہنگامۂ ۵۷ء کے سلسلے میں ان پر مقدمہ چلا، حبس دوام کا حکم ہوا۔ جزائر انڈیمان میں ۱۲۷۸ ھجری میں انتقال ہو گیا۔ تصانیف میں مختلف علمی اور فلسفیانہ تخلیقات شامل ہیں (علما : ۳۳ تا ۴۵)

تخت نشینی کے بعد شعر کہنا بھی شروع کر دیا اور ناظم تخلص رکھا (اس کی تفصیل آگے آتی ہے) - عرشی کے الفاظ میں ''نکتہ رس[1]، ذہین، رنگین و شوخ طبیعت اور عجوبہ روزگار استاد نے ان کو زبان اردو کا ایک بلند پایہ شاعر بنا دیا - مومن و غالب کے بعد ان کی نظیر الا ماشا اللہ کا حکم رکھتی ہے - دیوان دو بار شائع ہوا ہے لیکن اب کم یاب ہے[2]۔'' ۲۱ - اپریل ۱۸۶۵ میں سرطان

---

۱ - عرشی نے غالب کی جو تعریف کی وہ سب درست لیکن یہ کہ یوسف علی خاں ناظم زبان اردو کا ایک بلند پایہ شاعر ہے، ایک ایسا فیصلہ ہے جس میں گفتگو کی گنجائش ہے - اعجاز حسین ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں ناظم کا سرے سے نام ہی نہیں لیتے، سکسینہ تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں: ''اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے، اردو میں ناظم تخلص کرتے تھے، صاحب دیوان تھے، ابتدا میں حکیم مومن سے اصلاح لیتے تھے، ان کے بعد مرزا غالب اور پھر میر مظفر علی اسیر کو کلام دکھلانے لگے۔'' (تاریخ ادب اردو - ۲۱۷)- سکسینہ نے اس مختصر سے بیان میں بہت سی غلطیاں کی ہیں، میں متن میں ان سے تعرض کروں گا - بہر حال ظاہر ہے کہ سکسینہ جو نوابان رام پور کے بہت مداح ہیں، ناظم کو اردو شاعری میں کوئی بلند رتبہ عطا نہیں کرتے، یہی دوسرے مورخوں اور نقادوں کا حال ہے - ظاہر ہے کہ عرشی کچھ تو اپنی وضع داری اور کچھ مصلحتوں کی بنا پر یہ بات کہہ گئے ہیں ورنہ ان کے انتقادی فیصلے ہمیشہ نہایت متوازن ہوا کرتے ہیں - (عرشی کے بیانات کے لیے دیکھو ''مکاتیب'' خصوصاً تعلقات رام پور)-

۲ - یہ درست ہے کہ دیوان اب بہت کم یاب ہے - میرے ذاتی نسخے کی کیفیت یہ ہے کہ ناقص الاول ہے یعنی پہلے دو صفحے نہیں ہیں - یہ دیوان یعنی میرا ذاتی نسخہ ۱۲۷۸ ہجری میں طبع ہوتا ہے، مطبع کا نام حسنی ہے جس کے مالک محمد محسن ہیں - ان کے بڑے بھائی بازگل خاں اور نیازگل خاں سرکار رام پور کے قدیم ملازم ہیں (صوبے دار ہیں) - ظاہر ہے کہ یہ دیوان ناظم کی زندگی میں شائع ہوا ہے جیسا کہ خاتمے میں تصریح کر دی گئی ہے (صفحہ ۲۴۵) - مالک رام نے کہا ہے کہ ناظم کے کلام میں غزلوں کی غزلیں ایسی ہیں جن پر غالب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے لیکن وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ غزلیں ناظم کی ہیں - ان کا موقف یہ ہے کہ ناظم کے کلام کا جاندار حصہ استاد نے خود کہہ کے شاگرد کے حوالے کر دیا تھا - اس سے مجھے اتفاق ہے، تفصیل آگے آتی ہے - مالک رام نے بھی وہی غلطیاں کی ہیں جو سکسینہ نے کی ہیں، ان کا ذکر آگے آتا ہے، (تلامذہ: ۲۷۶) -

کے مرض میں وفات پائی -

عرشی نے غالب سے تعلقات رام پور کا بہ تفصیل ذکر کرتے ہوئے مختلف قوی دلائل کی بنا پر حسب ذیل نتائج مستخرج کیے ہیں :

(۱) ناظم نے غالب سے بہ زمانۂ کم سنی فارسی میں استفادہ کیا ہے اور اس کے بعد برابر شاگرد سے اُستاد کے تعلقات قائم رہے ہیں -

(۲) مہر نے (غالب ۱۳۱) جو یہ کہا ہے کہ ناظم ۱۸۵۵ء میں غالب کا شاگرد ہوا ، یہ غلط ہے -

(۳) داخلی شہادت سے واضح ہوتا ہے کہ ناظم ۵ - فروری ۵۷ء کو غالب کا شاگرد ہوا - ۱۵ فروری کو غالب نے لکھا کہ ان تخلصوں میں سے کوئی تخلص پسند کر لیجیے : ناظم، عالی، انور ، شوکت ،نیساں - یوسف علی خاں نے ناظم پسند کیا -

(۴) منشی امیر احمد مینائی نے جو یہ لکھا ہے کہ ناظم کو ازل سے موزوں طبیعت ملی تھی، سخن گوئی کا ذوق تھا ، اردو شعر فرمانے کا شوق تھا ، پہلے مومن سے مشورہ لیتے تھے، پھر غالب سے تلمذ ہوا ، آخر منشی مظفر علی اسیر کو کلام دکھانے لگے (انتخاب یادگار ۷۰) ، یہ غلط ہے -

سکسینہ کو بھی غالباً امیر مینائی ہی کے بیان کی بنا پر یہ اشتباہات پیدا ہوئے ہیں کہ ناظم نے غالب ، مومن اور اسیر سے مشورۂ سخن کیا ہے - مالک رام کو بھی غالباً امیر مینائی ہی کے بیان پر بالکل یہی تشابہ ہوا ہے - عرشی نے امیر مینائی کے بیانات کی تردید میں لکھا ہے : ناظم کا اپنا بیان موجود ہے کہ جب ۵۷ء میں ناظم غالب کا شاگرد ہوا تو اس نے ایک مصرع بھی

موزوں نہ کیا تھا[۱]، اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نواب نے مومن سے پہلے اصلاح لی ہو۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو وہ غالب کو یہ کبھی تحریر نہ کرتا کہ میں نے آج تک کبھی ایک مصرع موزوں نہیں کیا۔

اب رہا منشی مظفر علی اسیر کی شاگردی کا مسئلہ تو ناظم نے غالب کی زندگی میں وفات پائی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ناظم غالب سے بھی مشورۂ سخن کرے اور اسیر سے بھی۔ بات یہ ہے کہ ۱۸۶۴ء میں غالب نے ضعف پیری اور غلبۂ امراض کے باعث نواب سے کہا تھا کہ مجھے اصلاح سے معاف رکھا جائے (اردوے معلیٰ ۶۴)۔ غالباً اسی بنا پر امیر مینائی کو یہ شبہ وارد ہوا ہوگا کہ ناظم نے غالب کی اس درخواست کے بعد کسی اور سے اصلاح لی ہے۔ اسیر کا نام انھوں نے کیوں لیا، اس کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ علاوہ ازیں عرشی نے یہ دلیل بھی فراہم کی ہے کہ ناظم نے متعدد مقطعوں میں غالب کی استادی کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اسیر کا ذکر نہیں کیا۔ اگر وہ بھی استاد ہوتے تو ان کا بھی مذکور کسی نہ کسی جگہ ضرور آنا چاہیے تھا[۲]۔

ہنگامۂ ۵۷ کے بعد جب غالب کی پنشن (ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار) کچھ عرصے کے لیے بند ہوگئی تو انھوں نے اپنے قدیم شاگرد کو اپنی سقیم مالی حالت کی طرف توجہ دلائی اور ایسے الفاظ میں توجہ دلائی جنھیں خود داری سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ ناظم کے دل پر اثر ہوا اور اس نے کوشش کی کہ غالب کا وظیفہ

۱۔ ناظم کے اصل الفاظ یہ ہیں ''مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرع ہم اتفاق نہ مے شدہ بود۔ . . (مکاتیب : ۴، حاشیہ ۱)

۲۔ مکاتیب ، دیباچہ ، تعلقات رام پور خصوصاً : ۵۹ تا ۶۰۔

کھل جائے۔ پھر استادی شاگردی کا تعلق بھی قائم ہو گیا اور غالب کو سو روپے ماہوار باضابطگی سے ملنے لگے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، آخر غالب نے ناظم کے اشعار کی اصلاح سے معذرت چاہی، غالب کے عذر کو معقول سمجھا گیا۔ چناں چہ کم از کم دسمبر ۶۳ء سے دسمبر ۶۴ء تک ناظم نے قریباً ہر ماہ غالب کو خط لکھا ہے لیکن نہ تو اشعار ملفوف کرنے کا ذکر کیا ہے، نہ اس بات کا تقاضا کیا ہے کہ مرسلہ اشعار بعد اصلاح واپس بھیجے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکتوبر ۶۴ء کے آخر میں ناظم سرطان کے عارضے میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے بعد ناظم نے صرف ایک سلام غالب کو لکھ کر بھیجا جو نواب کے انتقال کے بعد غالب نے رام پور واپس کیا[1]۔

جیسا کہ عرشی نے جگہ جگہ صراحت و وضاحت سے لکھا ہے، غالب کو رام پور سے صرف سو روپے ماہوار تنخواہ ہی نہیں ملتی تھی بلکہ وقتاً فوقتاً فتوحات بھی ہاتھ آتی تھیں۔ غالب ناظم کو ایسے دردناک انداز میں اپنی مالی پریشانی کا حال لکھتا تھا کہ وہاں سے کچھ نہ کچھ عطیہ تنخواہ کے علاوہ مل ہی جاتا تھا۔ بات یہ ہے کہ مکاتیب پر عرشی نے جو دیباچہ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامۂ ۵۷ء کے بعد غالب نے گویا حوادث و مصائب کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیے تھے۔ وہی غالب جو کہتا تھا:

جواب سنگدلی ہائے دشمناں ہمت
ز دست شیشۂ دل ہائے دوستاں فریاد

آخر کار اس بات پر مجبور ہوا کہ فلک کی دشمنی کے مقابلے میں بجائے ہمت کے مداہنت اور عجز و مسکنت سے کام لے۔ واضح رہے کہ ہنگامۂ ۵۷ء کے بعد غالب کی تخلیقی قوتیں بالکل سرد نہیں

۱۔ مکاتیب، دیباچہ: ۷۰۔

پڑگئی تھیں، فیضان سخن کا سلسلہ جاری تھا ، البتہ طبیعت کا انداز یہ ہوگیا تھا کہ اب مصائب کے مقابلے میں خودداری اور سربلندی کی وضع قائم رکھنا اور نبھانا مشکل نظر آتا تھا ۔ غالب نے جس اسلوب میں نوابان رام‌پور کو خط لکھے ہیں ، اس کا اندازہ اسی سے کر لیجیے کہ یوسف علی خاں ناظم کو ایک مکتوب[1] میں لکھتا ہے ۔

''خداوند نعمت سلامت!

جو آپ بن مانگے دیں اس کے لینے میں مجھے انکار نہیں اور جب مجھ کو حاجت آ پڑے تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں ۔

بار گران غم سے پست ہو گیا ہوں ، آگے تنگ دست تھا ، اب تہی دست ہو گیا ہوں ۔ جلدی میری خبر لیجیے اور کچھ بھجوا دیجیے۔ عنایت کا طالب غالب ۔

چار شنبہ یازدہم ربیع الثانی ۱۲۷۵ ھجری و ۱۷ نومبر ۱۸۵۸ عیسوی ۔''

نواب نے اس خط کے جواب میں دو سو پچاس روپے کی ہنڈی بھجوائی اور لکھا یہ کہ آپ کے خادموں کے مصارف کے لیے ہے۔ اندازہ کر لیجیے کہ ناظم استاد کی کس قدر تعظیم کر رہا ہے کہ اس روپے کو مصارف خدام کی مد میں شمار کرتا ہے ۔ یہ بھی گوارہ نہیں کرتا کہ سمجھا جائے غالب کو اس روپے کی ضرورت ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب دوسروں کی دل دہی کا بہت خیال رکھتا تھا اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا اپنے ہم مشربوں کو بے جا داد بھی دیتا تھا ۔ شیخ ریاض‌الدین امجد لکھتے ہیں (یہ ۱۸۶۱ء کا واقعہ ہے) :

پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیرافگن خاں کی بارہ دری میں جہاں جناب اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ

۱۔ مکاتیب : ۱۶

رهتے تھے، گیا، مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا۔ سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔.....

میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں، اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں۔ فرمایا کہ کچھ سنائیے، طبع کے جوہر دکھائیے۔ غرض کہ ہیچ مدان نے دو غزلیں ایک فارسی اور دوسری اردو کی سنائیں، مرزا نے ستائشیں جن کا سزا وار نہ تھا، فرمائیں ....

پھر وہ آئے گھر میں مجھ ناکام کے ۔۔۔ کٹ گئے دن گردش ایام کے
وہ اٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے ۔۔۔ دل کو، سینے کو، جگر کو تھام کے
لائے ہاتھوں ہاتھ اہل کارواں ۔۔۔ ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے
ہاتھ اٹھاؤ، ہم رہان قافلہ ۔۔۔ اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے
عشق جس کو ہے وہی انسان ہے ۔۔۔ ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے
یہ صدائے قیس تھی اور جذب شوق ۔۔۔ ناقۂ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے
تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں ۔۔۔ ولولے ہیں ابخرے سرسام کے
خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض ۔۔۔ کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اس غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا اپنا شعر ملا کر چار مصرعوں کا قطعہ بنایا تھا، خیر وہ بھی سنایا تھا:

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم ۔۔۔ رات کے دن کے نہ صبح و شام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا ۔۔۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ اے بھئی! چپ رہو، یوں کہو کہ:

ضعف نے غالب نکما کر دیا

یا

دھر نے غالب نکما کر دیا

عشق کیا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا - پھر ارشاد کیا کہ ریختی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو، خاص شعر ڈھالتے ہو[1]۔

اس کے علاوہ اس بات کی مثالیں ملتی ہیں کہ غالب داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا - لیکن جو داد غالب ناظم کو دیتا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے - خود غالب ہی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے، شاید تبصرے کی ضرورت ہی نہ پڑے :

''حضرت کا تو ان غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اوروں کے دیوان میں ایسا ایک شعر بھی نہ نکلے گا۔[2]''

(۵)

اس معاملے میں اختلاف رائے ہے کہ ناظم کے دیوان میں کتنے اشعار ایسے ہیں جو غالب کے عطیات ہیں اور کتنے ایسے ہین جنھیں غالب کی اصلاح نے کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ اگرچہ میں اس سلسلے میں قطعیت سے کسی نتیجے پر نہیں پہنچا لیکن احمد رضا صاحب[3] کے مضمون کے استدلال کے پیش نظر ابھی تک میرا موقف ہے کہ ناظم کا دیوان کسی نہ کسی شکل میں تمام کا تمام ہی غالب کا فیضان ہے - جب تک مزید تحقیق احمد رضا کے نظریات کا بطلان نہ کرے۔ اس وقت تک ان کے موقف کو صحیح سمجھنا چاہیے -

(٦)

غالب کے متعلق جو نئے مآخذ اور مصادر ہمارے سامنے آئے ہیں، اُن کے مطالعے کے بعد اور ان دلائل کے پیش نظر جو اوپر

۱- صفحہ ۳۲ تا ۳۴

۲- مکاتیب : ۱۷ (مکتوب ۱۰)

۳- ''دیوان ناظم عطیۂ غالب''، احمد رضا ، صحیفہ ۲۶، جنوری ۱۹۶۴ء -

درج کیے گئے ہیں، خلاصۂ مطالب کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ
غالب نے بڑے چاؤ چونچلوں میں پرورش پائی تھی۔ اس کے گھر
کی روایات جاگیردارانہ تھیں اور خود اس کی اپنی شخصیت بھی اس
جاگیردارانہ ماحول کے سانچے میں ڈھل گئی جو اسے ابتدائے کار
میں میسر آیا۔ اگرچہ آگرے کے چاؤ چونچلوں کے بعد دہلی میں
نسبتاً غالب کو وہ عافیت میسر نہ تھی، لیکن جب اس کی شادی
بھی ایک اونچے گھرانے میں ہوگئی تو اس کے دل میں اپنی
عالی نسبی اور عالی منصبی کا غرور جڑ پکڑ گیا۔ اوائل عمر ہی
میں اس نے ایک دیوان مرتب کر لیا جو نہ صرف اس کی طبیعت
کے جوہر پر دلالت کرتا تھا بلکہ اس بات کی شہادت دیتا تھا کہ
اس کی آواز اور اس کا لہجہ اپنے معاصروں سے بالکل مختلف ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ فارسی زبان و ادب اور متعلقہ شعری
روایات سے غالب کو پوری آگاہی تھی، ستم یہ ہوا کہ اسے
یہ گمان بھی ہوگیا کہ میں نہ صرف فارسی زبان کا انشا پرداز
اور ادیب ہوں بلکہ محقق بھی ہوں۔ یہ غرور عالی نسبی اور
عالی منصبی کے شعور کے ساتھ ملا تو غالب کی شخصیت اور انانیت
کے پہلو اور بھی ابھرنے شروع ہوئے۔ پنشن کے سلسلے میں جب
وہ کلکتے گیا اور وہ ہنگامہ برپا ہوا جو ''مثنوی باد مخالف'' کی
تحریر پر منتج ہوا تو غالب نے گویا کھلم کھلا اس بات کا
اظہار کیا کہ وہ ایرانی شناسان ہندی نژاد کو بالکل خاطر میں نہیں
لاتا، نہ ان کے کلام اور تحقیقات کو سند جانتا ہے۔ تبختر اور
غرور کا یہ شعور بھی بہت دیر تک قائم رہا، البتہ ہنگامۂ
''برہان قاطع'' کے بعد غالب پر روشن ہوا کہ ایسے لوگ بھی ہیں
جو اس کے علم و فضل کے تو سرے سے قائل ہی نہیں، اور اس کو
اعلیٰ درجے کا سخن طراز اور سحرساز بھی خیال نہیں کرتے۔

یہ بات غالب شروع سے سنتا آیا تھا لیکن اسے اپنے کلام پر اعتماد تھا اور یہ اعتماد بجا تھا ۔ یہ اعتماد تو قائم رہا البتہ غالب کے اس اعتماد کو بہت ٹھیس پہنچی کہ لوگ مجھے محقق اور شاعر بے ہمتا گردانتے اور جانتے ہیں ۔

پنشن کے سلسلے میں جب غالب کو ناکامیابی ہوئی اور ساتھ اس کے لیے ناممکن ہوگیا کہ وہ در حقیقت رئیسانہ آن بان کے رہ سکے تو وہ دنیا اور اہل دنیا کی طرف سے سخت بددل ہوا ۔ لیکن جیسا کہ میں ابھی واضح کرتا ہوں ، یہ بددلی مستقل نہ تھی ، اس نے بہت جلدی اپنی انانیت کی بنا پر دنیا اور حوادث عالم سے سمجھوتا کر لیا ۔ بے شک غالب کو اپنے کلام پر اور اپنے کلام کی خوبی اور تازگی پر عمر بھر اعتماد رہا لیکن وہ جو اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا کہ وہ ایک جاگیر دارانہ نظام کا جزو ہے اور معاشرے میں عام لوگوں کی سطح سے اس کا مقام کہیں بلند تر ہے، وہ اس وقت کاملاً مجروح ہوا جب قمار بازی کے جرم میں اس پر اسیری کا عذاب نازل ہوا ۔ غالب اگرچہ پرانے جاگیردارانہ نظام کا پروردہ تھا لیکن اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ مغلوں کا نظام در اصل زوال پزیر ہو چکا ہے اور اب جاہ و منصب در اصل وہی ہے جو انگریزوں کی طرف سے عطا ہو ۔ ابتلائے اسیری نے اس پر واضح کر دیا کہ ملک کی حکومت اور نظم و نسق کی باگ ڈور مغلوں کے ہاتھوں میں نہیں ، ہر معاملے میں کلیتاً انگریز حاکم ، مقتدر اور صاحب اختیار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اگرچہ مغل دربار سے خطابات حاصل کیے لیکن خواہاں ہمیشہ اس بات کا رہا کہ انگریزی دربار میں خصوصی عزت کا مقام حاصل ہو ۔ اس سلسلے میں اس نے معمولی انگریزی حکام کی خوشامد سے بھی دریغ نہیں کیا ۔ خود غالب نواب رام پور کو ایک خط میں یہ بتاتا ہے کہ مجھے انگریزوں

نے کتنی عزت عطا کی ہے۔ عرشی کہتا ہے[1] : ''در اصل ان کا حقیقی اعزاز یہ تھا کہ گورنر جنرل کے دربار میں داہنی صف میں دسویں کرسی اور سات پارچے مع جیغہ، سرپیچ و مالائے مروارید خلعت پاتے تھے۔ نواب فردوس مکانی کو بہ تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: 'میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔''

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ہنگامۂ ۵۷ء کے دنوں میں غالب نے گوشہ گیری اختیار کی۔ بقول عرشی اپنی محسن سرکار کا ساتھ دیتے تو باغی گھر بار لوٹ لے جاتے اور اہل قلعہ کی کھلم کھلا حمایت کرتے تو بہ صورت ناکامی انگریزوں کی طرف سے بدسلوکی کا خوف تھا[2]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب فراخ دل تھا، وسعت قلب و نظر رکھتا تھا، عالی حوصلہ تھا۔ حالی نے جو اس کی تعریف کی ہے وہ سب درست ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کمزوریاں تھیں اور غالبیات کے سلسلے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ یہ کمزوریاں بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی ہیں۔ ان کم زوریوں کے ذکر سے غالب کی تنقیص مقصود نہیں بلکہ یہ کہنا مطلوب ہے کہ غالب انسان تھا، فرشتہ نہ تھا اور یہ اس کی عظمت کا بین ثبوت ہے کہ ان کم زوریوں کے ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنے لیے ادبیات میں ایک بے نظیر مقام پیدا کیا۔ اور باوجود اس کے کہ عمر بھر اس کی آبرومندی اور خود اعتمادی کو مجروح کیا

۱- مکاتیب : ۴۹
۲- مکاتیب : ۴۹

جاتا رہا، اس کا دماغ متوازن رہا اور اس کے کلام میں وہ قنوطیت نہ پیدا ہوئی جو ہمیں میر کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اس مسئلے کی تفصیل آگے آتی ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ غالب اسی اعزاز کو اعزاز خیال کرتا تھا جو سرکار انگریزی کی طرف سے ملے۔ ہنگامہ ۵۷ء کے بعد جب سوائے قلیل پنشن کے معاش کے تمام وسائل مسدود ہوگئے تو غالب گویا بالکل سپرافگندہ ہوگیا۔ اس نے اپنی فعال تخلیقی قوتوں کو ''دیوان ناظم،، کی ترتیب میں صرف کیا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس زمانے میں بھی غالب کے ہاں فیضان سخن کا سلسلہ منقطع نہ ہوا تھا۔ ہنگامہ ۵۷ء کے بعد غالب کی تخلیقی قوتوں کا رنگ یا تو اس کی ان تخلیقات سے جھلکتا ہے جن کے متعلق طے ہے کہ ۵۷ء کے بعد وجود میں آئیں یا پھر دیوان ناظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے جس کی ترتیب میں اس نے اپنی تخلیقی قوت کی تابناکی کو قصداً مدھم کر دیا۔ اس زمانے میں البتہ، جیسا کہ نوابان رام پور کے نام خطوط سے معلوم ہوتا ہے، غالب کچھ تو ضعف پیری کے باعث اور کچھ مسلسل یورش آلام کے باعث اس قابل نہ رہا تھا کہ فرماں روایان رام پور کے سامنے اپنا سربلند رکھ سکتا اور ان سے اس لہجے میں بات کرسکتا جو غالب کے شایان شان تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ ایک معجزہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس کو عمر بھر اس کشمکش میں مبتلا رکھا گیا ہو کہ مزاج رئیسانہ ہو، ماحول امیرانہ ہو، اور ذرائع معاش قلیل ہوں، وہ اپنی پیش گوئی کے مطابق ادب میں ایک ایسا مقام جلیل پیدا کرے جس کی نظیر ڈھونڈے سے نہ مل سکے۔ یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ غالب کو مبداء فیاض سے جوہر تخلیقی عطا کیا گیا تھا لیکن اس نے کسب فن کے سلسلے میں واقعی ایرانی اساتذہ کے کلام کا اتنا اچھا اور گہرا مطالعہ کیا

کہ فارسی میں جس ایرانی شعری دبستان میں چاہے ، نہایت سہولت اور خوب‌صورتی سے شعر کہہ سکتا ہے۔ وحشت کلکتوی نے کیا خوب کہا ہے :

فروغ طبع خداداد گرچہ تھا وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب‌فن کے لیے

ایران کی شعری روایات سے غالب کی آگاھی کے شواھد میں آگے چل کر پیش کروں گا ، یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ غالب کو فارسی پر واقعاً یہ قدرت حاصل ہے کہ جس رنگ میں چاہے شعر کہے اور اس کے باوجود اپنی انفرادیت قائم رکھے اور ہر شعر پر گویا اپنی شخصیت کی چھاپ لگا دے۔

(۷)

اس مرحلے پر طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے یورش مصائب میں اور نا قدر شناسیٔ عالم میں دنیا سے کس طرح سمجھوتا کیا ؟ اس کا جواب عموماً یہ دیا جاتا ہے کہ غالب نے زندگی کے مصائب سے فرار کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ کثرت سے شراب پیتا تھا اور پھر دو تین شعر پڑھ کر سمجھ لیا جاتا ہے کہ معاملہ ختم ہوگیا ۔ یہ شعر خاص طور پر پڑھا جاتا ہے :

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جو لوگ اس شعر سے یہ استدلال کرتے ھیں کہ غالب نے شراب کی عطا کردہ بے خودی کے ذریعے زندگی کے مصائب سے راہ فرار اختیار کی ، وہ اردو اور فارسی کے ایسے اشعار سے کیوں قطع نظر کر لیتے ھیں جن میں شراب پینے کے اور منصب بتائے گئے ھیں (تفصیل آگے آتی ہے)۔

خاص طور پر یہ لوگ غالب کے اس شعر کی کیا توجیہ کریں گے :

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

اور اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ ''مثنوی ابر گوہر بار'' میں غالب نے شکایت کی ہے کہ شراب بھی ڈھنگ سے پینے کو نہیں ملی - بہر حال میرے خیال میں یہ بات بالکل غلط ہے کہ زندگی سے غالب نے یہ سمجھوتا کیا ہے کہ جب آلام کی یورش ہوتی ہے تو شراب کے دو جام پی کر دھت ہو جاتا ہے۔ یہ دعویٰ نہ تو خارجی شہادت سے ثابت ہوتا ہے اور نہ غالب کے اشعار (خمریات ان میں شامل ہیں) اس کی تائید کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ غالب کی خود اعتمادی اور انانیت کا یہ مقام تھا کہ اس نے مصائب حیات کے مقابلے میں اپنی ذہنی شکست کا کبھی اعتراف ہی نہیں کیا - یہاں تک کہ جو عام شعرا شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کا کوئی محرم راز نہیں اور وہ دنیا میں تنہا ہیں، غالب عموماً اس سے بھی گریز کرتا ہے - اسے اہل دنیا سے تنہائی کی شکایت بھی خلاف شان نظر آتی ہے گویا وہ ان کے بغیر رہ نہیں سکتا، گویا اہل دنیا کو محرم راز بنانا چاہتا ہے۔ حالی کہہ سکتا ہے :

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

لیکن غالب ایسا نہیں کہہ سکتا - اس کی انانیت اپنی تنہائی کو بھی ایک مقام خاص تصور کرتی ہے، جہاں صرف نابغہ کو رسائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے :

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصے کے لیے غالب پر وہ کیفیت طاری ہوئی ہے جسے ''مردم بیزاری'' کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کچھ شعر بھی کہے ہیں، مثلاً:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہیں رہی۔ غالب نے واقعی ایک جلیل القدر فن کار کی طرح اپنی تنہائی کو اپنا حق سمجھا، اس کی شکایت نہیں کی۔ دنیا کو اور اہل دنیا کی ریاکاری اور غداری کو معاف کر دیا اور ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں وہ بہ کمال خلوص کہہ سکتا تھا:

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
کیا کہا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

فن کار زندگی سے جس طرح سمجھوتا کرتا ہے اس کے متعلق شوپن ھار نے نہایت پر مغز باتیں کی ہیں۔ ڈیورانٹ نے[1] اس کے بنیادی افکار کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''لوگ اکثر سمجھتے ہیں کہ دولت کے حاصل ہونے سے سبھی کچھ حاصل ہو جاتا ہے لیکن یاد رہنا چاہیے کہ جو زندگی کسب زر میں گزرتی ہے، وہ اس وقت تک بے ثمر ہے جب تک وہ اپنی جمع کردہ دولت کو مسرت میں تبدیل نہ کر سکے۔ دولت کو مسرت

۱۔ داستان فلسفہ، انگریزی، نیویارک ۱۹۵۳، شوپن ھار، صفحات ۲۵۰ تا ۲۶۴۔

میں تبدیل کرنا ایک فن ہے اور جب تک انسان مہذب اور صاحب بصیرت نہ ہو، اس فن سے بے بہرہ رہتا ہے۔ جو لوگ محض دولت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، انہیں یہ کون بتائے کہ مسرت کا حصول اس پر منحصر نہیں کہ انسان کے پاس کیا ہے بلکہ اس سوال کے جواب پر ہے کہ انسان خود کیا ہے ......

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آخر کار ہر شخص کسی نہ کسی معنی میں دنیا میں تنہا ہی رہتا ہے۔ خارجی عوامل سے جو مسرت ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ اس مسرت سے کہیں کم ہے جو ہم اپنے باطن سے حاصل کرتے ہیں ....

دنیا کی ہر شے (کا ادراک و تعقل)، دنیا کا ہر واقعہ اور ہر کیفیت دراصل صرف انسان کے اپنے شعور میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری بات یہ ہے کہ انسان اپنے شعور کی ترکیب اور ساخت پر غور کرے۔ ارسطو نے سچ کہا ہے: خود مکتفی ہونا گویا خوش ہونا ہے ......

''جوہر قابل یا نابغہ بے ارادہ علم کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ زندگی کی ادنیٰ صورتوں میں ارادہ تو موجود ہوتا ہے لیکن علم کا فقدان ہوتا ہے۔ عام انسان علم کی کمی اور ارادے کی بہتات کا شکار ہوتے ہیں۔ جوہر قابل یا نابغہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ارادہ اپنی تمنائیں پوری کرنے کے لیے جتنا علم چاہتا ہے، جوہر قابل کے ہاں اس سے زیادہ علم موجود ہوتا ہے، اس کی استعداد علمی اور اس کا ملکۂ حصول علم دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ ارتقا یافتہ ہوتا ہے...... اگر عقل و خرد کو ارادے سے آزاد کر لیا جائے تو انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اشیا کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے۔ جوہر قابل یا نابغہ کے پاس ایک جام سحر آفریں (جام جم) ہوتا ہے۔ اس جام میں وہ تمام کوائف

جو معنی خیز ہیں، مرتب و مدون صورت میں جھلکتے اور چھلکتے نظر آتے ہیں اور اتنے واضح کہ کیا کہا جائے۔ ہر وہ چیز یا کیفیت جو اتفاقی یا بےثمر ہوتی ہے، اس جام سحر آفریں سے خارج کر دی جاتی ہے...... جلیل القدر فن کار، جوہر قابل یا نابغہ دنیا میں دکھ بھی اٹھاتا ہے لیکن دکھوں کی تلافی بھی ہوتی رہتی ہے۔ وہ اپنے باطن میں زندگی بسر کرتا ہے۔ عام لوگ جو کوائف خارج پر بھروسا کرتے ہیں دوسرے لوگوں سے میل جول کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف فن کار حسن کے مشاہدے سے اتنا متاثر ہوتا ہے اور اس حد تک شادان و فرحاں ہوتا ہے کہ زندگی کی تمام تکلیفیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ بے شک اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ جیسے صحرا میں تنہا رہ رہا ہے، لیکن اس احساس کے باوجود حسن اور فن کاری کے عظیم المرتبت شاہ پاروں کا مشاہدہ اسے دکھوں سے نجات دیتا ہے...... فطرت نبوغ یا قابلیت کا جوہر خاص صرف گنتی کے آدمیوں کو عطا کرتی ہے، اگر عام آدمیوں کو اس انعام سے بہرہ یاب کیا جائے تو دنیا کا کاروبار رک جائے گا.... یوں تو ہر فن میں طاقت ہے کہ اس کا مشاہدہ ہمیں زندگی کی بلند سطح پر لے جا سکے لیکن موسیقی میں یہ طاقت نسبتاً زیادہ ہے۔ دوسرے فنون پرچھائیوں کی باتیں کرتے ہیں لیکن موسیقی حقائق اشیاء کا شعور پیدا کرتی ہے اور بلا واسطہ ہمارے احساسات کو متاثر کرتی ہے۔ مصوری اور متعلقہ فنون میں جو مقام تناسب کو حاصل ہے، وہی موسیقی میں آہنگ کو حاصل ہے۔ گوئٹے نے کیا خوب کہا ہے کہ فن تعمیر کے شاہکار، منجمد موسیقی کے نمونے ہیں اور تناسب گویا موسیقی کا بے حرکت آہنگ ہے،،۔ شوپن ہار کے ان بیانات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ میں نے جو دعویٰ

کیا تھا کہ غالب کو تنہائی کا شعور اگر ہوا ہے تو اس نے اس کی شکایت عموماً نہیں کی ، اس کی توجیہ کیا ہے ۔ اس طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جوہر قابل یا نابغہ کا جو وصف خاص شوپن ہار نے بتایا ہے ، غالب اس سے متصف ہے ۔ میرے اپنے ذہن میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ غالب نے زندگی سے جو سمجھوتا کیا ہے اور یورش آلام سے نجات پائی ہے ، اس کی بنا ہر قسم کے حسن کے مشاہدے پر اور اس سے لطف اندوز ہونے پر ہے ۔ یہاں حسن کا کلمہ جمالیاتی معانی میں برتا گیا ہے ۔ جسمانی حسن بھی اس میں شامل ہے اور فن کا وہ حسن بھی جسے اصطلاح میں تناسب کہتے ہیں ۔ غالب نے حسن کو جس طرح ہر رنگ میں دیکھا اور سراہا ہے ، اس کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے یہ کہتا چلوں کہ جس فن میں غالب نے حسن دیکھا ہے وہ اس کی اپنی تخلیق ہے ۔ نرگس کی طرح وہ اپنے آپ پر عاشق ہے ۔ اس کی انانیت نے یہ کبھی گوارا ہی نہیں کیا کہ وہ اپنے مقابلے میں کسی اور فنکار کو کوئی مقام بخشے ۔ اس نے اپنے ہی فن کے حسن کا مشاہدہ کیا اور اسی میں مگن رہا ۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے آلام سے غالب کا سمجھوتا یہ ہے کہ وہ حسن کے ہر روپ کے مشاہدے میں منہمک ہے ، حسن کو ہر رنگ میں دیکھتا ہے ، ہر آہنگ میں پرکھتا ہے اور اس کی ہر ادا کا مشاہدہ غالب کے لیے اس دکھوں سے لب ریز دنیا سے نجات کا وسیلہ ہے ۔

پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ عالم جسمانیات میں غالب نے حسن کا مشاہدہ کس طرح کیا اور پھر اس پر غور کرنا چاہیے کہ معنویات اور ذوقیات کے دائرے میں اس کے مشاہدۂ حسن و جمال

کی کیا کیفیت ہے اور کیا مقام ہے ؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، غالب اپنے آپ میں اتنا گم ہے اور اپنی انانیت کی فصیلوں میں اس طرح محصور ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے نہ صرف یہ کہ اپنی تنہائی کا شکوہ کرنا فضول سمجھتا ہے ، بلکہ اسی تنہائی کو اپنے نفس کی ایک مخصوص کیفیت شمار کرتا ہے - اس کے باوجود خارج میں خالص خارجی دنیا میں حسن کے جو روپ پائے جاتے ہیں، ان پر بھی غالب کی نظر عقیدت مندانہ اور مستانہ انداز میں اٹھتی ہے - حسن صورت سے حسن معنی تک جمال کی سینکڑوں منزلیں ہیں اور غالب ہر منزل سے گزرا ہے۔ وہ کہتا ہے :

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

بہار کے متعلق اردو میں اس کا قطعہ کتنا خوب صورت اور دل پزیر ہے ،جس طرح اعلیٰ درجے کے موسیقار کے گانے میں ۔یوں معلوم ہے جیسے ایک سر دوسرے سر کا مشتاق ہے ، اسی طرح غالب کے اس قطعے میں معلوم ہوتا ہے گویا ایک شعر دوسرے شعر کا مشتاق ہے - سلسلۂ کلام کی یہ صورت ہے کہ قطعہ بند کی ساخت میں ایک شعر دوسرے سے یوں ابھرتا ہے جیسے شاخ سے پھول ابھرتا ہو :

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر روکش سطح چرخ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روے آب پر کائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے باد پیمائی

اسی طرح رات کی پر اسرار طلسمی کیفیت کا منظر جس طرح غالب کے آئینۂ تخیل میں عکس افگن ہوا ہے اور پھر جس طرح غالب نے جو کچھ محسوس کیا ہے، اسے قاری تک پہنچایا ہے، اس کی کیفیت دیدنی ہے:

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

بت کدے کی صبح کی تفصیل غالب کے فارسی کلام میں ملے گی، لیکن ابھی ذرا رات ہی کی کیفیت پھر ملاحظہ کیجیے:

(۱) ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

(۲) جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام

(۳) ماہ بن ماہتاب بن، میں کون[1]
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

---

۱ - طباطبائی لکھتا ہے: ''اس سارے قصیدے میں عموماً اور اس شعر میں خصوصاً مصنف نے اردو کی زبان اور حسن بیان کی عجب شان دکھائی ہے - ایک مصرعے میں تین جملے جس کے مضمون سے رشک ٹپک رہا ہے، دوسرا مصرعہ طنز سے بھرا ہوا ہے - چاروں جملوں میں حسن انشاء، پھر خوبی نظم و بے تکلفی ادا'' (شرح: ۲۹۹) - اسی قصیدے میں طباطبائی نے جو یقیناً غالب کی بے جا طرف داری کے ملزم نہیں گردانے جا سکتے اور نہایت کانٹے کی تول بات کرتے ہیں، یہ شعر نقل کیا ہے:

آتش و آب و باد و خاک نے لی وضع سوز و نم و رم و آرام

اور پھر لکھا ہے کہ دوسرے فقرے کی بندش سے زور قلم ٹپک رہا ہے اور مصنف کو الفاظ پر جو قدرت حاصل ہے، یہ مصرع اس کی تفصیل کر رہا ہے - (شرح: ۳۰۳) -

(۴) جب کہ چودہ منازل فلکی
کر چکے قطع تیری تیزی گام

(۵) تیرے پرتو سے ہوں فروغ پزیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

(۶) دیکھنا میرے ہاتھ میں لب ریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب صبح و شام کو ذرا باہم بھی دیکھ لیا جائے:

(۱) صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالم تاب کا منظر کھلا

(۲) خسرو انجم کہ آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

(۳) وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو راز مہ و اختر کھلا

(۴) ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

(۵) سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

(۶) صبح آیا جانب مشرق نظر
اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

(۷) تھی نظر بندی کیا جب رد سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا

(۸) لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جام زر کھلا

(۹) بزم سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا[۱]

غالب کے فارسی اشعار سے مثالیں ابھی پیش کرتا ہوں لیکن ایک بات یہاں عرض کر دینی چاہیے کہ اعلیٰ درجے کے فن کاروں کے کلام میں مناظر فطرت کا روپ سروپ مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے ۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ فن کار فطرت کے مناظر

۱- شعر نمبر ۴ پر طباطبائی کا تبصرہ اس بات کا مستحق ہے کہ عیناً نقل کیا جائے ۔

اکثر ان میں بے نور ہیں اور نورانی معلوم ہوتے ہیں۔ جو قد کے بڑے ہیں وہ چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ جو چھوٹے ہیں وہ بڑے معلوم ہوتے ہیں- متحرک ثابت دکھائی دیتے ہیں- جو ساکن ہیں وہ سیارہ معلوم ہوتے ہیں- مختلف رنگ ہیں اور اصل میں کچھ بھی نہیں ، ابھی طلوع نہیں ہوئے اور دکھائی دینے لگے اور غروب ہو چکے مگر پھر بھی نظر آ رہے ہیں- شرح ۳ ، ۴-" یہ تبصرہ اپنی جگہ پر ایک نادر چیز ہے لیکن جیمز جینز کی تصانیف سے لے کر آئن سٹائن کے ملفوظات تک اب جو تالیفات کا تانتا بندھا ہوا نظر آتا ہے ، ان کے سرسری مطالعے سے بھی ظاہر ہوگا کہ غالب کی پرواز تخیل کہاں پہنچی ہے اور اس کی قوت کشف نے کتنے اونچے دروازے کھٹکھٹائے ہیں- یہ کہنا کہ غالب کو ان نظریات کا علم نہ تھا ، بالکل غیر متعلق ہے ۔ شاعر کا مطلب وہی ہے جو قاری کو اپنے ذوق سلیم ، اپنی استعداد علمی، اپنے ماحول اور اپنے عصر کے تقاضوں کے مطابق سمجھ میں آتا ہے ۔ شاعر ، معانی کی ان تمام سطحوں سے آگاہ تھا جو اس کے کلام میں مخفی ہیں۔ یہ بات ادبی انتقاد میں قطعاً غیر متعلق ہے، یعنی Irrelevent ۔

کو دیکھ کر ایسا لطف و سرور حاصل کرے جو عام لوگوں کے
حصے میں بھی آتا ہے۔ لطف و سرور کا یہ احساس تخلیقی فن کار
اور عام آدمیوں میں مشترک ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ فن کار کے
تاثرات زیادہ شدید ہوتے ہیں اور وہ اپنی واردات کے اظہار پر
ہر طرح قادر ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فن کار کو
مناظر فطرت میں وہ تناسب نظر آتا ہے جو حسن کی صفت خاص ہے۔
یعنی جس طرح سڈول بدن کے قوس و خطوط، چہرے کے
نقش و نگار اور خد و خال متناسب، موزوں اور خوب صورت
معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح کوہساروں کے سلسلے کا غیر معین
تناسب، ابر و باد کی کرشمہ آفرینیاں، باغ و راغ اور دشت
و دمن کی دل نشینیاں بھی اسے متناسب اور حسین معلوم ہوں۔
اس صورت میں فن کار کروچے کے نظریے کے مطابق شاھد بن کر اپنے
جذبات کا اظہار تام کرتا ہے اور مناظر فطری کی مشہودات میں
جو حسن اور تناسب ہوتا ہے وہ نظر آنے لگتا ہے۔

مناظر فطرت کی ایسی تصویر کشی میں ان مناظر کا حسن
بنفسہ فن کار کے مشاھدے کی غایت ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں
یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مناظر فطرت کا حسن شاعر کی روح میں
رس بس گیا ہو۔
گویا فطرت خود ایک نازنین دل پزیر بن گئی ہے۔ اس معنی میں
حسن فطرت کی ادا شناسی بہت مشکل ہے۔ بے نظیر شاہ وارثی
اور میر حسن کبھی کبھی اس مقام تک پہنچتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ فن کار مناظر فطرت کو انسانی
جذبات و احساسات کی تصویر کا چوکھٹا بنا دیتا ہے۔ صبح و شام،
گل و گلزار، باغ و راغ اور بہار و خزاں کی حیثیت ایک طرح ثانوی

ہو جاتی ہے - فن کار کی مراد یہ ہوتی ہے کہ کسی جذبے کی یا
احساس کے کسی ایک سلسلے کی تصویر کشی کرے - مناظر فطرت
جذبے یا جذبے کے کسی پہلو سے مربوط ہو جاتے ہیں - جس
طرح مصوّری میں پس منظر سامنے کے منظر کے تناظر اور تناسب
کا اظہار کرتا ہے ، یا سامنے کے منظر سے توافق رکھتا ہے ، یا
اختلاف کو نمایاں کرتا ہے - اسی طرح شعر میں فطرت کا پس منظر یا
تو انسانی جذبات اور اعمال و افعال سے ہم آہنگ ہوتا ہے یا
قطعاً مختلف ہوتا ہے- دونوں صورتوں میں ، توافق ہو اختلاف،
تناظر کا شعور پیدا ہوتا ہے - مصوری میں توافق کی شکل یہ ہے
کہ فرض کر لیجیے مصور کو کسی دریا کے موڑ کا منظر پیش
کرنا ہے ؛ اس موڑ کی شکل قوسی ظاہر کرنے کے لیے اور دریا کے
دوسرے کوائف دکھانے کے لیے مصور پس منظر میں سبز و شاداب
درخت ، پھولوں کے پودے ، کھیت اور امڈے ہوئے بادل دکھا
سکتا ہے - یہ پس منظر سامنے کے منظر سے موافقت رکھتا ہے -
لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصور پہاڑوں کے دو مہیب
سلسلوں کے درمیان کسی گہری کھڈ میں دریا کا پانی چمکتا
ہوا یوں دکھاتا ہے ، جیسے چاندنی کی پری کالے کالے دیووں کے
درمیان گھر گئی ہو اور بے تابانہ مچل رہی ہو - یہاں پس منظر
یعنی پہاڑوں کے سلسلے اور ان کی سیاہ وحشت ناک تنہائیاں
منظر کے موافق نہیں بلکہ اس سے مختلف ہیں - اسی اختلاف کی
بنا پر منظر کے خطوط زیادہ اجاگر ہوتے ہیں - پس معلوم ہوا کہ
مصوری پس منظر سے کبھی تضاد کا کام لیتی ہے ، کبھی توافق
کا - مقصد دونوں صورتوں میں ایک ہوتا ہے ، یعنی منظر میں
زیادہ گہرائی پیدا کرنا -

مصوری کی طرح شاعری میں بھی مناظر فطرت یا تو اصل منظر

سے مطابقت رکھتے ہیں یا اس سے تضاد کا ربط رکھتے ہیں۔ بہر حال دونوں صورتوں میں مقصد یہی ہوتا ہے کہ جذبہ یا واقعہ جس کا بیان کرنا مطلوب ہے، اس کا تاثر زیادہ گہرا ہو جائے۔

غالب کے ہاں اکثر مناظر فطرت کا روپ سروپ دوسری اور تیسری صورت میں نظر آتا ہے۔

یہ بات بھی گوش گزار کر دینی چاہیے کہ غالب جس بہار کی تصویر کھینچتا ہے وہ، چاہے جغرافیائی اعتبار سے برصغیر ہند پاکستان سے متعلق ہو لیکن اس کی تمدنی اور ثقافتی روایات سب ایرانی ہیں۔ غالب اس بہار کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں بلبل واقعی گلاب پر جان دیتی ہے، یعنی ایران کی وہ خوبصورت بلبل جسے خود غالب قفس رنگ کہتا ہے۔ بلبل سے مراد برصغیر ہند پاکستان کی کلچڑی نہیں جس کا کوئی تعلق بلبل سے نہیں ہے اور جس کے متعلق کوئی روایات ناز و نیاز بھی کارفرما نہیں ہیں۔ جب تک ایرانی ادب ہماری ثقافت کا پس منظر رہا، اس وقت تک شعرا اس نکتے سے آگاہ رہے کہ ایران کی بلبل اور چیز ہے اور ہندوستان کی بلبل جسے کلچڑی کہتے ہیں، اور چیز ہے۔ جب فارسی ادبیات کا مطالعہ پڑھے لکھے ہونے کی ضروری شرط نہ رہا تو شعرا بھی یہ بات بھول گئے۔ سودا کہتا ہے:

خدا کی شان تو دیکھو کہ کلچڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

چڑیل کی تو ہو شکل اور دماغ پریوں کا

سودا سے لے کے غالب تک جو مدت گزری ہے، بہت طویل نہیں لیکن اس کے باوصف اس اعتبار سے معنی خیز ہے کہ غالب

جیسا نکته دان فن کار بھی ایرانی ادب کی شعری روایات کے سلسلے میں کبھی ٹھوکر کھا جاتا ھے جیسا که ابھی ظاھر ھوتا ھے ۔ تو واضح رھے که غالب کے ھاں مناظر فطرت کی تصویر کشی یوں بھی پائی جاتی ھے که معلوم ھوتا ھے فطرت اپنی تمام رعنائی اور برنائی لے کر غالب کے دل میں سما گئی ھے، اور یه صورت بھی نظر آتی ھے که واردات و جذبات کے ابلاغ و اظہار میں مناظر فطرت ایسی چابک دستی سے پس منظر کا کام دیتے ھیں که سامنے کا منظر اور روشن ، خوبصورت اور صورت پزیر ھو جاتا ھے ۔ ان باتوں کو مد نظر رکھ کر پہلے غالب کے فارسی کلام میں طلوع صبح کا منظر دیکھیے ؛ ایک تو ان اشعار کے وزن کی صورت ایسی ھے جسے عام بول چال میں چلنت کہا جاتا ھے ۔ موسیقی کی اصطلاح میں یوں کہه لیجیے که شروع ھی سے ان اشعار کی لے تیز سنائی دیتی ھے ، اور جس طرح صبح کے راگوں میں یه وصف خاص ھوتا ھے که وہ سونے والوں کو بیدار کرتے ھوئے معلوم ھوتے ھیں ، اسی طرح ان اشعار کے الفاظ اور ان کی ترتیب میں یه وصف خاص ھے که صبح کے ھنگامے اور حرکت کا بڑی شدت سے احساس ھوتا ھے ۔ ثقافتی پس منظر ایرانی ھے ، متعلقه روایات ایرانی ھیں ، لیکن اس کے باوجود یه معلوم ھوتا ھے که برصغیر پاک ھندوستان کی صبح کا ذکر ھے :

صبحی که در ھوائے پرستاریٔ وثن[1]

جنبد کلید بت کده در دست برھمن[2]

در رفت و روب دیر دم گرم راھبان

آرد برون گداخته شمع از لگن

---

۱ - بفتحتین و سکون نون (عربی) بت، اوثان جمع ۔
۲ - برھمن مت کا پیرو جو اس بات کا دعویٰ کرتا ھے که مسلک برھمنی
(بقیه حاشیه اگلے صفحے پر)

خیزند دسته مغان[1] نه شسته روی
در اهتمام چیدن برسم[2] ز ناروں

(بقیه حاشیه صفحه گزشته -)
میں انسان کی کوششوں کی غایت یہ ہوتی ہے کہ روح پرماتما تک پہنچ جائے - برمھ اس حقیقت مطلقه کا نام ہے جو ہر چیز سے ماورا ہے - برہمن بہ ظن خود اسی کی طرف انسان کو لے جانا چاہتا ہے - اس کے مسلک میں بت ایک علامت ہے جس کے ذریعے انسان حضور یار میں پہنچتا ہے - صوفیوں کا وجد اور ارباب نظر کا حسن مجاز بھی حقیقت مطلقه تک پہنچنے کی کوشش میں معاون ہوتا ہے - ویدوں کی حقیقت مطلقه یعنی برمھ کے تصور سے زرتشت کا آھورا مزدا مشابہ ضرور ہے لیکن ایک خاص حد تک - اسی مشابہت کی بنا پر غالب نے فوراً گروہ مغاں کا ذکر کیا ہے -

۱ - ظاہر ہے کہ مغ کی جمع ہے - اس کی اصل مگھو ہے - یہی کلمہ مغ اور موگھو - چنانچہ مغ بد اور موبد مغوں کے سردار کو کہتے ہیں - مغ سے جو روایات وابستہ ہیں ، ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے مزدیسنا ۲۷۸ تا ۲۸۲ -

۲ - یہ کلمہ اوستا میں بھی موجود ہے - اس کا مادہ برز ہے جس کے معنی ہیں بڑھنا اور پنپنا - برسم جماعت مغاں کی اصطلاح میں درخت کی شاخوں کو کہتے ہیں - ان کے ہاں دستور ہے کہ درخت ہوم سے یا انار کے درخت سے ایک خاص چھری سے باریک بے گرہ شاخیں کاٹتے ہیں - اس چھری کو آب پاکیزہ سے دھویا جاتا ہے اور جب شاخیں کاٹی جاتی ہیں تو دعائیں پڑھی جاتی ہیں جنھیں اصطلاح میں زمزم یا زمزمہ کہتے ہیں - ان شاخوں کو برسم دان میں رکھ دیا جاتا ہے لیکن پہلے پاک کیا جاتا ہے اور دعائیں پڑھی جاتی ہیں - یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انار کے درخت کی تخصیص کیوں ہے لیکن معین نے یہ بات وضاحت سے لکھ دی ہے کہ برسم پر جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں ، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو نعمتیں عالم نباتات سے انسان حاصل کرتا ہے ، ان کا شکریہ ادا کیا جائے - مزدیسنا : ۲۵۸ تا ۲۶۴

از شور دیریاں بگماں و خروش صور
اموات را ز رقص بتن بر درد کفن

رخشد ستاره از رخ ناشستهٔ صنم
بالد بنفشه از قد خم گشتهٔ ثمن

بر روے خاک جلوه کند سایه در نظر
بر بوے دوست حلقه زند مرغ درچمن

خواهد چراغ کشته چو شخص بریده سر
خیزد گل شگفته چو رنجور خسته تن

بر جام مل زدیدهٔ شبنم چکد نگاه
بر روئے گل ز طرهٔ سنبل دود شکن

غوغاے روز پرده کشاید ز خوب و زشت
آوائے کوس خواب رباید زمرد و زن

برخیزم و شرارهٔ آذر[۱] بهر دو کف
روبم ز رخت خواب و فشانم ز پیرهن

۱- آتش اور ایران قدیم میں جو فرشته آتش کی نگهبانی کرتا تها وه بهی آذر کهلا تا تها اور ایزدوں میں بهت ممتاز شمار کیا جاتا تها ۔ سال میں نویں مهینے کی نگهبانی اور پرداخت اور هر مهینے میں نویں دن کی نگهبانی اور پرداخت اسی ایزد کے سپرد هے ۔ برهان : ۲۲ ۔

بر بوے طرۂ کہ شبم بر مشام خورد
بر رہ گذار باد بدم در کشم ختن[1]

از ذوق مژدۂ کہ نگارم بخواب داد
در انبساط وجد بہم برزنم چمن

گرداب خانہ زاد محیط ست لاجرم
گردم بذوق دوست ھماں گرد خویشتن

چوں برگ گل ز باد سحرگاھیم زبان
رقصد بنام حیدر کرار در دھن

اس تصویر کشی میں صبح کی حرکت اور ھنگامے کی تصویر کشی ھی ملحوظ تھی۔ یہ صبح میں نے آپ کو قصیدے سے دکھائی اور اس لیے غزل کی صبح سے کچھ مختلف ضرور ھوگی؛ اب میں غزل کی صبح دکھاتا ھوں۔ یہاں مناظر فطری کی تصویر کشی کی تیسری صورت نظر آتی ھے، یعنی مناظر فطری تصویر کے پس منظر کا کام دے رھے ھیں۔ ادراک اور تعقل میں جذبہ سمویا ھوا ھے۔ حرکت اور ھنگامہ اس صبح کے نقش و نگار میں بھی پایا جاتا ھے، لیکن موسیقی کی اصطلاح میں یہاں کومل یا دھیمے سر زیادہ لگے ھیں؛ لے بھی تیز نہیں معلوم ھوتی۔ کہیں کہیں تیور سر یا چڑھا ھوا سر لگتا ھے تو بہت خوبصورت معلوم ھوتا ھے۔ علاوہ ازیں آخری دو اشعار میں 'مخسپ' نے ایک علامتی

۱۔ خراسان کی وہ سڑک جو زامین سے دو شاخوں میں تقسیم ھو جاتی تھی، چین کی طرف جاتے ھوئے اس کا آخری پڑاؤ برسخان بالا مشہور تھا۔ یہی ختن ھے اور روایت میں کبھی اس سے چین، کبھی وسط ایشیا کا کوئی علاقہ مراد ھوتا ھے اور شعری روایت میں عموماً مشک و محبوب سے منسوب ھے۔ جغرافیہ: ۵۸۷۔

معنویت اختیار کر لی ہے اور نیند گویا غفلت اور زبوں کاری کے معنی کو محیط ہو گئی ہے :

سحر دمیدہ[1] و گل در دمیدنست مخسپ
جہاں جہاں گل نظارہ چیدنست مخسپ

مشام را بہ شمیم گلے نوازش کن
نسیم غالیہ[2] سا در وزیدنست مخسپ

زخویش حسن طلب بین و در صبوحی کوش
مئے شبانہ ز لب در چکیدنست مخسپ

ستارۂ[3] سحری مژدہ سنج دیداریست
ببیں کہ چشم فلک در پریدنست مخسپ

---

۱ - عالم مجاز میں غالب کی فن کاری بے نظیر ہوتی ہے ۔ اس شعر میں صبح اور پھول میں دمیدن کا فعل مشترک قرار دیا گیا ہے ۔ صبح یوں روشن ہے جیسے پھول بہار کی مشعل بن کر جل رہا ہو۔

۲ - باد نرم : ہلکی ہلکی ہوا ۔ ٹیک چند لکھتا ہے کہ خوش نشین اور آشنا اس کی صفات ہیں ۔ یہ بیان بہت معنی خیز ہے کہ اگر غالیہ کی خوشبو تیز ہو جائے تو نفاست طبع کو ناگوار گزرے گی۔ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ ہوا کی عطر بیزی کا موجب کیا ہے ۔گیسوے یار یا خوشبوے بدن اور اس ابہام میں عجیب لطف ہے ۔

۳ - جیسا کہ روشن ہے، یہ ستارہ زہرہ ہے ۔ انگریزی venus ، فارسی ناہید ۔ ناہید کے لغوی معنی بے عیب کے ہیں۔ آریائی زبانوں میں ستارۂ سحری جس دیوی سے منسوب ہے ، اس کا تعلق ایک طرف ہاروت ماروت کی روایت سے ہے اور دوسری طرف افرودیتی کی عشوہ‌کاریوں اور دل ربائیوں سے ۔ اس ترکیب کے استعمال سے خیالات کا جو سلسلہ پیدا ہوتا ہے ، وہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب ستارۂ سحری کے ساتھ ہمیں پریدن چشم فلک کا منظر بھی دکھاتا ہے ۔

نشاط[۱] گوش بر آواز قلقلست بیا
پیاله چشم براہ کشیدنست مخسپ

نشان[۲] زندگیٔ دل دویدنست مایست
جلائے آئنهٔ چشم دیدنست مخسپ

ز دیده[۳] سود حریفاں کشودنست مبند
ز دل مراد عزیزاں تپیدنست مخسپ

---

۱ - اس شعر میں چڑھے ہوئے سر زیادہ لگائے گئے ہیں - خاص طور پر حرف ش کی تکرار پر غور کیجیے ، جس کی تندی اور تیزی محتاج اثبات نہیں ؛ نشاط ، گوش ، چشم ، کشیدن - اسی طرح پ اور ق کی تکرار - دوسرے مصرعے میں شعر جس سر سے شروع ہوتا ہے اسی سر پہ ختم ہوتا ہے - جیسے بعض صورتوں میں راگ کی تان ہوتی ہے - پہلے مصرعے میں قلقل کی صوت خود بتاتی ہے کہ اس لفظ کا مطلب کیا ہے -

۲ - عالم مجاز میں غالب کی فن کاری پر پھر غور کیجیے ؛ پہلے آنکھ میں اور آئینے میں مشابہت ڈھونڈی ، اس کے بعد اس آئینے کی جلاکاری کی ترکیب بتلائی کہ وہ دیدن ہے ، یعنی مشاہدہ ، معائنہ - اگر آنکھ یہی کام نہ کرے تو کس کام کی - یہی وجہ ہے کہ آنکھ کو اپنے منصب کے اعتبار سے دید بھی کہتے ہیں یعنی دیدہ - رومی کہتا ہے :

آدمی دیدست باقی پوست است — دید آں باشد کہ دید دوست است
جملہ تن را در گداز اندر نظر — در نظر رو در نظر رو در نظر

پہلے مصرعے میں دل کی زندگی کا نشان یہی بتایا کہ وہ حرکت میں رہے - اور اس اعتبار سے خطاب کا انداز کتنا خوبصورت ہے کہ مایست یعنی رک نہ جا ، کھڑا نہ رہ - دل رک گیا تو پھر زندگی کہاں ، اور جو معانی مجازی ہیں ان میں اس تنبیہ نے کہ رکنا مناسب نہیں ، کیسی اہمیت پیدا کی ہے -

۳- یہ مصرع شعر ماسبق کے دوسرے مصرعے کی ایک نئی صورت ہے اور میں نے بہت سوچا ہے کہ ان دو شعروں کی یہ صورت بہتر ہے یا نہیں -

نشان زندگیٔ دل دویدنست مایست — ز دل مراد عزیزاں تپیدنست مخسپ
ز دیده سود حریفاں کشودنست مبند — جلائے آئنهٔ چشم دیدنست مخسپ

[1] بذکر مرگ شبی زنده داشتن ذوقیست
گرت فسانهٔ غالب شنیدنست مخسپ

فطری مناظر کو غالب کس طرح جذبے سے مربوط کر دیتا ہے اور اس ارتباط میں کس طرح توافق اور اختلاف کی کیفیتیں دکھاتا ہے ، اس کی مثالیں اردو دیوان میں بھی موجود ہیں ۔ مثلاً :

مجھے اب دیکھ کر ابرشفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

یہاں منظر اور پس منظر میں توافق نہیں ہے بلکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، تضاد ہے ۔ اس کے برخلاف اس فارسی شعر میں منظر فطرت اور جذبے میں ارتباط کا تعلق ہے ۔ صورت یہ ہے کہ غالب نے شام کے وقت باغ کا منظر دیکھا ہے ۔ دھندلایا ہوا ، کجلایا ہوا ؛ سرو کے درختوں کی قطار دور تک چلی گئی ہے ۔ ایکا ایکی چاند طلوع ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تمام باغ میں رنگ اور نور کا سیلاب امڈ آیا ہو ۔ اس موقع پر غالب کہتا ہے :

مه به باغ از افق سرو شبے کرد طلوع
سرو گفتند بداں ماه سراپا ماند

---

۱ - پھر عالم مجاز و بدیع میں غالب کی فن کاری پر غور کیجیے ۔ شب زندہ داشتن سے فوراً شب زندہ دار کا خیال آتا ہے اور ذکر کا کلمہ خیال کو مزید شہ دیتا ہے ۔ ساتھ ہی مرگ اور زندہ کے تضاد پر بھی غور کر لیجیے ۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

میں نے کہا تھا کہ غالب مناظر فطرت کے بیان میں ایرانی روایات ملحوظ رکھتا ہے ۔ اس کی نہایت خوبصورت شہادت منقبت کے اس قصیدے سے مل سکے گی جس کا مطلع ہے :

ابر اشک بار و ما خجل از نا گریستن
دارد تفاوت آب شدن تا گریستن[1]

اسی قصیدے میں سے جستہ جستہ شعر سنیے :

از رشک شمع سوختم اندازہ دان کسیست
خوش جمع کردہ سوختنی با گریستن[2]

اندوہ و خوشدلی نہ شناسیم کار ماست
یا خندہ بر سحاب زدن یا گریستن[3]

(باقی حاشیہ گزشتہ صفحے کا)

فسانۂ غالب کے بعد فوراً کلمۂ شنیدن کا استعمال اور ساتھ ہی مخسپ پڑھنے والے کو گویا چونکا دیتا ہے کہ کومل سریں لگ رہی تھیں ۔ یعنی گرت فسانۂ غالب ، ناگہاں شنیدنست مخسپ کہنے سے لے بھی تیز ہو گئی اور چڑھے ہوئے سروں کے استعمال کا بھی شعور ہوا ۔ کلمہ 'فسانہ' کے معانی کی داستان دراز ہے ۔ بہ‌اجمال ایک اور مقام پر اس کا ذکر آتا ہے ۔

۱ ۔ 'آب شدند' یعنی پانی پانی ہو جانا ۔ دیکھیے بادل بھی پانی پانی ہوا جاتا ہے اور ہم بھی ، لیکن ہمارا پانی پانی ہونا شرم سے ہے ۔ کلمۂ تا کس خوبی سے استعمال ہوا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ غالب ایرانی زبان سے خوب آگاہ ہے ۔

۲ ۔ اس شعر میں کلمہ 'خوش' نہایت بلیغ استعمال ہوا ہے ۔ یعنی کیا خوب ! کس سلیقے سے شمع نے جلنا اور رونا جمع کر لیا ہے ؛ کیوں نہ ہو اندازہ دان محبت ہے ، محرم اسرار عشق ہے ۔

۳ ۔ اس شعر میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ہنسنا خوش دلی کی دلیل نہیں ۔ چنانچہ 'خندہ بر سحاب زدن' میں اگرچہ ہنسنے کا جزو شامل ہے لیکن نشاط کا عنصر موجود نہیں ۔

مسکیں نہ دیدۂ ز مغان شیوہ با نواں
در خواب گہ بہمن و دارا گریستن ۱

گاہے بداغ شاہد و ساقی گداختن
گاہے بہ مرگ مامک و بابا گریستن

یہی وہ قصیدہ ہے جس کی اہل زبان نے بھی تعریف کی تھی ۔ اس قصیدے میں اسلوب سخن اور بات کا رنگ ڈھنگ ، مضمون کی چلت پھرت بالکل ایرانی ہے ۔ عرفی کی غزل ضرور یاد آتی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ایران قدیم یاد آتا ہے ۔ ترکیب 'مغاں شیوہ بانواں'، ایسی بلیغ واقع ہوئی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی ۔ بہمن و دارا سطوت و عظمت کے نشان ہیں اور خواب گہ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انھوں نے وفات پائی، یعنی خواب گہ ابدی ۔

میں کہہ چکا ہوں کہ مناظر فطرت کے بیان کی ایک یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ معلوم ہو فطرت فن‌کار کی روح میں رس بس گئی ہے اور فن کار بغیر کسی اور آمیزش اور آرائش کے محض حسن فطرت سے لذت اندوز اور مسرت آموز ہو رہا ہے ۔ ایسے شعر مشرق کی زبانوں میں بہت کم ہیں جو حسن فطرت کی ایسی پرستش پر مشتمل ہوں ۔ میرحسن کے ہاں بھی آخر کار

۱۔ 'مغاں' پر نوٹ پہلے آ چکا ہے ۔ 'مغاں شیوہ' کی ترکیب بلیغ اور معنی آفرین ہے ۔ اس کے معانی شیریں حرکات اور کرشمہ سنج اور سحر ساز ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغ عربی میں مجوس بنتا ہے اور یہی مغ انگریزی زبان میں کلمہ magic کا مادہ ہے ۔ مغ کو انگریزی میں magian کہتے ہیں اور اس کی جمع magi آتی ہے ۔ دیکھیے شپلے کی "تاریخ مآخذ الفاظ" نیو یارک فلا سافیکل لائبریری ۔

فطری مناظر کسی جشن کا ، کسی بزم کا ، کسی رقص کے منظر کا پس منظر بن جاتے ہیں - ایسے شعر شاذ و نادر نظر آتے ہیں کہ فن کار نے فطرت ہی کو شاھد و نگار کا مرتبہ دے دیا ہو ۔ غالب کے ان شعروں میں مناظر فطرت کے حسن سے فن کار کو جو علاقہ ہے وہ بڑی خوبی سے ظاہر ہوتا ہے :

عالم آئنۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب[۱]

گر بہ‌معنی نہ رسی جلوۂ‌صورت‌چہ کم است
خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب[۲]

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب[۳]

ان تمام اشعار سے زیادہ بلیغ غالب کا ایک شعر ہے جسے میں کئی دیوانوں پر بھاری سمجھتا ہوں ۔ زمین ہے 'پردہ دار برد'

---

۱ - اس سلسلے میں غالب نے وحدت وجود پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ملحوظ خاطر رہے ۔

۲ - اردو میں آپ پڑھ چکے ہیں:
نہیں گر سرو برگ ادراک معنی   تماشائے نیرنگ صورت سلامت
یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ کسی محبوبہ کی تخصیص نہیں ، طرف کلاہ جس کی بھی جواہر نگار ہو ، خوب ہے اور خم زلف جس کا بھی سواد ناز ہو ، مرغوب ہے ۔ اس کی تفصیل بھی آگے آتی ہے ۔

۳ - یہاں غالب زیادہ کھل گیا ہے کہ فطرت اپنی ہر ادا میں حسین ہے ، اردو میں یہی مضمون کم تر سطح سے کہا گیا ہے :
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شبِ ماہتاب میں

آشکار برد،، پہلے ایک شعر محبوب کی خوش ادائی کے متعلق ہے
اور پھر پھول کی تعریف ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ گلاب کا
پھول مراد ہو:

تا خود به پرده ره ندهد کام جوی را
در پرده رخ نمود و دل از پرده دار برد[1]

گل چہره بر فروخت بدانساں که بارها
پروانه را هوس بسر شاخسار برد[2]

دوسرے شعر میں جس کا نقل کرنا در اصل مطلوب تھا،
غالب نے فطرت کی حسن شناسی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کے
متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

''خوش تقریر بدرجه ایست که به تحریر نمی گنجد،،

اس بلاغت کا کیا ٹھکانا ہے کہ 'گل شگفته، اس طرح فروزاں
ہے جیسے باغ میں شمع جل رہی ہو۔ یہ وهی غالب ہے جو
اردو میں لکھتا ہے:

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

۱- یہ وحدت وجود کا شعر ہے اور مجاز سے اس کا تعلق واجبی ہے۔
۲- کلمہ 'بارہا' ظاہر کرتا ہے کہ یہ بات پیوستہ ہوتی آئی ہے کہ پھول
مشعل کی طرح جلا ہے اور پروانے نے همیشه دھوکا کھایا ہے۔
هوس صرف بمعنیٔ تمنا ہے — شاخ سار: جہاں شاخیں کثرت سے ایک
دوسرے میں الجھی ہوئی ہوں اور سر شاخ بھی۔

اس سلسلے میں خاتمۂ کلام کے طور پر میں قصائد میں سے ایک بہاریہ تشبیب کے کچھ شعر نقل کرتا ہوں ۔ اس میں مناظر کی جو تصویر کشی دکھائی دیتی ہے ، اس کی صورت وہی ہے جو مصوری میں Landscape کی ۔ ان اشعار میں بھی منظر کو اجاگر کرنے کے لیے کبھی پس منظر سے توافق کا اور کبھی تضاد کا کام لیا جاتا ہے ۔ میں نے کہا تھا کہ غالب جیسا ایران شناس بھی بعض دفعہ ٹھوکر کھاتا ہے ۔ اس قصیدے میں اس سے ایک لغزش ہوئی ہے جس کا ذکر حواشی میں ملے گا ۔

ان اشعار میں بہار باغ کی جو صورت گری کی گئی ہے اس میں حرکت کم ہے ، سکون زیادہ ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پھول ، شاخیں ، درخت کسی طلسمی اثر سے مبہوت اور ساکت ہو گئے ہوں ۔ ہوا کی سرسراہٹ کا احساس نہیں ہوتا ۔ پرندے بھی جو چہچہا رہے ہیں تو به رسم مغاں زیر لب گنگنا رہے ہیں ۔ بلا شبہ یہ تصویر کشی جامد یا Static ہے ۔ لیکن اس میں بھی ایک خاص قسم کا حسن ہے ۔ اور یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ غالب کے ہاں بہاریہ تشبیب رسمی نہیں ہوتی ۔ ایرانی روایات اور ایرانی ثقافت کے تلازمات برابر قائم ہیں :

باز به اطراف باغ آتش گل در گرفت
مرغ به رسم مغاں زمزمه از سر گرفت[1]

---

۱ - زمزمه : واضح رہے کہ فارسی میں زم کے معنی ہیں آہسته اور زمزم منطقی طور پر آہسته آہسته کے معنی دیتا ہے ؛ اصطلاح میں ان کلمات کو کہتے ہیں جو جماعت مغاں آتش پرستی کے وقت ، نہاتے اور کھاتے وقت اور عبادت کے وقت ادا کرتی ہے ۔ اسی سے زمزمه ہے ، پڑھنا اور زیر لب ترنم (مزدیسنا : ۲۰۴) ۔ مزید تفصیلات کے لیے لغت فرس ، فرہنگ آنند راج ، اور بہار سے رجوع کرنا چاہیے ۔ معین نے بھی ۲۰۷ تک اس کلمے سے به تفصیل بحث کی ہے ۔

سبزہ بر اندام خاک حلّہ ز مخمل برید
مہر بہ دیدار باغ آئنہ در زر گرفت[1]

دشت بہ پرکار باد طرح صنم خانہ ریخت
باد بر اطراف دشت صنعت آزر گرفت[2]

سرو بہ بالاے سرو طرہ ز سنبل فگند
گل بہ تماشاے گل دیدہ ز عبہر گرفت[3]

قامت رعناے سرو پردۂ گلبن درید
عارض زیبائے گل دل ز صنوبر گرفت

گرچہ گل از ہر زمیں تخت گہے برگزید
لیک بسر سنگیش سبزہ سراسر گرفت

---

۱ - آئینۂ در زر یعنی آئینۂ زریں اور وہ آئینہ جس پر سنہرا کام ہو، مراد آفتاب -

۲ - اس شعر میں تین کلمات توجہ کے محتاج ہیں: طرح، صنعت، آزر - طرح بڑا وسیع المعانی لفظ ہے - نقاشی اس کے معنی میں شامل ہے، یہ صاحب فرہنگ آنندراج کا قول ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طرح مکان کے پہلے نقشے کو بھی کہتے ہیں اور مصوری کی اصطلاح میں وہ پہلا خاکہ ہے جس کی تکمیل اور رنگ آمیزی مطلوب ہے - اس مصرعے میں دو معانی کی جھلک دیتا ہے؛ ایک تو یہ کہ صنم خانے کا نقشہ قائم کیا اور دوسرے یہ کہ صنم خانے کی بنیاد رکھ دی - طرح انداختن بنیاد رکھنا - میرے خیال میں پرکار کے ہوتے ہوئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ پہلا مطلب ملحوظ ہو - اگر یہ صورت ہو تو ایہام تناسب کی سی شکل پیدا ہوگی - صاحب برہان قاطع اس کلمے کو نہیں پہچانتے - دیکھیے آنند راج — صنعت کا مادہ ص - ن - ع ہے، اسی سے صانع، مصنوع، تصنع اور صنعت برآمد ہوتے ہیں - یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ انگریزی میں بھی صنعت کے مقابلے میں جو لفظ آرٹ ہے، اس سے دو

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

بات یہ ہو رہی تھی کہ غالب نے زندگی سے جو سمجھوتا کیا ہے ، اس کے جزو اعظم دو ہیں ؛ ایک حسن کی پرستش اور دوسرے فن کی پرستاری - فن بھی در اصل عالم معنویات میں حسن ہی کی ایک صورت ہے - ہم دیکھ چکے ہیں کہ عالم جسمانیات میں غالب نے مناظر فطرت سے کس طرح اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے - اب یہ دیکھنا چاہیے کہ حسن جسمانی سے غالب کی شیفتگی کی کیا کیفیت ہے - اس سلسلے میں دو باتیں جو بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، صراحت سے کہہ دینی چاہئیں - یہ بات واضح ہے کہ غالب نے ایک جیتی جاگتی عورت سے عشق کیا ہے - اس عورت کا ذکر غالب کے خطوط میں ملتا ہے اور غالباً اسی کا مرثیہ اردو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵)

کلمات برآمد ہوتے ہیں : Artistry یعنی صنعت اور Artificiality یعنی تصنع - اب صانع خدا سے منسوب ہے اور فن کار کے لیے کلمہ صنّاع استعمال ہوتا ہے - صنعت فن کاری کی صحیح روش ہے اور تصنع صنعت کے مقابلے میں فن کاری کی بگڑی ہوئی صورت— تیسرا کلمہ آزر ہے ، بہ فتح ثالث بر وزن مادر - بعض لغات میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا اور بعض میں ان کے چچا کا نام بتایا جاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک میں ($\frac{6}{74}$ الانعام) حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر بتایا گیا ہے - پرانے صحائف میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح یا تارخ بتایا جاتا ہے ، مشہور بت تراش اور صنم گر ہے ، آزر سے اشتباہ نہ ہونا چاہیے - دیکھیے برہان : ۳۶-

۳ - واضح رہے کہ نرگس کی دو قسمیں ہیں : ایک شہلا کہ پھول کے وسط میں سیاہ داغ ہوتا ہے ، اسی کو آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں اور دوسرے عبہر جس کا پھول زرد ہوتا ہے اور یہ عام نظر آتی ہے - ظاہر ہے کہ یہاں غالب کو شہلا کہنا چاہیے تھا - سعدی :

سر بالین عدم باز نہ اے نرگس مست
کہ ز خواب سحر آں نرگس شہلا برخاست

دیوان میں موجود ہے - لیکن اس کے باوجود غالب کی اصل وابستگی ، فریفتگی اور شیفتگی حسن سے متعلق ہے ، کسی مخصوص حسین سے نہیں - حسن ہر رنگ میں ہر روپ میں غالب کو کیف و سرور کی وہ دولت بخشتا ہے جو اسے یورش آلام سے نجات دیتی ہے - حسن جسمانی کے جو پیکر اردو اور فارسی کلام میں نظر آتے ہیں ، وہ دو قسم کے ہیں- ایک تو وہ ہے جسے ہم حسن مطلق کہتے ہیں- حسن مطلق سے منسوب جو محبوبہ غالب کے کلام میں نظر آتی ہے وہ بے حرکت ، جامد اور ساکت ہے - وہ پتھر کا ایک بت ہے جو نہ التفات کرتا ہے نہ غالب کے التفات کی پروا کرتا ہے - اس کے مقابلے میں حسن کا دل پسند نمونہ یا پیکر ایک جیتی جاگتی شوخ و شنگ عورت سے عشق ہے جسے اپنے روپ کی نفاست اور عشوہ گری کا بخوبی علم ہے اور وہ چاہتی بھی ہے ، اور یہ بھی چاہتی ہے کہ اسے چاہا جائے ، یہ ضروری نہیں کہ وہ غالب ہی کو چاہتی ہو - اس جیتی جاگتی عورت سے غالب کا رشتۂ محبت استوار ہے - پہلی بار اردو میں محبوبہ کے متعلق ایک نئے لہجے کی کھنک سنائی دیتی ہے - غالب کے لیے یہ بات کافی ہے کہ محبوبہ حسین ہے ، طرح دار ہے ، سج دھج رکھتی ہے اور اس آن سے متصف ہے جو روپ کا مان اور حسن کی جان ہے - وہ شگفتہ جبین ہے ، ہنستی ہے ، مسکراتی ہے ، چاہتی ہے کہ غالب اسے چاہے لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دیتی کہ وہ بھی اسے چاہے گی - غالب یہ سمجھوتا قبول کرتا ہے - یہ بڑا معرکے کا سمجھوتا ہے - یہ اردو غزل میں ایک نیا موڑ ہے ، یہ شعری روایت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے - پہلے شاعر کا موقف یہ تھا کہ میں جو محبوبہ کو چاہتا ہوں تو اب میرا حق ہے کہ وہ بھی مجھے چاہے -

غالب محبوبہ کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ اسے اختیار ہے کہ
وہ کسی اور کو دل دے اور اسے چاہے - اندازہ کر لینا چاہیے
کہ غالب اضطراب کے کن دوزخوں سے اور کرب کی کن منزلوں
سے گزرا ہوگا تب ذہنی تہذیب کا یہ بلند مقام اسے حاصل
ہوا ہے کہ وہ حسن سے نہ وفا کی توقع رکھتا ہے نہ التفات کی،
نہ عفت و عصمت کی ؛ حسن بہر حال حسن ہے ، دل پزیر ہے ،
عالم گیر ہے ، ہوش ربا ہے ، دل کشا ہے ؛ طرح داری کے
ساتھ اگر سیاہ کاری بھی ہے تو کیا ہوا ، محبوبہ کا محض حسین ہونا
ہی کافی ہے ، اس سے یہ توقعات قائم رکھنا کہ وہ غالب کی
خاطر عفیف بھی رہے گی ، عصمت کا بلند معیار بھی قائم رکھے گی ،
غالب کے جذبۂ شوق کی قدر کر کے اس کی دل نوازی کرے گی ،
غلط ہے - حسن کا بلند رتبہ پرستار خود Amoral یعنی
ما ورائے اخلاق ہوتا ہے، Immoral نہیں یعنی، بد کردار و بد اخلاق
حسن کو بھی غالب Amoral تصور کرتا ہے کہ اسے عفت
اور عدم عفت کے پیمانوں سے نہیں جانچنا چاہیے ؛ روپ سروپ ،
سج دھج اور حسن کی چھب اس قسم کی جانچ پرکھ سے ماورا
ہے - حسن پر غالب کا یہ نقطۂ نظر بالکل انوکھا ، نیا اور اپنے
تمام معاصر شعرا سے مختلف ہے - غالب ہی کے موقف کو پہلے
حفیظ جالندھری نے اور پھر تاثیر مرحوم نے اپنایا ، نکھارا اور
سنوارا کہ بیسویں صدی میں ایسی محبوبہ عموماً نظر آتی ہے
جو دل بری کی تمام اداؤں سے مسلح ہو کر دیکھنے والوں پر
حملہ آور ہوتی ہے اور انہیں مسخر کرتی ہے لیکن خود مسخر
ہونے سے انکار کرتی ہے - غالب کی عظمت فکر اور تہذیب ذہنی
کا روشن ترین ثبوت یہی ہے کہ اس نے حسن سے جو روابط ناز و نیاز
قائم کیے ان میں زبردستی کی جھلک تک نہ تھی - اس نے محبوبہ

کا یہ موقف قبول کیا ''میں تمھیں اس بات سے نہیں روکتی کہ تم مجھے چاہو، حسن طبعاً پرستار کا متقاضی ہوتا ہے، مجھے تمھاری پرستاری قبول ہے، لیکن جس طرح تمھیں یہ حق حاصل ہے کہ جسے چاہو اپنی محبوبہ بناؤ، مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ جس سے چاہوں محبت کروں۔ میری دل بری کی ادائیں، میری سج دھج، میرا روپ سروپ سب مسلّم، لیکن ان باتوں کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمھاری طرف ملتفت ہوں۔ میری شگفتہ جبینی سے دھوکا نہ کھاؤ! روپ کی مدھ ماتی سندر نار ضرور ہنسے گی اور مسکرائے گی، اسے تم التفات سمجھ لو تو یہ تمھاری غلطی ہے۔،، اب خود اندازہ کر لیجیے کہ اردو شعرا کی زار نالی اور محبوبہ سے شکوہ سنجی کتنی بیہودہ بات ہے: یہ کیا ضرور ہے کہ جسے ہم چاہیں وہ بھی جواب میں ہمیں چاہنے لگے۔ بے شک جوانی کی شوریدہ سری تبسم کو التفات سمجھتی ہے اور آرائش کی بناوٹ کو لگاوٹ جانتی ہے لیکن اس میں حسن کا کیا قصور ہے؛ وہ تو آرائش، زیبائش اور نمائش پر مجبور ہے۔ اگر کوئی شخص حسن کی صفات طبعی کو لگاوٹ یا لگاؤ یا التفات سمجھ لے تو حسن کا کیا قصور۔ اب واضح ہوگیا ہوگا کہ غالب، محبوبہ کی جو تصویر ہمیں دکھاتا ہے، وہ بہت تیکھی اور بانکی ہے اور اردو کے تمام شعرا کے تصورات سے بالکل مختلف ہے۔ محبوبہ کی جو دو قسمیں ہمیں غالب کے ہاں نظر آتی ہیں اور غالب جس طرح حسن سے اپنے روابط کا اظہار کرتا ہے، اس کی جھلک اردو کلام میں بھی دکھائی دیتی ہے لیکن جو صراحت، وضاحت اور خوب صورتی فارسی کلام میں ہے، اس کا شائبہ بھی اردو میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اردو میں متصوفانہ حسن یا حسن کے ساکت اور جامد پیکر

کی تصویر ان اشعار میں دکھائی گئی ہے :

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اصل[۱] شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

[۲]شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

[۳]آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

---

۱ - ''تمام عالم بہ وجود واحد موجود ہے تو شاہد و مشہود ایک ہی ہوئے۔ اور ایک کے سوا دوسرا موجود نہیں ہے اور اس کا بھی وجود و شہود کوئی شے عارضی نہیں ہے بلکہ وجود عین ذات موجود ہے — جب مغایرت ھی یہاں نہیں ہے تو پھر مشاہدہ کیسا ، جس کی امید آخرت میں لوگ رکھتے ہیں'' شرح : ۱۱۰

۲ - ''اس غزل کے اکثر شعر تصوف کے مضمون کے ہیں — جب غمزہ و ادا خود ایک طرح کی بے حجابی ہے تو اس کا حجاب کرنا عین بے حجابی ہوا - '' شرح ۱۱۰

۳ - ''نقاب استعارہ ہے حجاب قدس سے اور آئینہ اس میں علم 'مایکون وماکان' ہے اور آرائش جمال سے فارغ نہ ہونا تفسیر ''کل یوم ھو فی شان'' ہے شرح : ۱۱۰ — موجودہ نقاد اور شارح اس شعر سے یہ مراد لیتے ہیں کہ کائنات دائماً ارتقا پزیر ہے اور صانع کائنات آئینہ' کائنات میں برابر اپنے روز افزوں جمال کا مشاہدہ کر رہا ہے ، کہ صانع اپنی مصنوعات میں ظاہر ہے -

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اب اس کے مقابلے میں حسن کا وہ پیکر دیکھیے جو جیتا جاگتا ہے ، شوخ و شنگ ہے اور جس کے متعلق غالب کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کا حسین ہونا ہی کفایت کرتا ہے ، اس کا التفات شرط نہیں :

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا[1] کیا

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے[2]
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

---

۱ - 'ادا' کا اصطلاحی مفہوم بھی ہے ، لغات سے رجوع کیجیے -
۲ - مجھے یقین ہے کہ پہلے مصرع کے اخیر میں 'آئے' ہے ، 'آئی' نہیں کہ اہل زبان کے محاورے میں یہاں ماضی مطلق کا مقام نہیں ہے بلکہ مضارع کا ہے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے[1]

تم نے کیوں سونپی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

ایسے بہت سے شعر نقل کیے جا سکتے ہیں لیکن بہ خوف طوالت صرف ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں اور اب وہ دو شعر نقل کرتا ہوں جن سے میرے اس موقف کا اثبات ہوگا کہ غالب کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ حسن التفات بھی کرتا ہے کہ نہیں۔ حسن کی عشوہ گری ، دل ربائی اور دل بری پرستش کے لیے کافی ہے ، حسن بنفسہ اپنا جواز آپ ہے ۔ غالب کہتا ہے :

نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو ، بہار تو ہے[2]

طراوت چمن و خوبیء ہوا کہیے

نہ ہو نگار کو الفت نہ ہو ، نگار[3] تو ہے

روانی روش و مستیء ادا کہیے

مجھے یہ شعر پڑھ کر بے ساختہ اثبات وجود باری تعالی کے سلسلے میں ایک شعر یاد آتا ہے جس کا مصنف نامعلوم ہے ، کیا شعر ہے! :

---

۱ - اس شعر میں شترگربہ کا عیب ہے ، پہلا مصرع آپ کا مفہوم لیے ہوئے ہے اور دوسرے مصرع میں تم ہے ۔

۲ - ظاہر ہے 'کہ فرصت نہ ہو' سے یہاں مراد کمی ہے یعنی بہ اعتبار زمانی ، مراد یہ ہے کہ مراد کے دن بہت کم ہوتے ہیں۔ اور 'کہیے' سے مراد یہ ہے کہ ان باتوں کا ذکر تو کیجیے ، کم فرصتی کا رونا کیوں روئیے ، جتنا کچھ ہے اسی سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیے

۳ - نگار محبوب کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

وہ اپنی نظیر آپ ہے اور اپنی مثیل آپ[۱]
آنکھوں سے نہاں، دل میں عیاں، اپنی دلیل آپ

فارسی اشعار سے پہلے میں آپ کو حسن کا جامد و ساکت پیکر دکھاتا ہوں جو مسلک تصوف سے مخصوص و منسوب ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کسی اعتبار سے صوفی نہ تھا اور جیسا کہ اس نے مکاتیب میں تصریح کی ہے، فکر شعر کے لیے کچھ تصوف بھی لگا رکھا تھا؛ لیکن اس میں قطعی کوئی شک نہیں کہ غالب کو نظریاتی طور پر تصوف کے خاصے اسرار و رموز کا علم تھا، کسی حد تک یہ نتیجہ ہے کلام بیدل کے عمیق مطالعے کا اور کسی حد تک غالب کے عمومی مطالعے کا اور اس کی ژرف نگاہی کا۔ یہ بات شروع ہی میں عرض کر دینی چاہیے کہ حسن مطلق بھی تصوف میں تین پہلو رکھتا ہے، تین روپ دھارتا ہے۔ تین کا عدد مذاہب و ادیان اور تصوف و معرفت میں ہمیشہ بہت معنی خیز اور پر اسرار رہا ہے؛ ویدانت میں حقیقت مطلقہ کے تین پہلوؤں کے نام بتفصیل ذیل ہیں، یہ گویا صفات کی طرح ہیں:

(۱) ست (۲) چت (۳) آنند۔

ست: سچ کو بھی کہتے ہیں، حقیقت کو بھی، وجود کو بھی،
چت: آگاہی، دانش اور دریافت کو کہتے ہیں۔

۱۔ مدت ہوئی شروع بلوغت میں یہ شعر سنا تھا، ممکن ہے وقت کے گزر جانے کی بنا پر حافظے میں صحیح شکل موجود نہ ہو، لیکن دوسرے مصرع کے متعلق مجھے وثوق کامل ہے۔ اس شعر پر رومی کے مصرع کا فیضان واضح ہے، ہر چند کہ شعر کی انفرادیت قائم ہی ہے، آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

آنند: اس مسرت کو کہتے ہیں جسے تصوف کی اصطلاح میں سعادت کہا جاتا ہے۔

حقیقت مطلقہ کی اعلیٰ ترین صورت اپنی صفات کے مجموعے کا نام ہے اور جب انسان کی آتما ان صفات سے کاملاً آگاہ ہو جاتی ہے تو وہ بھی اسی مقام پر پہنچ جاتی ہے یعنی ست، چت، آنند[1]۔ ست، چت، آنند کا دوسرا روپ وشنو، شیو اور برہما کی صورت میں تریمورتی بن کر نظر آتا ہے؛ یہ وہ مشہور مجسمہ ہے جس میں حقیقت مطلقہ کے تین پہلو یک جا دکھائے گئے ہیں، برصغیر پاکستان و ہند کے نوادرات میں یہ مجسمہ شامل ہے۔

عیسائیوں کی تریمورتی باپ، بیٹا اور روح القدس کا روپ دھارتی ہے، اسے اصطلاح میں تثلیث کہتے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی؛

۱۔ لغت فلسفہ، تالیف رونز، فلاسافیکل لائبریری نیویارک، سن اشاعت نامعلوم: ۲۷۷ - یہ تو صفات ہوئیں؛ قادر مطلق کی قدرت کے تین پہلو ہندو فلسفے میں وشنو، شیو اور برہما کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ وشنو خالق ہے یعنی پیدا کنندہ، برہما کائنات کا نظم و نسق اپنے تصرف میں رکھتا ہے، اس لیے قائم دارندہ کہلاتا ہے۔ شیو ہلاکت سے منسوب ہے، اسے ہلاک کنندہ کہتے ہیں۔ شیو سے جو مسلک اور مذہب منسوب ہے اس کے کوائف بہت پیچیدہ ہیں، تفصیلات کے لیے کتاب مذکور سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ دیوتا مختلف روپ دھارتا ہے۔ موسیقی اور رقص اسی سے منسوب ہے اور اس اعتبار سے نٹ راگ کہلاتا ہے۔ کلاسیکی سنگیت کے ماہر شام کی چیزوں میں بھوپالی گاتے ہیں تو نٹ راگ کو ان مشہور بولوں کے لیے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں "ہے مہادیو"۔ مہادیو سے مراد ہے سب سے بڑا دیوتا، اس دیوتا کے نہایت خوبصورت مجسمے بر صغیر پاکستان و ہند میں پائے جاتے ہیں۔ پاروتی یا پاربتی مشہور دیوی جو گنگا سے مربوط ہے، اسی کی بیوی ہے۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔

غور کیجیے عالم بھی تین ھیں ؛ عالم نباتات ، جمادات اور حیوانات۔ ابعاد اور پہلو بھی تین ھیں ۔ اقبال کہتا ھے :

سہ پہلو ایں جہان چون و چند است

چوتھا بعد اب دریافت ھوا (Fourth Dimension) ۔ نفس کی کیفیتیں بھی تین ھیں ۔ یعنی امارہ ، لوامہ اور مطمئنہ یا ناطقہ ۔ فرائڈ ان کیفیات کے مقابلے میں تین کیفیتوں کا ذکر کرتا ھے۔ یعنی Id یہ نفس امارہ ھے جہاں خواھشات گویا کیڑوں کی طرح کلبلاتی ھیں ۔ پھر اغو (Ego) اس میں ضمیر یعنی نفس لوامہ شامل ھے ۔ اسی کو Conscience کہتے ھیں ۔ لوم ملامت کرنے کو کہتے ھیں ۔ ضمیر ھمیں برے کام پر سرزنش کرتا ھے اس لیے لوامہ کہلاتا ھے ۔ نفس مطمئنہ یا ناطقہ وہ مقام ھے جہاں انسان ضمیر کی طاقت سے کام لے کر خواھشات کی تہذیب اور ترفیع کر لیتا ھے۔ یعنی Sublimation کر لیتا ھے ۔ اسے فرائڈ Super Ego کا منصب سمجھتا ھے ۔

بات یہیں ختم نہیں ھو جاتی ۔ تخلیق کائنات کے بعد اھم ترین شخصیتیں جو ابھریں وہ تین ھیں ۔ یعنی آدم ، حوا اور ابلیس ، جو کتب قدیم میں سانپ کا روپ دھارتا ھے ۔ پھر ازلی مثلث پیدا ھوتا ھے ۔ یعنی دو مرد اور ایک عورت یا دو عورتیں اور ایک مرد ۔ آدم کے بعد ایک عورت کے لیے ھابیل اور قابیل میں لڑائی ھوتی ھے ، پھر سلسلہ آگے چلتا ھے ۔ انسان فن کار بنتا ھے اور دنیا کے واقعات کو تمثیل کی شکل میں پیش کرتا ھے، تو تین وحدتوں کو پیش نظر رکھتا ھے ۔ انگریزی اصطلاح میں اسے Three Unities کہتے ھیں ۔ جس چیز کو صداقت یا Truth کہتے ھیں اس کے متعلق تین نظریات بہت مشہور ھیں ۔ مختصراً یہ

نظریات یوں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) کوئی بات یا قضیہ اس وقت صداقت سے متصف ہوتا ہے، اگر وہ کسی واقعے کا صحیح بیان کرے۔

(۲) صداقت در اصل ایک منظم کل کا جزو ہے۔ اس میں صرف منطقی یک آہنگی ہی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ ایک منظم کل کا جزو لازم ہوتا ہے۔

(۳) تجرباتی نظریات کے مطابق کوئی بات یا قضیہ اس وقت صحیح ہوتا ہے کہ کام دے سکے یا کسی کسوٹی پر پرکھا جا سکے۔ کام اور پرکھ کے متعلق مختلف معیار پیش کیے گئے ہیں[1]۔

اسی طرح تین کے عدد کی اہمیت کی سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ آپ غور کریں گے تو آپ کے ذہن میں خود بہت سی مثالیں ابھریں گی۔ تصوف کے نظام فکر میں حقیقت مطلقہ میں رخ یا پہلو بتفصیل ذیل ہیں۔ خدا (۱) حق مطلق بھی ہے۔ (۲) حسن مطلق بھی۔ (۳) اور خیر مطلق بھی[2]۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ خدا وہ حقیقت ہے جو تمام حقیقتوں سے ماورا اور تمام حقائق کا سر چشمہ ہے۔ خدا کی حقیقت سے صوفیہ کی جو کتابیں بحث کرتی ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ خدا کو اس حقیقت سے دیکھا جائے کہ وہ ماورا الورا ہے۔ وحدت وجود اور وحدت شہود کے مباحث اس پہلو سے پیدا ہوتے ہیں۔ صداقت مطلقہ کا یہ پہلو فکر کو دعوت تگ و تاز دیتا ہے۔ اس لیے مابعد الطبیعیات کا اہم ترین مسئلہ یہی ہے کہ حقیقت ذات خداوندی کیا ہے اور اسی سے یہ سوال پیدا ہوا ہے

۱- لغت فلسفہ : ۳۳۱، ۳۳۲

۲- ان کی تفصیل آگے آتی ہے، یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وحدت وجود کے قائل کے مسلک سے یقیناً متاثر ہیں۔ مختصراً ان کا نعرہ ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷ پر)

کہ ہم حقیقت کو کس حد تک پہچان سکتے ہیں۔ حقیقت ہماری فہم ناقص کے پیمانوں کے مطابق ہمارے ذہنوں پر منعکس ہوتی ہے۔ ذات باری تعالیٰ کا یہ پہلو یعنی اس کا حق مطلق ہونا بڑے دقیق مباحث پر مشتمل ہے۔ ذات خداوندی کے اسی پہلو کا سہارا لے کر منصور نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا۔ صداقت کے معانی کے جو تین سلسلے اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے صوفیا اس سلسلے سے منسوب ہیں جو صداقت کو ایک منظم کل کا جزو لازم خیال کرتا ہے۔

خدا اس معنی میں حسن مطلق ہے کہ حسن و جمال کا کمال اسی کی ذات میں نظر آتا ہے؛ صوفیا حسن مجازی کی پرستش اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ حسن حقیقی تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔ اس نظریے سے بہت فساد پیدا ہوا، یہاں تک کہ امرد پرستی نے بہت سے لوگوں کو گم راہ کر دیا۔ حافظ کے زمانے میں یہ حالت تھی کہ کلمہ صوفی مرد ریا کار اور مرد فاسق کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ سعدی نے بڑی صراحت اور بے باکی سے کہا:

محتسب در قفاے رندان است   غافل از صوفیان شاهد باز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہمہ اوست۔ دنیا میں وجود باری تعالیٰ کے سوا اور کوئی چیز ہے ہی نہیں اور جو ہے تو حجاب ہے، وہم ہے۔ ویدانت کی اصطلاح میں مایا ہے، ہر چند کہ یہ حجاب بھی محرم راز کے لیے بے حجابی ہی کی طرف جاتا ہے۔ وحدت شہود جس کے اعلیٰ ترین مفسر مجدد ثانی ہیں، کا مفہوم یہ ہے کہ صانع اور مصنوعات میں خالق و مخلوقات میں مغایرت ہے۔ اس تعلق کو وہ مختصراً ہمہ از اوست کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بے شک ہر چیز اسی کے وجود اور حکم کی مرہون منت ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سے جدا ہے۔

حافظ نے بھی ایسے صوفیوں کی قلعی کھولی ؛ بہر حال اس فساد سے قطع نظر خدا کا حسین و جمیل ہونا اُس کی ذات کا ایک اہم پہلو ہے ۔ جب صوفی اپنے لیے عاشق ، رند اور اسی طرح کے کلمات کا استعمال کرتے ہیں تو وہ خدا کے اسی پہلو کی تعریف و توصیف ملحوظ رکھتے ہیں ؛ وہ اسی اعتبار سے محبوب ہے کہ غایت حسن ہے ، عیب سے مبرّا ، نقص سے منزّہ ۔ حسن مطلق کی پرستش میں صوفیوں نے رندانہ اور مستانہ انداز میں بہت خوب صورت غزلیں کہی ہیں جو فارسی غزلوں کا سرمایہ ہیں ۔ ذات باری تعالیٰ کے اسی پہلو نے طبعاً عشق کو بھی شعر میں ایک مقام بلند بخشا ۔ عاشقانہ شاعری کی تہذیب میں خدا کے اس تصور نے کہ وہ حسن مطلق ہے ، بڑا حصہ لیا ہے ۔ حافظ کے ہاں جہاں مجاز اور حقیقت مل کر شیر و شکر ہوتے ہیں ، اس صنف سخن کا معراج کمال نظر آتا ہے جس میں عشق اور حسن کے کوائف کی تعبیر دو طرح کی جا سکتی ہے ۔ اردو میں بھی یہ کھیل بڑی خوب صورتی سے کھیلا گیا ہے لیکن فارسی میں اس کی رنگینی کا عالم اور ہی ہے ۔ آسی کہتا ہے :

دل گردوں سے لے کر تا دل دوست
گیا نالہ کئی منزل ہمارا

نہیں ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھ دیں
تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا

اب چاہیں تو حقیقت کے روے رنگین پر جو باریک ریشمی آنچل پڑا ہے ، وہ اٹھا دیں اور دوست کے پردے میں حسن مطلق کو دیکھ لیں ورنہ بہر حال حسن تو ہے ہی ، چاہے مجازی ہو ۔ اسی طرح فارسی کے اس مصرع میں :

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

آپ چاہیں تو صبر و رضا کا مقام دیکھ لیں اور چاہیں تو
معنیٔ مجازی تک محدود رہیں، اپنی طبیعت کی بات ہے؛ یہ بات
نیاز فتح پوری کو بہت کھٹکتی ہے۔ فارسی کے اس مصرع میں :

دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست

یہی کھیل بڑی خوب صورتی سے کھیلا گیا ہے؛ دوست کے معانی
میں جو وسعت ہے، اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔

اب رہی تیسری بات کہ خدا خیر مطلق ہے تو اس کا مفہوم
یہ ہے کہ خدا تمام نیکیوں اور سعادتوں کا سرچشمہ ہے، اس سے
صدور شر ہو ہی نہیں سکتا۔ شر ایک منفی چیز ہے، خیر ایک
مثبت حقیقت ہے؛ شر خیر کی نفی سے پیدا ہوتا ہے؛ اصل چیز
دھوپ ہے، روشنی ہے کہ ایک مثبت حقیقت ہے، تاریکی اس کی
نفی سے پیدا ہوتی ہے؛ سچ خیر ہے اور مثبت ہے، کذب و دروغ
اس کی نفی ہے۔ ایمان اصل حقیقت ہے، کفر و الحاد اس کی
عدم موجودگی اور نفی ہے۔ اس اعتبار سے دنیا میں شر کا وجود بالخارج
تو ہے لیکن ایک مثبت حقیقت کی طرح نہیں، یہ اور بحث ہے کہ
خیر و شر کی معرکہ آرائی نفس انسانی کی تہذیب کے لیے کتنی
ضروری ہے۔ صوفیان اخلاق نے آداب کے متعلق جو کچھ
لکھا ہے وہ ذات باری تعالیٰ کے اسی پہلو سے متعلق ہے کہ وہ
خیر مطلق ہے۔ غالب نے جو متصوفانہ پیکر حسن پیش کیا ہے، وہ
ان تینوں پہلوؤں کو محیط ہے؛ وہی حقیقت ہے جو کبھی حسن
کا روپ دھارتی ہے، کبھی نیکی کے پہلو میں جلوہ گر ہوتی ہے۔
انگریزی میں بھی یہ تین پہلو شاعری کا محبوب موضوع ہیں، یعنی
Virtue (خیر)، Truth (حق)، Beauty (حسن)۔

اب میں دکھاتا ہوں کہ فارسی میں غالب نے صداقت مطلقہ کے یہ تینوں پہلو کس طرح ملحوظ رکھے ہیں - وحدت وجود اور وحدت شہود کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ غالب اول الذکر کا قائل ہے - جو اشعار میں نقل کر رہا ہوں ، ان سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ جو میں نے کہا تھا کہ غالب کے ہاں متصوفانہ پیکر حسن بھی موجود ہے ، اس قول کی تشریح ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ غالب پر گو متصوفانہ واردات اور کیفیات نہیں گزریں لیکن وہ نظریاتی طور پر تصوف کے اہم مباحث اور بنیادی مسائل سے کاملاً آگاہ ہے - بعض مقامات پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اس مسلک کے اسرار و رموز کا بغور مطالعہ کیا ہے اور شبستری کی ''گلشن راز'' اس کے پیش نظر رہی ہے جس میں کیفیات تصوف اور صفات خداوندی کے علائم و رموز کا ذکر کیا گیا ہے ، مثلاً یہ کہ اصطلاح میں زلف ، خال ، رخ وغیرہم سے کیا مراد ہے ؟

تو پہلے حسن مطلق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کا رنگ دیکھیے اور یہ بھی دیکھیے کہ حسن مطلق سے غالب کے روابط ناز و نیاز کی کیا کیفیت ہے - اسی سلسلے میں میں کچھ شعر وہ بھی نقل کروں گا جن میں مجاز اور حقیقت ایک دوسرے سے مل کر اس طرح شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنا دشوار نظر آتا ہے - وحدت وجود کے متعلق اشعار میں یہاں انتخاب نہیں کروں گا :

ترا گویند عاشق دشمنی آری چنیں باشد

ز رشک غیر باید مردگر مہر تو کیں باشد

چه رفت از زهره با هاروت خاکم در دهن بادا
تو مریم باشی و کار تو با روح الامیں باشد

کوتہ[1] نظر حکیم کہ گفتے ہر آئینہ
نتواں فزوں ز حوصلہ جبر اختیار کرد

نومیدی[2] از تو کفر و تو راضی نۂ بکفر
نومیدیم دگر بتو امیدوار کرد

بندۂ دیوانہ ام مخطی و ساہی خوشم
حکم ترا مخطیم قہر ترا ساہیم

جذب تو باید قوی کاں ببرد باک نیست
گر نتواند رسید بخت بہ ہمراہیم

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللّٰہیم و ہم اسد اللّٰہیم

شوخی خوی ترا قاعدہ دانست خزاں
خوبیٔ روی ترا آئینہ دارست بہار

در غمت غازۂ رخسار ہوشست جنوں
در رہت شانۂ گیسوی غبارست بہار

---

۱ - فانی مرے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

۲ - غالب : شنیدہ ام کہ نہ بینی و ناامید نیم
ندیدن تو شنیدم ، شنیدنم بنگر

هم حریفان ترا طرف بساطست چمن
هم شهیدان ترا شمع مزارست بهار

جعد مشکین ترا غالیه سائیست نسیم
رخ رنگین ترا غازه نگارست بهار

وحشتے میدمد از گرد پر افشانی رنگ
از کمیں گاه که رم خورده شکارست بهار؟

بجهان گرمی هنگامهٔ حسنست ز عشق
شورش اندوز ز غوغای هزارست بهار

چون زبانها لال[۱] و جانها پر زغوغا کردهٔ
بایدت از خویش پرسید آنچه باما کردهٔ

[۲] گر نهٔ مشتاق عرض دستگاه حسن خویش
جان فدایت دیده را بهر چه بینا کردهٔ

[۳] هفت دوزخ در نهاد شرمساری مضمرست
انتقامست این که بامجرم مدارا کردهٔ

صد کشاد[۴] آنرا که هم امروز رخ بنمودهٔ
مژده باد آنرا که محو ذوق فردا کردهٔ

[۵] خوبرویان چون مذاق خوی ترکان داشتند
آفرینش را بر ایشان خوان یغما کردهٔ

خستگان را دل بپرسشهاے پنهان بردهٔ
با درستان گر نوازشهاے پیدا کردهٔ

(حواشی اگلے صفحے پر)

(حواشی صفحہ گزشتہ)

۱ - گنگ ، خاموش ، ساکت - یہاں تصوف کے اس مسلک کی طرف اشارہ ہے کہ جو ارباب نظر کسی مقام بلند تک پہنچ جاتے ہیں، وہ منصور کی منزل سے بھی آگے نکل جاتے ہیں اور انا الحق کہنے کی بجائے کاملاً خاموش ہو جاتے ہیں؛ یہ وہ مقام ہے جو ''ترک دنیا ترک عقبیٰ ، ترک ترک'' کی طرف جاتا ہے -

۲ - غالب کا اردو شعر تو مشہور ہی ہے یعنی :
آرائش جہاں سے فارغ نہیں ہنوز   پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں
فانی کہتا ہے :

جلوے محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر
قید آداب تماشا بھی تو محفل سے اٹھا

۳ - ھفت دوزخ کی تفصیل حسب ذیل ہے : [ھندوؤں کے علم الاصنام میں بھی سورگ اور نرگ (بہشت و دوزخ) کے طبقات مقرر ہیں] (۱) سقر (۲) سعیر ، (۳) لطیہ ، (۴) حطمہ ، (۵) جحیم، (۶) جہنم ، (۷) ھاویہ - صاحب لطائف معنوی نے لکھا ہے کہ ھاویہ دوزخ کا اسفل ترین طبقہ ہے۔ غالب اس سے آگاہ ہے جیسا کہ اس کے مکاتیب شاھد ہیں - اپنے آپ کو ''ھاویہ زاویہ اور سقر مقر'' کہتا ہے -
عرفی کہتا ہے :

کفران نعمت گلہ مندان بے ادب
در کیش ما ز شکر گدایانہ بہتر است

ظاہر ہے کہ عرفی کے اس شعر کا اثر غالب نے قبول کیا -

۴ - کشاد - دراصل تصوف کی عربی اصطلاح بسط کا ترجمہ ہے - بسط کے لغوی معنی ہیں کھلنا اور پھیلنا ، اسی سے ہے بساط فرش جو بچھایا جائے اور بساط شطرنج بھی کہ بچھتی ہے اور مبسوط بھی کہ مفصل ہے اور انبساط بھی کہ آدمی خوشی سے باہر ہو جاتا ہے یعنی پھیل جاتا ہے - صوفیوں کے احوال میں دو چیزیں بہت اہمیت رکھتی ہیں : ایک تو انقباض یعنی گھٹ جانا ، اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ سالک سے جلوۂ خداوندی گریزاں ہو ، محرومی اور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چشمۂ نوشست از زہر عتابت کام جاں
تلخئ مے در مذاق ما گوارا کردۂ

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)
حسرت کی ایک خاص کیفیت ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تجلی کبھی طلوع ہی نہ ہو گی ۔ اس کے مقابلے میں بسط ہے؛ یہ وہ کیفیت ہے جب تجلی سالک کی استعداد اور مقام کے مطابق جلوہ گر ہوتی ہے اور اسے عرفان ذات ہوتا ہے ۔ غالب نے بسط کا نہایت خوبصورت ترجمہ کشاد کیا ہے ۔

۵ ۔ خوب رو ظاہر ہے کہ محبوب کو کہتے ہیں لیکن واضح رہے کہ خوب حقیقت کے تینوں پہلوؤں کو محیط ہے اور یہی بات جان کلام ہے ۔ خوبی نیکی بھی ہے جیسے اس میں کئی خوبیاں ہیں اور خوب سخن درست بھی ہے جیسے خوب کہا اور خوبی حسن بھی ہے ۔ حسرت کہتا ہے :

نہیں عیب کچھ ان میں اور ہو بھی حسرت
تو ہم لوگ ہیں صرف آگہ خوبی

یہی کیفیت کلمہ نیکو کی ہے ، اور نکو کی بھی کہ حقیقت کے تینوں پہلوؤں کو محیط ہے ۔ بات بھی نیکو ہوتی ہے یعنی درست ، محبوب بھی نیکو ہوتا ہے یعنی حسین ، جمع نیکواں ، اور صداقت بھی نیکو ہوتی ہے ، جیسے نکوگفتی یعنی خوب کہا اور درست کہا ۔ اس زبان کی تہذیب اور ثقافت کی کیا تعریف ہو سکے جو کلمات نیک اور خوب میں حقیقت کی تینوں سطحیں مخفی رکھتی ہے اور رمز صداقت کو پہچانتی ہے ۔

۱ ۔ شیریں اور شہد و شراب کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں ۔ قدیم فارسی میں انوشہ بمعنی جاوداں آتا ہے ، انوشیرواں یعنی صاحب روح جاوداں اور انوشہ جس سے نوش برآمد ہوا ہے کہ مختلف معنی ہے : خوش اور خوشا ، خرم اور خوش حال ۔ شراب انگوری ۔ بادشاہ جواں اور آفریں و بارک اللہ جیسے عربی میں مرحبا کہتے ہیں ۔ یہاں یہ کلمہ مے کی رعایت سے نہایت بلیغ واقع ہوا ہے اور قطعاً کوئی شک نہیں کہ غالب اس کلمے کے مختلف معانی سے ، دلالتوں سے اور اس کی قدیم شکل سے آگاہ تھا ، برہان : ۱۲۸

[1]ذرۂ را روشناس صد بیاباں گفتۂ
قطرۂ را آشنائے ہفت دریا کردۂ

[2]دجلہ سی جوشد ہمانا دیدہ ہا جویای تست
شعلہ میبالد مگر در سینہ ہا جا کردۂ

[3]جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقی تماشا کردۂ

[4]چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازاں کاین در رسد آنرا مہیا کردۂ

[5]دیدہ میگرید زباں مینالد و دل مے تپد
عقدہ ہا از کار غالب سر بسر وا کردۂ

---

۱ - تصوف کا معمولی مضمون ہے ۔ اردو میں یہ مضمون زیادہ خوب صورتی سے ادا ہوا ہے :

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دلِ ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

۲ - شعلے کے لیے بالیدن سے استعارہ اخذ کرنا فن کاری کا بڑا بلند مقام ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصدر بالیدن میں معانی کی بہت سی سطحیں موجود ہیں ، مثلاً افزودن ۔ بڑھنا ، نمو کردن اور بزرگ شدن—پھیلنا ، پرورش پانا اور قد و قامت میں بھی بڑھ جانا ۔ اب غور کیجیے کہ شعلے کے لیے بالا کا کلمہ کتنا موزوں ہے۔ برہان : ۲۲۶ -

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۳ - وحدت وجود کا شعر ہے اور اس کا ہم معنی شعر (کم و بیش) اردو میں موجود ہے :

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

فرق یہ ہے کہ اس شعر میں اس بات کی صراحت کر دی گئی ہے کہ جلوہ و نظارہ یک گوہر ہیں یعنی ان کی اصل ایک ہے - گوہر وہی کلمہ ہے جو معرب ہوکر جوہر بنتا ہے ، جمع جواہر ؛ فارسی میں صرف فلسفیانہ اصطلاح ہی نہیں ہے کہ اصل ذات کو کہتے ہیں بلکہ خاندان کے لیے بھی یہی کلمہ استعمال ہوتا ہے اور نسب کے لیے بھی ، جیسے عالی گوہر یعنی عالی نسب اور عالی خاندان - تماشا کا مادہ مجرد ثلاثی مشی ہے ، اس میں حرکت کا عنصر لازماً شریک ہوگا - جو لوگ اس کلمے کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں ، وہ اس کے استعمال میں بہت احتیاط برتتے ہیں ، غالب ان میں شامل ہے - اس سلسلے میں آتش کا ایک شعر بھی قیامت کا ہے کہ محبوب کی پتلیوں کی حرکت کا عنصر عجیب رنگ میں دکھایا گیا ہے :

آنکھیں عاشق کو نہ تو اے بت رعنا دکھلا
پتلیوں کا کسی ناداں کو تماشا دکھلا

۴- نہایت خوبصورت اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ عوالم کے نشو و نما کی تدریج کیا رہی ہے : جمادات ، نباتات ، پھر حیوانات ، پھر اشرف المخلوقات - انسان جسے ہر چیز کی ضرورت تھی، وہ تب وجود میں آیا جب تینوں عالم موجود تھے ، معلوم تھے اور ارتقا پزیر تھے -

۵ - اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ غالب کو آزار میں لذت ملتی ہے ، اس کی تشریح آگے آتی ہے -

[1]زهے باغ و بہار جاں فشاناں
غمت چشم و چراغ راز داناں

[2]غمت را بختیاں زنار بنداں
گلت را عندلیباں بید خواناں

[3]وصالت جاں توانا ساز پیراں
خیالت خاطر آشوب جواناں

غم دوزخ نہیبت را بدامن
گداز زہرۂ آتش زباناں

دل از داغت بساط گل فروشاں
تن از زخمت ردائے باغباناں

سر راہ ترا در خاک روبی
نسیم پرچم[4] گیتی ستاناں

بہ پشتی بانی[5] لطف تو امید
قوی ہم چوں نہاد سخت جاناں

ببالا دستی[6] عفو تو عصیاں
زبوں ہم چوں نشست ناتواناں

دل برد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستم گر نتواں گفت

۱- تمام غزل استعاروں کے کھیل پر مبنی ہے - جانفشاناں سالک ہیں کہ غم محبت انھیں انبساط سے لبریز کرتا ہے -

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

در رزم گهش ناچخ[1] و خنجر نتوان برد
در بزم گهش باده و ساغر نتوان گفت
پیوسته دهد باده و ساقی نتوان خواند
همواره تراشد بت و آزر نتوان گفت
آں راز که در سینه نہان است نه وعظ است
بردار تواں گفت و به منبر نتوان گفت

(بقیه حاشیه صفحه گزشته)

۲ - بختی : شتر قوی ، بالضم شتر قوی و بزرگ ، سرخ رنگ ، خصوصاً خراسانی - آنند راج جلد اول : ۳۹۴ - لیکن واضح رہے که برهان میں (۲۳۹) بخته ملتا ہے اور اس پر معین نے نوٹ چڑھایا[4] ہے : خایه کشیده - میں کہه نہیں سکتا که آیا بختی سے اس کلمے کا تعلق ہے که نہیں - زنار بنداں سے مراد یه ہے که اسیر و مقید هیں ، بید یعنی وید جیسے رگ وید - آریائی زبانوں میں ''ب'' اور ''واؤ'' کا تبادله عام ہے -

۳ - خاطر آشوب وه شے جس سے دل پریشان ہو که خاطر دل کے معنی میں بھی آتا ہے اور خیال کے معنی میں بھی - رند کہتا ہے :
زاهد کا دل نه خاطر مے خوار توڑیے
سو بار توبه کیجیے سو بار توڑیے

۴ - پر اسرار الفاظ میں سے ہے - به فتح چ فارسی بروزن مرهم - ایک سیاه چیز که نیزے اور علم سے باندھتے هیں - معین نے برهان میں (۳۴۸) اس کلمے پر بڑا طویل نوٹ دیا ہے ، مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے که پرچم پہاڑی گائے کے سیاه بالوں کو کہتے هیں ، مراد یاک سے ہے - منگولوں کا قاعده تھا که خانوں کے خیموں کے آگے گاومیش کوهی یعنی یاک کے بالوں کا گچھا نیزے سے باندھ کر زمین میں گاڑ دیتے تھے یا علم سے لٹکا دیتے تھے - رفته رفته خود پرچم جھنڈے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ، اگرچه یه استعمال غلط ہے - معین کا خیال ہے که لغت اصلاً ترکی نہیں بلکه ایرانی ہے -

۵ - معاونت -

۶ - اقتدار — مقام بلند -

۱ - به فتح ج فارسی ، تبر زین ؛ ایک هتھیار که گھوڑے پر زین کے قریب باندھا جاتا ہے ، تبر بڑا ہے -

میں نے عرض کیا تھا کہ غالب حسن مطلق سے جو روابط قائم کرتا ہے ، ان میں ناز و نیاز کی عجب کیفیت ہوتی ہے ؛ یہ کیفیت جسے ایک قسم کی شوخی کہا جا سکتا ہے ، آردو غزلوں میں بھی ملتی ہے مثلاً :

آتا ہے داغِ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

لیکن فارسی میں جو لطافت ، نفاست اور سلیقہ نظر آتا ہے ، آردو میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے ۔ ''مثنوی ابر گوہر بار،، کا ذکر آگے یقیناً تفصیل سے آ رہا ہے ، یہاں یہ کہنا مطلوب ہے کہ بارگاہ خداوندی میں روز حشر غالب رحمت باری تعالیٰ پر بھروسا کر کے کچھ باتیں ذرا شوخ انداز میں کہتا ہے ۔ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے :

بروزے کہ مردم شوند انجمن شود تازہ پیوند جاں ہا بتن

اس دن نیک لوگ اپنے اپنے گوہر ہائے شاہوار پیش کریں گے اور طالب جزا ہوں گے ۔ کچھ لوگ جنہیں غالب خستہ جان اور خستہ جگر کہتا ہے، اس وقت عرق ندامت سے غرق چپ چاپ سر جھکائے کھڑے ہوں گے ؛ انھیں میں غالب بھی ہوگا جو خدا کی رحمت پر توقع رکھ کر یہ کہے گا کہ لوگوں نے بے شک اعمال نیک کیے ہیں لیکن مجھ پر تو اتنی مصیبتیں پڑی ہیں کہ خوب و زشت کی تمیز جاتی رہی تھی ؛ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آندھی ایک پرکاہ کو اڑائے پھرتی ہے ۔ جیتے جی دوزخ میں تھا تاہم اگر حساب کتاب ضروری ہے تو مجھے کچھ عرض کرنے کی

اجازت دی جائے۔ اب یہ معروضات سنیے ، پہلے بات کرنے کی اجازت طلب کی ہے :

مرا نیز یارائے گفتار دہ
چوں گویم بران گفتہ زنہار دہ

ہمانا تو دانی کہ کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم

مگر مے کہ آتش بگورم ازوست
بہ ہنگامہ پرواز مورم ازوست

من اندوہگین و می اندہ ربای
چہ می کردم ؟ اے بندہ پرور خدای

حساب می و رامش و رنگ و بوی
زجمشید و بہرام و پرویز جوی[1]

کہ از بادہ تا چہرہ افروختند
دل دشمن و چشم بد سوختند

---

۱ - کلمہ جمشید بہت قدیم ہے ۔ سنسکرت میں اس کلمے کی شکل یمہ ہے ، اور اوستا میں ییمہ ۔ یہ ایک دیوتا ہے جو سورج دیوتا کا فرزند ہے ۔ (مزدیسنا : ۱۲) فارسی میں شید اور شیت اور شت بزرگی اور عظمت کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ یہی کلمہ خورشید میں ہے ، یعنی خور بزرگ ، اور خور وہی کلمہ ہے جو ہندوستان کی زبان میں سوریہ ہے، یعنی سورج ۔ فردوسی اس کی ایک شکل ہور استعمال کرتا ہے ۔ اس کے معنی کا سلسلہ تین مختلف دلالتوں تک پھیلا ہوا ہے ۔ اگر اس کلمے کے ساتھ خاتم ، نگین ، اسپ ، تخت ، باد ، آصف ، ماہی ، طیور کا ذکر ہو تو حضرت سلیمانؑ مراد ہیں؛ اگر آئینہ، آب، اورآب حیواں کا ذکر ہو تو سکندر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ)
مراد ہے - اگر جام شراب اور جشن نوروز اور عیش و نشاط کا ذکر ہو تو ایرانی داستانوں اور روایات کا جمشید بادشاہ مراد ہے - دیکھیے غالب جمشید کو سلیمان کے معنی میں استعمال کرتا ہے :

سلطنت دست بدست آئی ہے
جام مے خاتم جمشید نہیں

خواجو کہتا ہے :

بر یاد بزم آصف جمشید مرتبت
بر کف گرفتہ لالۂ دل خستہ جام جم

یہاں بھی سلیمان مراد ہے، لیکن جب حافظ کہتا ہے :

آئینہ سکندر جام جم است بنگر
تابر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

تو غالباً سکندر ہی مراد لیتا ہے - اگرچہ معانی کچھ مبہم ہیں -

غالب نے مثنوی میں مے و نشاط کا ذکر کیا ہے تو جمشید بادشاہ مراد ہے - اس جمشید کے پاس وہ جام تھا جسے جام جم کہتے ہیں اور جو کاشف اسرار تھا - جمشید ہی کی رعایت سے جام شراب کو جام کیان بھی کہتے ہیں کہ جمشید روایت میں کیانی بادشاہ تھا - واضح رہے کہ فارسی ادبیات میں جام جم کے سات خط بتائے جاتے ہیں : (۱) خط جور، (۲) خط بغداد، (۳) خط بصرہ، (۴) خط ازرق، (٦) خط درشکر - (٦) خط قاصہ گر - (۷) خط فرودینہ -

جب دشمن کو ہلاک کرنا چاہتے تھے تو لبالب جام دیتے تھے یعنی خط جور تک پیمانہ بھر دیتے تھے - جب تک جام جم کے خطوط یا لکیروں کی داستان معلوم نہ ہو بہت سے اشعار بے مزہ معلوم ہوں گے مثلاً :

مئے لعل کو آب حیواں بنا
خط جام مے کو رگ جاں بنا

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اور غالب ہی کہتا ہے :

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس کے بعد یہ کہا ہے کہ میں نے دنیا میں ایسی نامرادی کی زندگی بسر کی ہے کہ اگر فردوس میں بھیج دیا گیا تو بھی تلافیٔ مافات نہ ہوگی اور مجھے آسودگی نصیب نہ ہوگی ، اس کی وجہ یہ ہے کہ:

صبوحی خورم گر شراب طہور کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شب روی ہای مستانہ کو ہنگامہ غوغاے مستانہ کو
دران پاک میخانۂ بیخروش چہ گنجائی شورش نای و نوش
سیہ مستی ابر و باران کجا خزان چون نباشد بہاران کجا

ان تمام اشعار سے واضح ہو گیا ہوگا کہ غالب حقیقت مطلقہ کو تمام پہلوؤں میں جانتا ہے کہ وہ سراسر خیر بھی ہے ، خوبی بھی ہے اور صداقت بھی ہے - ایک جگہ خدا کو خطاب کرتے ہوئے اس بات سے تعرض کرتا ہے کہ اس کے وجود کی کوئی دلیل بھی ہے کہ نہیں - غالب کی ژرف نگاہی اسی بات سے ثابت ہے کہ وہ کانٹ کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے وجود کا شعور ہمارے ضمیر میں جاگزیں ہے اور عقل و ادراک سے ماورا ہے - واقعی اثبات وجود باری تعالی پر جتنی دلیلیں اب تک لائی گئی ہیں ، سب باطل ٹھہری ہیں - چناں چہ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) جو مشہور تین دلیلیں دی ہیں ، پہلے ان کی تشریح کی ہے ، پھر ان کو باطل ٹھہرایا ہے - بات وہیں آ ٹھہرتی ہے کہ خدا کے وجود کا شعور ہمارے بطون میں خود بخود پیدا ہوتا ہے - یہ بات ملحوظ رکھیے اور غالب کے یہ شعر دیکھیے :

اے بہ مسمار قضا دوختہ چشم ابلیس
بدم گرم رواں سوختہ بال جبریل

باتو ام محرمیٔ خاطر موسیٰ بر طور
باخودم خستگیٔ لشکر فرعون به نیل
بر کمال تو در اندازه کمال تو محیط
بر وجود تو در اندیشه وجود تو دلیل
نه کنی چاره لب خشک مسلمانی را
اے بترسا بچگاں کرده مۓ ناب سبیل
غالب سوخته جاں را چه بگفتار آری
بدیاری که ندانند نظیری ز قتیل

آخری دو شعروں میں جس شوخی سے کام لیا گیا ہے ، وہ غالب سے مخصوص ہے اور یوں اس پوری غزل پر غالب کی انفرادیت کی چھاپ لگی ہے ۔ تیسرے شعر میں غالب نے اثبات ذات باری تعالیٰ کی وہ دلیل دی ہے جس کا جواب آج تک بن نہیں پڑ سکا کہ اندیشے میں یعنی سلسلۂ فکر میں اس کے وجود کا تصور ہی اس کے وجود کی دلیل ہے اور اس کے وجود کا تصور ہمارے ضمیر اور بطون خاطر میں یوں جا گزیں ہے کہ ہم کسی طرح اس سے نجات نہیں پا سکتے ۔ ایک ایسی قدرت کا جو ہر طرح مطلق ہو ، شعور ہوتا ہے اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگرچہ اس وجود کے رموز مکشوف نہیں لیکن اس کے کمال کا اظہار ہر چیز سے ہوتا ہے ؛ یہ اور بات ہے کہ مخلوقات سے خالق کا کیا تعلق ہے، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے ۔

یہ تو تھا حسن مطلق کا مشاہدہ اور معائنہ ، اب دیکھنا چاہیے کہ حسن مجاز کو غالب کس طرح دیکھتا ہے ۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ حسن بہرحال حسن ہے؛ سیاہ کار ہے تو کیا ہوا ، طرح دار تو ہے۔ بلکہ غالب کے خیال میں تو شوخی طرح داری کے کمال پر

دلالت کرتی ہے ۔ وہ نظیری کا ہم‌نوا ہے :

دلے سوگوار ما را بت شوخ و شنگ باید
مئے تلخ تر مناسب بہ مزاج درد مندان

اس بات کی بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ غالب کے ہاں جو جیتا جاگتا پیکر حسن کا ملتا ہے ، اس کے متعلق غالب کو یہ اصرار نہیں کہ وہ بھی اسے چاہے ، اگرچہ کبھی کبھی اشتباہ ہو جاتا ہے اور بےچارہ دلربائی کو کرم گستری سمجھ بیٹھتا ہے :

کشتۂ دل خویشم کز ستم گراں یکسر
دید دلفریبی ہا گفت مہربانی ہا ست

اب دیکھیے کہ غالب نے فارسی میں محبوبی اور خوبی کے (عالم مجاز میں) کیا کیا رنگ دکھائے ہیں ۔ تقابلی مطالعہ تو ہوتا رہے گا، پہلے یہ دیکھیے کہ غالب کی نظر میں حسن ماورائے اخلاق ہے اور ہر طرح سزاوار پرستش ہے :

بہ شب حکایت قتلم ز غیر مے شنود
ہنوز فتنہ بذوق فسانہ بیدار ست
بیا کہ فصل بہار است و گل بہ صحن چمن
کشادہ روئے تر از شاہدان بازار ست

بتان[۱] شہر ستم پیشہ شہریارانند
کہ در ستم روش آموز روزگارانند

---

۱ - قیاس چاہتا ہے کہ یہ دہلی کے محبوب ہیں جن کے متعلق مصحفی کہتا ہے :

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں

[۱]برند دل باداے که کس گماں نه برد
فغاں ز پرده نشیناں که پرده دارانند
بجنگ تاچه بود خوی دلبراں کایں قوم
در آشتی نمک زخم دلفگارانند
نه زرع و کشت شناسند نی حدیقه و باغ
ز بهر باده هوا خواه باد و بارانند
[۲]ز وعده گشته پشیماں و بهر دفع ملال
امیدوار بمرگ امیدوارانند

---

۱ - دیکھیے داغ :
حسن بے پرده تو هوتا هے فقط هوش ربا
وه قیامت هے جو پردے کی جھلک هوتی هے
خود غالب کہتا هے :
شرم اک اداے ناز هے اپنے هی سے سہی
هیں کتنے بے حجاب که هیں یوں حجاب میں
هے تیوری چڑھی هوئی اندر نقاب کے
هے اک شکن پڑی هوئی طرف نقاب میں
لیکن پردے پرغالب کا یہ اردو شعر قیامت هے :
در پرده انھیں غیر سے هے ربط نہانی
ظاهر کا یه پرده هے که پرده نہیں کرتے

۲ - دیکھیے عرفی :
عرفی به حال نزع رسیدی و بهه شدی
شرمت نیامد از دل امیدوار دوست

[1]ز روی خوی و منش نور دیدهٔ آتش
برنگ و بوے جگر گوشهٔ بہارانند

[2]تو سرمه بین و ورق در نورد و دم درکش
مبیں که سحر نگاهان سیاه کارانند

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب نے روز حشر خدا سے یہ شکوہ کیا تھا کہ شراب ڈھب سے پینے کو نہ ملی اور زندگی سلیقے سے بسر نہ ہوئی ، پھر کہا تھا کہ اگر تلافی مافات کے طور پر مجھے جنت میں بھیج بھی دیا گیا تو حوروں سے میرا دل کیا بہلے گا کہ میں دنیا کی شوخ و شنگ محبوبوں کا ادا شناس ہوں ۔ ان محبوبوں کی تصویر کشی میں بڑے سلیقے سے کام لیا گیا ہے اور غالب کو ابلاغ مطالب پر جو قدرت حاصل ہے ، اس کا اظہار بھی بہ خوبی ہوتا ہے :

نه بستاں سرائی نه میخانهٔ
نه دستاں سرائی نه جانانهٔ

نه رقص پری پیکراں بر بساط
نه غوغای رامش گراں در رباط

---

۱ - حسن کے لیے، موسیقی کے لیے اور متعلقہ کوائف کے لیے غالب ، تابش ، نور اور آتش سے بہت سی تشبیہیں اور استعارے اخذ کرتا ہے :

ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوهٔ برق فنا مجھے

۲ - یہی شعر جان غزل ہے اور حاصل کلام ہے ۔ مراد یہ کہ جن کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے ، وہ تو عرض حسن پر گویا مجبور ہوتے ہیں ، پھر اس کا شکوہ کیسا ۔

[1]اگر حور در دل خیالش که چه
غم هجر و ذوق وصالش که چه
چه منت نهد ناشناسا نگار
چه لذت دهد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسه اینش کجا
فریبد بسوگند دینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گوی
دهد کام و نبود دلش کامجوی
[2]نظر بازی و ذوق دیدار کو
به فردوس روزن به دیوار کو
نه چشم آرزو مند دلالهٔ
نه دل تشنهٔ ماه پرکالهٔ
[3]ازینها که پیوسته میخواست دل
هنوزم هماں حسرت آلاست دل

(۸)

کہا گیا تھا کہ حسن میں جب تک ایک خاص آن نہ ہو، وہ نامکمل و ناقص ہے۔ رنگ گورا ہوتا ہے، بال لمبے ہوتے ہیں، آنکھیں سحر کار ہوتی ہیں، قامت بلند ہوتا ہے، ناک ستواں

---

۱ - جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی
۲ - لگایا آئنہ یہ کہہ کے اس نے روزن در میں
کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے
۳ - مثنوی ابر گوہر بار کے مطالب کا خلاصہ غالب کے اس شعر میں سمو دیا گیا ہے:
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہوتی ہے ، ابرو کشیدہ ہوتے ہیں ، بدن سڈول ہوتا ہے ، ہر چیز اپنی جگہ پہ خوب صورت ہوتی ہے لیکن روز کا مشاہدہ ہے کہ ایسی حالتوں میں بھی مجموعی تاثر حسن کا پیدا نہیں ہوتا ۔ کہا جا سکتا ہے کہ خوب صورتی دیکھی جا سکتی ہے لیکن اصطلاح میں حسن خوب صورتی سے ماوراء ایک کیفیت ہے جو خد و خال سے متعلق بھی ہے اور اس سے بلند تر بھی ہے ۔ حسن کی یہ پر اسرار صفت جسے گریز پا کہا گیا ہے ، بیان میں نہیں آتی اس لیے کبھی چھب ، کبھی سج دھج اور کبھی آن کہہ کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں فارسی کے کچھ شعر نقل کیے جا چکے ہیں ، کچھ اب سن لیجیے ۔ حافظ کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے :

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئنہ سازد سکندری داند

ہزار نکتہٗ باریک تر ز مو ایں جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

غالب حسن کی اس پر اسرار صفت سے خوب آگاہ ہے ۔ یہ بھی جانتا ہے کہ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں اور اس بات سے بھی واقف ہے کہ یہ صفت اور یہ کیفیت ایسی گریز پا ہے کہ دام خیال میں آتی ہے اور نکل جاتی ہے ۔ اردو میں وہ کہتا ہے :

تمثال جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینہٗ خیال کو دیکھا کرے کوئی

فارسی میں وہ کہتا ہے :

روی خوش باید و تاب کمر و طرز خرام
نبرد دل زکف ار موئے میانے دارد

نطق تنہا نبود مشق سخن را کافی
سخن اینست که ایں تیر کمانے دارد
ہم از ینجاست که دانا دل شیراز سرود
بندۂ طلعت آں باش که آنے دارد
دم گرمی که بمن داده به ہر کس ندہند
گفته باشد سخنی ہر که زبانے دارد

چوں به پوئی بزمین چرخ زمین تو شود
خوش بہشتی ست که کس راه نشین تو شود
لبم از نام تو آن مایه پرستے که اگر
بوسه بر غنچه زنم غنچه نگین تو شود
[1]چوں به سنجد که نه آنست بکاہد از شرم
ماه یک چند به بالد که جبین تو شود
صد قیامت بگدازند و بہم آمیزند
تا خمیر دل ہنگامه گزین تو شود
[2]جلوه جز در دل آگاه سرایت نکند
من در آتش فتم از ہر که قرین تو شود
[3]چشم و دل باخته ام داد ہنر خواہد داد
آنکه چوں من ہمه داں و ہمه بین تو شود

---

۱ - ہو گیا بدر ہلال اس کا سبب روشن ہے
روز گھستا تھا ترے در پہ جبیں تھوڑی سی
۲ - یہ خاص غالب کا مضمون ہے، یعنی رشک، لیکن یہاں رشک صرف ارباب نظر پر ہے اور یہ روش عام سے ہٹی ہوئی بات ہے۔
۳ - یہی شعر حاصل غزل ہے۔ محبوب کے حسن گریز پا کی یہ صفت بتائی ہے کہ کیا بصیرت اور کیا بصارت، دونوں بوجه احسن کام میں لائی جاتی ہیں تو حسن محبوب کا ادراک اور شعور ہوتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو آن کہتے ہیں ، شوخی اس کو لازم ہو لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شوخی سے آن کا تعلق بھی ضرور ہے۔ محبوبہ کی شوخیٔ طبیعت جسم کی صحت مندی پر دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ یہ صحت مندی نزاکت کو مانع نہیں ، نہ نفاست طبع میں حارج ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا چکا ہے ، نظیر کی طرح غالب کی محبوبہ شوخ و شنگ ہے کہ دل سوگوار کے لیے یہی سے تلخ غم ربا ہوتی ہے۔ یوں تو محبوبہ کی شوخی کے متعلق جستہ جستہ غالب کے ہاں بہت سے شعر ملیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مندرجہ ذیل اشعار میں شوخی کی جو ادائیں دکھائی گئی ہیں ، وہ اپنی نظیر آپ ہیں :

[1] چہ فتنہ ہا کہ در اندازۂ گمان تو نیست
قیامتست دل دیر مہربان تو نیست

[2] دلم بعہد وفائے فریفت نامہ سپار
خوش است وعدۂ تو گرچہ از زبان تو نیست

[3] شکستہ رنگ تو از عشق خوش تماشائیست
بہار دھر برنگینیٔ خزان تو نیست

---

۱ - رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

۲ - اس کے مقابلے میں یہ شعر دیکھیے :
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

۳ - رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

[1]شباهتیست مر آن را که بر نیامده است
وگرنه موی بباریکی میان تو نیست
[2]دل از خموشی لعلت امیدوار چرا ست
چه گفتهٔ بزبانی که در دهان تو نیست
[3]گمان زیست بود برمنت ز بیدردی
بدست مرگ ولی بدتر از گمان تو نیست
تغافل تو دلیل تجاهل افتادست
تو و خدائے تو ! غالب ز بندگان تو نیست

(۹)

بنارس میں غالب نے جو پری چہرہ نازنین دیکھے ہیں ، ان کی شوخی ، نزاکت ، نفاست طبع اور لطافت تن کی بڑی دل کش تصویر تیسری مثنوی میں نظر آتی ہے جو ''چراغ دہر'' کہلاتی ہے ؛ شیخ علی حزین بھی اس شہر میں آ کر پکار اٹھے تھے :

از بنارس نه روم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن پسر لچھمن و رام است ایں جا

یوں بھی بر صغیر ہند پاکستان کی یہ تین چیزیں ہمیشہ سے مشہور رہی ہیں اور داستان ہائے ناز و نیاز کی زیب و زینت یعنی

---

۱ - کمر یار کی نزاکت پر غالب ہی کا شعر ہے :
ما لاغریم گر کمر یار نازک است
فرق است درمیانه که بسیار نازک است
۲ - عجیب و غریب شعر ہے ؛ معلوم نہیں کہ خموشی سے جو کلام پیدا ہوا ہے ، وہ حسن نگاہ کا مرہون منت ہے یا کسی اور ادائے دلبری کا ، جو التفات اور مہربانی پر دلالت کرتی ہے ۔
۳ - یہ مضمون کہ عشق میں مر مر کے جیے جانا موت سے مشکل ہے ، عصر حاضر میں بہت مقبول ہوا ہے ۔

صبح بنارس ، شام اودھ اور شب مالوہ ۔ صبح کے وقت بنارس میں دریا پہ طلوع آفتاب کا منظر ، سیڑھیوں پر پجاریوں اور پجارنوں کا ہجوم، نکہت و جلوہ و رنگ ، نشاط و نغمہ و آہنگ—آج تک سیاح دور دور سے آتے ہیں اور اس جوہری دور میں بھی بنارس کے مناظرفطری کی دل کشی سے لطف اٹھاتے ہیں۔ حال ہی میں ایک سیاح نے بنارس میں صبح کے وقت کنارۂ دریا کے سماں سے متاثر ہو کر لکھا ہے[۱] :

"دریا کے اس پار دور تک پھیلے ہوئے افق کی دھندلی فضا میں ہر صبح آتشیں آفتاب طلوع ہوتا ہے ۔ گوشوں میں جو سائے پناہ گزین تھے، آہستہ آہستہ کرنیں انھیں روشنی کے دائرے میں کھینچ لائی تھیں..... عورتیں اپنی ساڑیوں کے پلو پھیلا کے دریائے زخار میں صدف شہوار کی طرح جیسے گم ہو جاتی ہیں...... یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پانی کی سطح سے ذرا نیچے نادرہ کار رلگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہوں ۔ ساڑیوں کے پلو مچھلیوں کے پروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں ۔ ان عورتوں کے لمبے لمبے بال کسی پر اسرار سمندری پودے سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو زندہ ہو اور شکار کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ نہانے کے بعد جب یہ عورتیں سیڑھیوں پر کھڑی ہوتی ہیں تو کپڑے بدن سے چپک جاتے ہیں ، بدن کے تمام قوس اور تمام خطوط صاف دکھائی دیتے ہیں ، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ لباس سے معرا ہوں ۔"

---

۱ - "ہندوستان خواب اور حقیقت" (انگریزی) تالیف Schmid ، مترجمہ (E. Osers) لندن ، ۱۹۶۱ ، صفحہ ۳۹ - ترجمے میں میں نے کوشش کی ہے کہ مصنف کا مفہوم بوجہ احسن ادا ہو جائے۔ کچھ غیر ضروری فقرے ترک کر دیے گئے ہیں کہ مقصد کنار دریا کا منظر سامنے لانا ہے ، فروعی باتوں سے قطع نظر کر لیا گیا ہے ۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غالب نے گلیوں گلیوں پھر کر بنارس کی سیر کی ہے لیکن اس نے بنارس کی حسینوں کی جو تصویریں کھینچی ہیں ، اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ نازنین پجارنوں کو کنار دریا اس نے ضرور دیکھا ہے۔ بنارس ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں حسن جسمانی کے نہایت بانکے تیکھے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ بدن کا سڈول پن اور چال ڈھال کی خوب صورتی اس علاقے کی خاص چیزیں ہیں۔ بہرحال اب غالب کے عہد کا بنارس اور وہاں کے نازنین دیکھیے:

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور

[1] بیا اے غافل از کیفیت ناز
نگاهی بر پری زادانش انداز

[2] همه جانهای بے تن کن تماشا
ندارد آب و خاک این جلوه حاشا

خس و خارش گلستانست گوئی
غبارش جوهر جانست گوئی

دریں دیرینه دیرستان نیرنگ
بهارش ایمن است از گردش رنگ

---

۱ - بنارس جو ہندوؤں کے علم الاصنام کا مرکز ہے اور جہاں کی فضا میں دیوی دیوتا گویا محو پرواز ہیں، وہاں کے نازنینوں کو پری زاد کہنا بڑے سلیقے کی بات ہے۔

۲ - جان ہائے بے تن سے مراد نازنینوں کی نزاکت بدنی ہے:
یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

بود در عرض بال افشانیِ ناز
[1]خزانش صندل پیشانیِ ناز

عبادت خانۂ ناقوسیانست
ہمانا کعبۂ ہندوستانست

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور
سراپا نور ایزد[2] چشم بد دور

[3]میانہا نازک و دلہا توانا
ز نادانی بکار خویش دانا

[4]تبسم بسکہ در لب ہا طبیعیست
دہن ہا رشک گل ہاے ربیعیست

[5]اداے یک گلستان جلوہ سرشار
خرامی صد قیامت فتنہ دربار

---

۱ - ایک تو خزاں کو صندل کہنا اور پھر اس کے لیے ناز کی پیشانی مہیا کرنا ، ایسا اسلوب بیان ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی -

۲ - ایزد در اصل مسلک زرتشت میں فرشتے کو کہتے ہیں ، جمع ایزداں - لیکن فارسی کی ادبی روایت میں اب یہی جمع یعنی کلمہ ایزداں ، یزداں کی صورت میں مستعمل ہے اور رب نور یا رب خیر کو کہتے ہیں ، مطلقاً رب بھی مراد لیتے ہیں -

۳ - سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

۴ - یاد کیجیے تاثیر کا شعر :
یہ دلیل خوشدلی ہے مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

۵ - غالب :
ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

به لطف از موج گوهر نرم‌رو تر
بناز از خون عاشق گرم‌دو تر
ز انگیز قد انداز خرامے
بپائے گلبنے گسترده دامے
ز رنگین جلوه ها غارتگر هوش[1]
بهار بستر و نوروز آغوش
زتاب جلوهٔ خویش آتش افروز[2]
بتان بت پرست و برهمن سوز
بسامان دو عالم گلستان رنگ
ز تاب رخ چراغان لب گنگ[3]
قیامت قامتان مژگان درازان
ز مژگان بر صف دل نیزه بازان
به تن سرمایهٔ افزایش دل[4]
سراپا مژدهٔ آسایش دل

---

۱ - یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حسن گریز پا کی کلیت کو یا اس کے تمام روپ سروپ کو جلوہ کہتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ اکثر اعلیٰ درجے کے فن کار حسن کی مختلف اداؤں کے پیش نظر کلمہ جلوہ کی بجائے جلوے استعمال کرتے ہیں - مثلا :

جلووں نے تیرے آگ لگا دی بہار میں

جلوے محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر
قید آداب تماشا بھی تو محفل سے اٹھا

حسن کی اداؤں کے تنوع کے لیے کہا گیا ہے :

جلوہ ترا جس رنگ میں ہے ہوش ربا ہے

۲ - جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ، غالب کی پیکر تراشی میں آتش ، آب و تاب ، تپش اور نور کو بڑی اہمیت حاصل ہے -

(بقیہ حواشی اگلے صفحے پر)

(گزشته صفحے کا بقیہ حاشیہ)

۳ - عجیب و غریب تشبیہ ہے - گنگا کے کنارے سے چراغاں کا جو منظر نظر آتا ہے ، اس کا تصور کیجیے اور پھر غور کیجیے کہ یہ سب روشنی اور رنگا رنگ کی جھلمل جھلمل تاب رخسار کی یاد دلاتی ہے - ظہیر فاریابی کہتا ہے :

بتے دارم فرنگی زادہ حسنش کافرستانے
نگارستاں ، بہارستاں ، گلستاں در گلستانے

یہ مصرع بھی یاد کر لیجیے :

گلستاں لالہ زارے گشت از حسن فرنگ او

شبلی نے حسن کے مختلف رنگ گنواتے ہوئے یہ مصرع بھی نقل کیا ہے :

حسن مہتابیٔ دلدار تماشا دارد

لب گنگ سے اور بھی شعر افق ذہن پر ابھرتے ہیں - مثلاً مصحفی :

جمنا میں جب نہا کر کل اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے

۴ - اس شعر میں کچھ اسی قسم کی کیفیت ہے کہ :

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

اس شعر کے مقدمات یہ ہیں :

(۱) شہد کی مکھی باغ میں رس چوسنے کے لیے جائے گی ،
(۲) رس سے شہد کے چھتے میں موم بنے گا ،
(۳) موم سے شمع تیار ہوگی ،
(۴) پروانہ شمع پر عاشق ہے ،
(۵) پروانہ جل مرے گا -

نتیجہ : باغ میں شہد کی مکھی کو جانے نہ دینا چاہیے -

یہ تو برسبیل تفنن ہے - غالب کے شعر کے مقدمات ، تفنن اور تکلف بر طرف ، یوں ہیں :

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۱۰)

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ نرگس کی طرح غالب خود اپنے آپ پر عاشق ہے۔ اس نے اپنے ہی فن کے حسن کا مشاہدہ کیا اور اسی میں مگن رہا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ غالب کے خیال میں اس دنیا میں فطرت نے توازن اس طرح قائم کیا ہے کہ کچھ لوگوں کو دولت بخشی ہے کہ ضامن ہنگامہ ہائے عیش و نشاط ہے، کچھ لوگوں کو جو فن کار کہلاتے ہیں، فطرت نے خیال آرائی اور سخن سرائی کی سعادت بخشی ہے کہ ان کے لیے موجب انبساط ہے۔ اردو میں بھی غالب جستہ جستہ اس توازن کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس حقیقت کی بھی نشان دہی کرتا ہے کہ اس کی فن کاری کا حسن بدیع النظیر ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۱) محبوبوں کا بدن (اگر معیاری ہو تو) کندنی ہوتا ہے،

(۲) کندن یعنی سونے سے کشتہ بنایا جاتا ہے،

(۳) سونے کا کشتہ دل کی بیماریوں میں مفید ہوتا ہے،

(۴) محبوبوں کے کندنی رنگ کو دیکھنا دل کو سونے کا کشتہ کھلانا ہے۔

نتیجہ: یہ کشتہ کھانے سے دل کو تسکین ہوگی۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اس شعر میں تفنن اور تکلف ہے۔ لیکن ذرا تفنن سے ہٹ کر سوچیے تو واضح ہوگا کہ بدن کے رنگ کی کتنی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

کسی کا شعر ہے:

نور مہتاب کا دیکھا جو غبار تیری تابانیٔ تن یاد آئی

اس کی تابانی تن جیسے ہو کندن روشن
یاد ہے شعلۂ دیدار کی اس رات کا دن

وہ سحر مدعا طلبی کے نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

بزم شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یا رب! یہ در گنجینۂ گوہر کھلا

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھو دیں جا کے معدن کو

لیکن حق یہ ہے کہ فارسی میں جس طرح غالب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس سلیقے سے اپنے نظریات پیش کیے ہیں، اردو کلام پر اس کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی۔ پہلے تو اس بات پر غور کیجیے کہ غالب کو دنیا میں جو توازن نظر آتا ہے، اس کی کیا صورتیں بتائی گئی ہیں۔ وہ اپنے ایک مشہور قصیدے میں کہتا ہے:

ہست از تمیز گر بہ ہما استخواں دہد[1]
آئین دہر نیست کہ کس را زیاں دہد

مردست مرد ہرچہ کند بے خطر کند
رادست راد ہر چہ دہد رائگاں دہد

۱۔ صراحت سے کہا گیا ہے کہ قانون فطرت کے مطابق دنیا میں توازن قائم ہے۔

[1] گلزار را اگر نه ثمر گل بہم نہد
درویش را اگر نہ سحر شام نان دھد

[2] گنج سخن نہد بہ نہانخانۂ ضمیر
وانگہ کاید گنج بدست زیاں دھد

نظارۂ متاع اثر بر دکان نہد
اندیشہ را شمار گہر در نہاں دھد

[3] آنرا کہ بخت دسترس بذل مال نیست
طبع سخن رس و خرد خردہ داں دھد

[4] آنرا کہ طالع کف گنجینہ پاش نیست
نعم البدل ز خامۂ پرویں نشاں دھد

[5] رنگ از گل ست و سایہ زنخل و نوا ز مرغ
ھر جا بہار ھرچہ بود در خور آں دھد

داروز بہر زندگی آمد نہ بہر مرگ
جرم پزشک چیست اگر خستہ جاں دھد

[6] پرویز دیر یاب شہی بود ورنہ بخت
آوارہ را براہ ز شیریں نشاں دھد

[7] فرھاد زود سیر کسے بود ورنہ دھر
کام دل غریب پس از امتحاں دھد

۱، ۲ - مراد یہ ھے کہ فن کار غربت کے عالم میں بھی ھو تو اسے پروا نہیں ھوتی کہ وہ اپنی محفل خیال میں ایسی ایسی دلفریب صورتیں دیکھتا ھے جو ارباب دولت کو نظر نہیں آسکتیں۔

۳، ۴ - یہاں بات بالکل واضح ھوگئی کہ غالب قنوطی قطعاً نہیں ھے، اس کا مسلک رجائیت ھے کہ رجائیت کی پہچان ھی یہ ھے کہ انسان کو کائنات میں ایک خاص توازن دکھائی دیتا ھے جس کی بنا پر وہ زندگی کے آلام سے سمجھوتا کر لیتا ھے۔ یہاں جو بات خاص طور پر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

صرف قصائد ھی میں نہیں غزلوں میں بھی غالب اس بات کی صراحت کرتا ھے کہ فن کار کے لیے یہی سعادت بہت ھے کہ اسے تخلیق حسن کی قوت بخشی گئی ۔ وہ اسی میں مگن رھتا ھے ۔ دنیا میں جو غم اسے پہنچتے ھیں وہ فن کار کے وجود باطنی کو متاثر نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ اصلاً فن کار فن کی حسن کاری کے مشاھدے میں اتنا محو ھوتا ھے کہ معمولی حوادث اسے مضطرب نہیں کر سکتے ۔ فن کار اپنی زندگی کس طرح گزارتا ھے؟ اسے دنیا میں توازن کہاں کہاں نظر آتا ھے؟ وہ عام لوگوں سے کس طرح بے نیاز ھوتا ھے اور اپنے آپ میں کس حد تک مگن ھوتا ھے؟ ان باتوں کی طرف جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ھوں، غالب نے اپنے فارسی اشعار میں اشارے کیے ھیں اور کہیں کہیں وضاحت سے بھی اپنے نظریات پیش کیے ھیں ۔ ان اشعار پر غور کیجیے :

مرا دلیست بہ پس کوچہ‌ٔ گرفتاری
کشادہ روئے تر از شاھدان بازاری
بہ تنگیِ دھن دوست خاطرے دارم
کہ دل ربودہ ز دشمن بہ نغز گفتاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

توجہ طلب ھے، وہ یہ ھے کہ غالب کو توازن خاص اس صورت میں نظر آتا ھے کہ جہاں مال و دولت نہیں ملتا ، وھاں الفاظ کے گنجینہ‌ٔ گوھریں پر فن کار کو تصرف حاصل ھوتا ھے ۔

۵- بہار یہاں فطرت کی علامت ھے جو انھیں مقررہ قوانین کے مطابق کائنات کی ھر چیز کو نعمتوں اور سعادتوں سے بہرہ یاب کرتی ھے ۔

۶- تلمیح ھے ۔ خسرو پرویز کو شیریں کے حصول میں بہت مشکلات پیش آئیں ۔ فرھاد کو آوارگی ھی میں سعادت عشق نصیب ھو گئی ۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

زطوطیان شکرخا مگوی و از من جوی
نشاط زمزمه و لذتِ جگر خواری

ہرچہ فلک نخواستست ہیچ کس از فلک نخواست
ظرف فقیہ می نہ جست بادۂ ما گزک نخواست

جاه[1] ز علم بیخبر علم ز جاه بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

بحث[2] و جدل بجائے ماں میکده جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نہ زد کس سخن از فدک نخواست

بر روئے حاسداں در دوزخ کشوده رشک
از بہر خویش جنت دربستہ ایم ما

آنکہ بے پرده بصد داغ نمایانم سوخت
دیده پوشید و گماں کرد کہ پنہانم سوخت

نہ بدر جستہ شرار و نہ بجا مانده رماد
سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

خود[3] را بشاهدی بپرستیم زیں سپس
در راه عشق جادۂ دیگر کنیم طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۷ - یہاں بات اور بھی صاف ہو گئی ہے، فرہاد فن کار کی علامت بن گیا ہے - مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں امتحان کے بعد ہر ایک کو حسب استعداد نعمت و سعادت سے بہره یاب کیا جاتا ہے- فرہاد بد نصیب تھا کہ جلدی مر گیا یا اس نے اپنے آپ کو جلدی ہلاک کر لیا ورنہ قانون فطرت کے مطابق اسے اپنی محنت کشی کا صلہ ضرور ملتا -

۱ - وہی توازن قائم ہے کہ ارباب علم دولت مندوں سے مستغنی ہیں -

۲ - شبہ ہوتا ہے کہ یہاں مے کدے سے مراد فن کار کی دنیائے ذہنی ہے - کہ فن کار Amoral ہوتا ہے، یعنی ماورائے اخلاق - اس کی نظر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

از داغ شوق پردہ نشینی نشان دہیم
در زخم رشک روزنۂ در کنیم طرح
از تار[1] و پود نالہ نقابے دہیم ساز
وز دود سینہ زلف معنبر کنیم طرح

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم[2] دادند
سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانہ ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

بے دشنہ و خنجر نبود معتقد زخم
دل ہائے عزیزاں بغم افگار نداند
بر تشنہ لب بادیہ سوزد دلش از مہر
اندوہ جگر تشنۂ دیدار نداند

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
میں سنی شیعہ اختلافات بالکل بے معنی ہیں ۔ داغ کہتا ہے :
جمع ہیں پاک اک زمانے کے ہائے جلسے شراب خانے کے
۳ ۔ عرض کیا گیا تھا کہ غالب خود اپنے فن میں مگن ہے اور نرگس کی طرح اپنے آپ پر عاشق ہے ۔ اس غزل کے اشعار اسی دعوے کی شرح ہیں ۔
۱ ۔ ظاہر ہے کہ غالب کے خیال میں خارجی حقائق بھی فن کار کی ذہنی کیفیات کی صورتیں ہیں ۔
۲ ۔ دو چشم نگراں سے مراد وہ بصیرت و بصارت ہے جس سے کام لے کر فن کار پیکر تراشی کا عمل سر انجام دیتا ہے ۔

گویم سخن از رنج و براحت کنندش طرح
روز سیه از سایهٔ دیوار نداند
دشوار[1] بود مردن و دشوار تر از مرگ
آنست که من میرم و دشوار نداند

فن کار کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت عمل تخلیق کو حاصل ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ یہ عمل ایک پراسرار کیفیت پر مشتمل ہے جس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔ صرف فن کار جانتا ہے کہ اپنے خام مواد سے کام لے کر وہ حسن کس طرح تخلیق کرتا ہے۔ تخلیق حسن کے متعلق بھی دو نظریے ہیں؛ ایک تو بہت قدیم ہے۔ عبدالرحمان بجنوری نے مقدمہ دیوان غالب میں مائیکل انجلو کا ایک قول نقل کیا ہے: ''مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا بلکہ بت ابتدا ہی میں سنگ سفید میں موجود ہوتا ہے اور جلوہ نمائی کا منتظر اور متقاضی، استاد کامل محض پتھر کی عارضی چادر کو علیحدہ کر دیتا ہے۔''

ملک الشعرائے دربار اکبری یعنی فیضی فیاضی کے ہاں بھی اس قسم کے نظریے کا سراغ ملتا ہے، کہ حسن مکشوف ہوتا ہے۔ دریافت کیا جاتا ہے، اختراع نہیں کیا جاتا۔ اس نظریے کے مطابق یوں کہنا چاہیے کہ مخلوقات حسن خام مواد میں محوخواب ہوتی ہیں۔ فن کار فطرت سے ہم آہنگ ہو کر ان مخلوقات کو بیدار کر دیتا ہے، یا علامہ اقبال کے الفاظ میں صرف وہ جو ہے، اسے دریافت کرتا ہے، وہ جسے ہونا چاہیے دریافت نہیں ہوتا، بلکہ اختراع کیا جاتا ہے، فیضی مثنوی ''نل دمن'' میں کہتا ہے:

۱۔ فانی نے اس مضمون کو گویا اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے:

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

آنم کہ زسحر کاری ژرف

از شعلہ تراش کردہ ام حرف

بگداختہ ام دل و زباں را

کیں نقش نمودہ ام جہاں را

بانگ قلمم دریں شب تار

بس معنی خفتہ کردہ بیدار

غالب بھی فیضی کا ہم‌نوا ہے - وہ بھی اس بات کا ادعا کرتا ہے کہ حسن فطرت میں موجود ہوتا ہے - فن کار خام مواد کے نقاب کو ہٹا کر حسن کو اپنی تمام رنگینی میں جلوہ پیرا کر دیتا ہے - یوں کہنا چاہیے کہ غالب اس سلسلے میں ذرا آگے جاتا ہے - اس کے خیال میں مخلوقات حسن جہاں کہیں بھی ہوں ، فن کار کو اپنی کامل ترین صورت میں نظر آتی ہیں - فن کار کی چشم تخیل خام مواد کے حجاب کے اس پار مخلوقات حسن کی تمام رعنائیاں دیکھ لیتی ہے - یوں تو غالب نے اپنی غزلوں میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ، لیکن اس کا ایک ترکیب بند اس سلسلے میں حجت قاطع شمار ہوتا ہے - یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے :

دیدہ ور آں کہ دل نہد تا بشمار دلبری

در دل خاک بنگرد رقص بتان آذری

آں سحر خیزم کہ مہ را در شبستان دیدہ ام

شب نشیناں را دریں گردندہ ایوان دیدہ ام

اینت خلوتخانۂ روحانیاں کانجا ز دور

زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

ہر یکی فارغ زغیر و ہر یکے نازاں بخویش

لولیٔ را در دو عشرت گہ دو مہماں دیدہ ام

هرگز ای نادان برسوائی نہ بندی دل کہ من
ماہ را در ثور و کیواں را بہ میزان دیدہ ام
رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغان را بباغ
سر برسم خواب زیر بال پنہان دیدہ ام
کلک موج نکہت گل دم زگردش نازدہ
نامۂ فیض سحر بنوشتہ عنوان دیدہ ام
شانۂ باد سحر گاہی بہ جنبش نامدہ
طرۂ سنبل ببالین بر پریشان دیدہ ام
باد سرمستانہ می‌جنبید و شبنم می چکید
غنچہ را در رخت خواب آلودہ داماں دیدہ ام
محرم راز نہان روزگارم کردہ اند
تا بحرفم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

مخلوقات حسن کو بے حجاب کرتے ہوئے اور ذاتی واردات و کیفیات کو بے نقاب کرتے ہوئے فن کار اضطراب کی ایک خاص منزل سے گزرتا ہے جسے اضطراب تخلیق کہا جا سکتا ہے۔ یہ اضطراب بھی آخر نشاط پر منتج ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شعر جذبے کا اظہار و ابلاغ ہے، جذبے کے جسمانی تغیرات کا اظہار نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے آپ کو گالی دی، آپ کو غصہ آیا، آپ کے ماتھے پر بل پڑے۔ آپ کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور آپ نے گالی دینے والے کے منہ پر تھپڑ مارا، تو ظاہر ہے کہ آپ نے جذبے کا اظہار تو کر دیا ہے، لیکن شعر نہیں کہا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب جذبے کے جسمانی تغیرات کا اظہار ہوتا ہے تو جذبہ زمین دوز ہو جاتا ہے، باقی نہیں رہتا۔ تھپڑ مارنے کے بعد آپ کا جی ٹھنڈا ہو گیا اور جس جذبے سے آپ متاثر تھے، وہ زمین دوز ہو گیا، گم ہو گیا۔

شعر کہنے سے یہ صورت نہیں ہوتی ۔ وہاں یہ ہوتا ہے کہ جذبات کے جس سلسلے سے شاعر متاثر ہوتا ہے، اس کی شدت اور حرارت جوں کی توں قائم رہتی ہے اور شعر کہا جاتا ہے۔ بہ‌الفاظ دیگر شعر کہنے سے ان جذبات کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی جو شعر کو جنم دیتے ہیں۔

اب رہا یہ کہ شعر کہتے وقت یعنی عمل تخلیق کے دوران میں جو اضطراب پیدا ہوتا ہے اس کی کیا نوعیت ہوتی ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اچھا شاعر بلند رتبہ اور اعلی منزلت سخن طراز سامنے کے عامیانہ اور سادہ جذبوں سے متاثر نہیں ہوتا ۔ جو جذبہ یا جذبات کا جو سلسلہ شعر کا محرک بنتا ہے وہ عموماً نہایت پیچیدہ ہوتا ہے۔ تو شعر کہتے وقت شاعر دو طرح کی الجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے؛ ایک الجھن تو یہ ہوتی ہے کہ مجھے ہوا کیا ہے، میں کن جذبوں سے متاثر ہوں، میرے تاثر کی نوعیت کیا ہے، مجھ پر کیا بیت رہی ہے، میری واردات کی صحیح صورت و شکل کیا ہے؟ جب شاعر یہ دریافت کر چکتا ہے کہ وہ کن جذبات سے متاثر ہے تو دوسری الجھن شروع ہوتی ہے؛ وہ یہ کہ میں اپنے تاثر کو سننے والوں تک کس طرح پہنچاؤں ۔ جب شاعر اپنے ذہن میں اپنی واردات سے کاملاً آگاہ ہو جاتا ہے تو جذبے کا اظہار ہو چکتا ہے ۔ البتہ ابلاغ باقی رہتا ہے۔ چناں‌چہ جب شاعر موزوں تشبیہات و استعارات اور پیکر تراشی کے ذریعے اپنی واردات دوسروں تک پہنچانے میں جزواً کامیاب ہو جاتا ہے تو ابلاغ کا فریضہ بھی پورا ہو جاتا ہے ۔ اب اس کی دونوں الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جن جذبات سے شاعر متاثر ہوتا ہے، شعر کہنے سے ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ۔ شب ہجراں کی واردات کے اظہار و ابلاغ سے شب ہجراں کے آلام میں کوئی

کمی محسوس نہیں ہوتی - یہ عمل تخلیق کی خاص رمز ہے اور تمام جلیل القدر شعرا اس سے آگاہ ہوتے ہیں - اقبال کہتا ہے :

غزلے زدم کہ شاید ز نوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نہ گردد ز گسستن شرارہ

راقم السطور کا شعر ہے :

میں کبھی غزل نہ کہتا مجھے کیا خبر تھی ہمدم
کہ بیان غم سے ہوگا غم آرزو دو چنداں

غالب نے اس سلسلے میں جو داد سخن دی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے - مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے :

رائے زدم کہ بار غم ہم برقم زدل رود
نامہ چو بستمش بیال مرغ سبک پری گرفت

می نالی از نے کہ بہ ناخن شکستہ اند
اے وائے ناخنے بدلت گر فرو کند

دیوانہ وجہ رشتہ ندارد مگر ہماں
تارے کشد زجیب کہ چاکے رفو کند

دیگر از گریہ بدل رسم فغاں یاد آمد
رگ پیمانہ زدم شیشہ بہ فریاد آمد

دل در افروختنش منت دامن نہ کشید
شادم از آہ کہ ہم آتش و ہم باد آمد

تا ندانی جگر سنگ کشودن ہدر است
تیشہ داند کہ چہا بر سر فرہاد آمد

ممنون کاوش مژہ و نیشتر نیم
دل موج خوں ز درد خدا داد می زند

چہ خیزد از سخنے کز درون جاں نبود
بریدہ باد زبانے کہ خوں چکاں نبود

دل از هم ریزد و حسرت اساس محکمے خواهد
غم آذر بیزد و طاقت قماش پرنیاں دارد
دارم دلے زآبلہ نازک نہاد تر
آهسته پانهم که سر خار نازک است

نو گرفتار تو و دیرینه آزاد خودم
وه چه خوش بودی که بودی ذوق بیداد خودم
معنی بیگانه خویشم تکلف بر طرف
چوں مه نو مصرع تاریخ ایجاد خودم
جوهر اندیشه دل خون گشتنی درکار داشت
غازهٔ رخسارهٔ حسن خدا داد خودم
از بهار رفته درس رنگ و بو دارم هنوز
در غمت خاطر فریب جان ناشاد خودم

میں نے کہا تھا کہ اضطراب تخلیق کے سلسلے میں آخر کار فن کار کو ایک خاص قسم کا نشاط بھی نصیب ہوتا ہے۔ اضطراب تخلیق در اصل ایک ایسی کیفیت کو وجود میں لاتا ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں ایذا پسندی یا ایذا طلبی کہتے ہیں ۔ ضروری نہیں کہ ہر فن کار مختلف نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو ، لیکن اکثر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جلیل المرتبت شاعر اور دوسرے فن کار کسی نہ کسی صورت میں نفسیاتی فشار سے متاثر ہوتے ہیں ۔ غالب کو اپنی شخصیت کے دو لخت ہونے کا شعور ہے اور یہ تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ اس پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے ایذاطلبی یا ایذا پسندی کہتے ہیں ۔ان اشعار پر غور فرمائیے :

باهمه گم گشتگی خالی بود جایم هنوز
گاه گاهی در خیال خویش می آیم هنوز

داغ تلخ گوپانم لذت سم از من پرس
محو تندخوپانم حیرت رم از من پرس

موجی از شرابستم لختی از کبابستم
شور من هم از من جو سوز من هم از من پرس

اے که در دلآزاری بیش را کم انگاری
در شمار غم خواری بیشی کم از من پرس

دلی دارم که در هنگامهٔ شوق
سرشتش دوزخ ست و گوهر آتش

بسان موج میبالم بطوفان
برنگ شعله می رقصم در آتش

اے ترا و مرا دریں نیرنگ
دهن و چشم و دست و دل همه تنگ

راهیست که در دل فتد ار خون رود از دل
ناید بزبان شکوه و بیرون رود از دل

آتش بدم آب تسلی شود و من
خون گردم ازاں تف که بهجیحون رود از دل

تو جمع باش که ما را دریں پریشانی
شکایتیست که با خویش میتوان کردن

سر از حجاب تعین اگر بروں آید
چه جلوه ها که بهر کیش میتوان کردن

حیف ست قتل گه ز گلستان شناختن
شاخ از خدنگ و غنچه ز پیکان شناختن
لب دوختم ز شکوه ز خود فارغم شمرد
نشناخت قدر پرسش پنهان شناختن
از شیوه هائے خاطر مشکل پسند کیست
کشتن بجرم درد ز درمان شناختن
مرد آنکه در هجوم تمنا شود هلاک
از رشک تشنهٔ که بدریا شود هلاک
غم لذتیست خاص که طالب بذوق آن
پنهاں نشاط ورزد و پیدا شود هلاک

دیوان فارسی افصح الفصحا
ابلغ البلغا مہر سپہر بلاغت سپہر مہر فصاحت
سحبانِ زمان حسانِ دوران جناب مستطاب میرزا
اسد اللہ خان بہادر المتخلص بغالب تصحیح و ترتیب نواب
والاجناب معلی القاب قبلہ ارباب ہمم کعبہ اصحاب کرم
ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر تخلص خلف الصدق فخر الدولہ
دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ
مبرور مغفور کہ ارشد و اعظم تلامذۂ خان عالیشان
موصوف و منجملہ اساتذۂ روزگار اند بہ اہتمام عبد الاقل
عنایت حسین بانی مطبع دار السلام واقع
حوض قاضی گذر الہ آباد من محلات
دار الخلافۂ شاہجہان آباد
زیب انطباع یافت

اولین صفحہ از دیوان غالب ، چاپ اول دہلی

دیوان فارسی افصح

الفصحاء ، ابلغ البلغاء ،

مہر سپہر بلاغت ، سپہر مہر

فصاحت ، سحبان زمان ، حسان دوران ،

جناب مستطاب میرزا اسد اللہ خان بہادر ،

المتخلص بغالب ، بتصحیح و ترتیب نواب والا

جناب، معلی القاب، قبلۂ ارباب ہمم ، کعبۂ

اصحاب کرم ، ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر تخلص ،

خلف الصدق فخر الدولہ ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خان بہادر

رستم جنگ ، مبرور و مغفور کہ ارشد و اعظم تلامذۂ

خان عالیشان موصوف و منجملۂ اساتذۂ روزگار

اند - باہتمام عبد الاقل ، عنایت حسین ،

بانی مطبع دارالسلام واقع حوض

قاضی گزر الہ آباد من

محلات دارالخلافۂ شاھجہان

آباد ، زیب انطباع یافت -

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔

بگانه یزدان را بزبانیکه بخشیدهٔ اوست سپاسگزارم و خود مرا چه پایاب سپاسگزاری اوست که چون منی را که حرف از خزف نمیشناسم ، آن همه نیرو کرامت کرد که پرده از رخ این شاهد نوخاسته که خرد نخستین دیوانش نامد، بر گرفتم و بهوای جلوهٔ دیگر که هنوز صفحهٔ اندیشه بیرنگ آن نپز یرفته ، آیینه زدایی از سر گرفتم ۔ بار خدایا درد ناروایی کالا دل را آنچنان فرو نگرفته که تن بزبونی در ندهم و بدین آرزو منت بر خویشتن ننهم که یا رب! پس از من چون من بگرد سراپای گفتار گردیده‌ای بیافرینی ، تا وارسد که دیوار کاخ والای سخن در چه[1] پایه بلند است و سر رشتهٔ کمند خیالم در آن فرازستان بکدامین ذروه بند ۔

فرد

ذوقیست[2] همدمی، بفغان بگزرم ز رشک
خار رهت بپای عزیزان خلیده باد

بنا میزد ، نخستین نقابیست از روی شاهد هر هفت کردهٔ معنی بجنبش نسیم برافتاده ، یعنی ننگ کشاکش دست ناکشیده ، باز پسین چراغیست ازگرمی چراغان نیم سوختهٔ

۱- طبع لکھنؤ ''درجه پایه''
۲- غزل از خود غالب است و مطلعش چنان نوشته :
تیغت ز فرق تا بگلویم رسیده باد
شوخی ز حد گزشت، زبانم بریده باد

پهلو ، رخ بافروختن داده، یعنی داغ منت خس نادیده ـ کهن داغهای جنون است ، سراسر بناخن شوخی نفس خراشیده ـ گرما گرم خونابهٔ درونست ، بتف پنهانی دل ناگه از ناسور تراویده ـ کاغذی پیرهنانند ، چون پیکر تصویر از حیرت واقعه خاموش ـ مشعل بکف گرفتگانند ، چون آدر۱ از دود دل [لکهنو ۳] سیه‌پوش ـ قلزم آشامان نگه را بدستگیری صلای فراوانی باده دریاب! که این خسروی میکدایست در بروی انجمن باز کرده ـ زمزمه سنجان طرب را بدمسازی نوید انبوهی نغمه بنواز! که این باربدی پرده‌ایست از بال موسیقار ساز کرده ـ خسروی شبستانیست، بصاعقهٔ سرگرمی ذوق انجمن‌آرا آتش‌خیز گردیده ، بچشمک‌زنی درخشندگی اجزای خاکستری از اندوه سرآمدن هنگامه پرده‌کشای ـ قیصری شارسانیست ، بزلزلهٔ وجد دل کارفرما ازهم پاشیده ، بشورافگنی تابش ذره‌های آفتابی ، از درد برشکستن بارنامه داستان سرای :

نگویم ، دود و چراغست یا لاله و داغ ، اما سوختگی را سرگزشت است و خستگی را رویداد ـ نگویم ، تجلی و طور است یا جنت و حور ، اما نازش۲ را قلمرو است و آرامش را سواد ـ طلسم شعله و دود است ، باز بستهٔ زردشت خیال، شعله پنهان و دود پیدا ـ دل لوح طلسم و زبان طلسم کشا ـ هنگامهٔ ابر و باد است ، برانگیختهٔ جادوی فکر ابر گهرپاش و باد الماس‌فشان ، اندیشه طومار نیرنگ و لب افسون خوان ـ خیل غزالیست ، بسامان جنبشی که در کمین‌گاه روی داده‌است، از دام بدرجسته ـ دود کبابی است ، بانداز پیچ و تابی که از شعله در دل افتاده‌است، بر هواتتق

۱- طبع لکهنؤ ''آذر''

۲- طبع لکهنؤ اول ''ناسازش'' طبع دوم مطابق متن

بسته - جالیست ، در پردهٔ نمایش خویش مشاطهٔ حقیقی را ستایش نگار - نہالیست ، در سایهٔ برومندی خویش نخابند ازل را سپاس گذار -

مثنوی[۱]

ای نہان‌بخش آشکارنواز دل بغم تن بجان گرامی ساز
شرری کز تو در دل سنگ است بر رخ لعل جلوهٔ رنگ است
ای بساط زمین‌نشینان را وی مشام یگانه‌بینان را
از رگ نوبہار نافه‌کشای وز دم باد صبح غالیه‌سای
ای فگنده بروی شاهد ذات عنبرین طره از نقاب صفات
بفروغت سہین نیایش جای از بساط سیاه کیوان‌زای
ای فلکہا حباب قلزم تو وی زمین ، لای بادهٔ خم تو
از رحیق خمت بدیر مغان لای پالای می سہیل‌فشان
بودنی‌بخش خوب و زشت توبی رونق کعبه و کنشت توبی
ای گزین‌نقشہا کشیدهٔ تو هرچه[۲] و هرکه آفریدهٔ تو
دیده[۳] را جوی خون کشادهٔ تست ناله را بال برق دادهٔ تست
ای مرا فر خسروی داده پارسی را بمن نوی داده
هم بتسلیم عجز تن زده‌ام کز تو در مدح خویشتن زده‌ام
ناتوانی قوی اساسیہاست خود نمایی خداشناسیہاست

سخن‌آفرین خدای گیتی آرای را ستایم که تا نہانخانهٔ ضمیرم را از فراوانی رنگا رنگ معنی ، بلعل و گوهر انباشت، بازویم را بترازوی

۱- پنج آهنگ طبع دوم دهلی میں عموماً بہت غلطیاں هیں - نیز نسخهٔ مذکور میں ''نظم'' بجاے ''مثنوی'' -
۲- پنج آهنگ طبع ۲ ، ''هرکه و هر چه آفریدهٔ تو''-
۳- پنج آهنگ طبع ۲ ، ''دیدار'' -

مرجان‌سنجی و خامه‌ام را هنگامهٔ گهر پاشی ارزانی داشت ـ اینت رایگان دهندهٔ ، منت نانهندهٔ ، سخنورنواز ، داور پیروزگر را نازم که چون تن بکشاکش تحسین دادن ، ننگ گرانمایگی بیانم شناخت ، بنازش والای بهین‌روشها و برازش زیبای گزین‌اداها ، از قبول خلق بی‌نیازم ساخت ـ آنت دشمن کام آفریننده بکوری چشم دشمن برگزیننده فطرت پاکیزگی‌گوهرم را ، درخور آلایش داغ هم‌چشمی ندید و پیداست که یکتایی جز او را نزیبد ، لاجرم مژه‌ام را درخونابه‌فشانی با زبانم همداستان کرد ـ

زهی ، یگانه داور دانا ، رحمت حوصلهٔ آفرینش را گنجایی اندوه غم‌خواری من نبخشید و دانست که رنجور جز بتیمار نشکیبد ، هر آینه دلم را دربن جان گزایی برمن بدرد آورد ـ

خهی‌مهربان خدای توانا که بهوایش سینه از بیتابی نفسم آذر نگار ، بثنایش صفحه از شادابی رقمم[۱] بهاراندای ـ نهادی در گداز هفت دوزخ غوطه‌خوار ، سوادی از راز هشت گلشن پرده‌کشای ، خردآشوب زمزمه‌ای که بذوق‌بخشی نشاط سماعش زهره از آسمان فرود آید بزبانم ودیعت نهادهٔ اوست و هوش‌ربا جنبشی که کرشمه ریزی انگیز ادایش از حوران طوبی‌نشین درود آید ، بنی کلکم بازدادهٔ او :

فرد

رشح[۲] کف جم میچکد از مغز سفالم
سیرابی نطقم اثر فیض حکیمست

۱ـ دهلی ''رقم بهاراندای ـ''
۲ـ اس غزل کا مطلع ہے

در بذل لآلی ورقم دست کریم است
نی نی ، نی کلکم رگ مژگان یتیم است

تار و پود تشریف عقیدت سلمانیم[۱] و فرزانه قهرمان قلمرو سخندانی[۲]، دل بشراک نعلین محمد صلی آویختن کیش و آئین من و طغرای والای یا اسد الله الغالب نقش نگین من ـ

لای خم میخانهٔ سرمدی نسبت ناچشیدگان سگالند که هیچمدانی را این مایه سیرابی نطق از کجاست غافل که نم رشحهٔ یک فیض است که سبزه را دمیدن و نهال را سرکشیدن و میوه را رسیدن و لب را زمزمه آفریدن آموخت ـ بپرتو مهتاب ازلی هدایت شبگیر نکردگان اندیشند که تیره سرانجامی را این همه روشنایی گفتار چراست ـ بیخبر که فرهٔ تابش یک نور است که شمع را بشعله و قدح را بباده و گل را برنگ و درون را بسخن بر افروخت ـ

آنکه سیه‌خیمهٔ لیلی‌منشان را بفروغ شمعهای کافوری خاورستان کرد، وادی مجنون‌روشان را از هجوم کرمک شب‌تاب پرداز چراغان بخشید ـ ریشهٔ نخل آرزو آب از مغز سر قارون میخورد ـ مایه‌داری بی‌نوایان دریاب، خامه[۳] در ایثار لعل و گوهرعرض گنجینهٔ توانگران میبرد ـ فراوانی دستگاه معنی‌نگاران بنگر، باغ از گل‌افشانی نهالهای دست نشان[۴]، نامهٔ اعمال نکوکاران خداپرست است و راغ از انبوهی گوناگون لاله های خودرو، کارگاه خیال هوسناکان شاهد باز ـ

۱- طبع دوم ''عقیدت مسلمانیم ـ''

۲- پنج آهنگ طبع ۲ ـ ''سخن رانی'' نیز ''نعلین محمدی'' ـ

۳- پنج آهنگ طبع دوم ''و خامه در ایثار'' ـ

۴- طبع دهلی ''دست فشان'' ـ

بیت

هر دل شده از دوست درانداز سپاسیست[1]
مانا که نگاه غلط انداز ندارد

رهرو آزرده‌پای را ، سایهٔ خاربن نشیمن‌پرداز ست- و در سپنج کشاورز اخگر تافته گوهر شب‌چراغ - سیل سرشکی که بروی ماتمیان میدود ، دیار غم را روایی فرمان در اوست و دامن برچیده‌ای که بدست آزادگان اندر است ، ده‌کیای قلمرو خرسندی را توقیع - تنومندان را رخ برافروختگی ، فرخ سرمایهٔ همان کف خونست که اگر بشراین دوید ، گرما گرم از مژه ریختیم و اگر رنگ گردید ، دما دم بروی شکستیم - خودآرایان را اطلس و سنجاب ارزانی ، فرجام جز آزردن اندام نیست و ما بتن از ناتوانی تاب گرانی نداریم و بدل از نازکی رنج تنگی قبا برنتابیم - لطافت تازه‌بهار رنگهای شکسته دریافتن نه زهرهٔ هر دیدور است و بنزاکت ویژه قماش کتانهای ماهتابی وارسیدن نه اندازهٔ هر ادا شناس - اگر ذره از برهنگی آفتاب پوشستی ، زرین طیلسانان خودآرای را چه رشک؟ و اگر ویرانه از جگرتفتگی ، ماهتاب‌آشامستی شبستانیان آرمیده درون را چه خبر؟ داغم از کوته‌نظران تنگ‌چشم که دمیدن تازه گل از گیاه درخشیدن برق بشبهای سیاه ، شگفت ندارند و جنبیدن زبانهای گویا، بسخنهای نغز دشخوار انگارند - غنچه مشکین نفس است و باد غالیه سای و گل کشاده‌روی و بلبل نواسنج ، زبان چه گنه کرده است که سخن‌سرای نباشد ؟ مهر جلوه برتابد و ذره بیتابی و بحر روانی و قطره اشتلم ، دل را که گفته‌است که از شورش ستوه آید؟ همانا بدانست این گروه باده در خمخانهٔ توفیق

۱- متن کلیات ۱ ، ۲ میں ''دل شده از دوست'' لیکن پنج آهنگ میں ''دل شده از دست'' -

همانقدر بود که حریفان گزشته را تردماغ ساخت ، حالیا بساط بزم سخن برچیده و جام و سبو برسرهم شکسته و ازان قلزم قلزم راوق برجای نمانده پندارند ـ کاش! بانجمنی که من در فرودین[1] رده بحلقهٔ اوباش قدح میگیرم ، فرارسند تا وارسند که می فراوان است و ساقی بیدریغ بخش ، پیمانه ها جرعه ریزست و لبها العطش گوی ـ لله در من قال بیت[2]

هنوز آن ابر رحمت درفشان است می و میخانه با مهر و نشان است

آری ، صهبای سخن بروزگار من از کهنگی تند و پرزور است و شب اندیشه را بفر دمیدن سپیدهٔ سحری برات فراوانی نور است ـ هر آینه رفتگان سرخوش غنوده‌اند و من خرابستم ـ پیشینیان چراغان بوده‌اند و من آفتابستم ـ

نظم[3]

مسنج شوکت عرفی که بود شیرازی
مشو اسیر زلالی که بود خوانساری

بسومنات خیالم درآی تا بینی
روان فروش بر و دوشهای زناری

قلم که رودبار ناپیدا کنار اندیشه را هنجارهٔ آبسنج بوده است ـ بروزگار گزیده‌یابیم لولوخیز گردابی پیموده‌است که از بسکه دران آمد شد بناف صدفهای بگوهر آبستن خلیده ، پنداری خط شعاعی مهر است بمغز شبنمستان فرو دویده ـ ورق که میکدهٔ سخن را کاسهٔ باده پیماییست ، بدوران پسندیده جوییم از بادهٔ نابی شاداب رشحه‌ربایییست که از بسکه نم آن قدسی زلال کیفیت نشئهٔ خضری

۱- پنج آهنگ ۲ ''من در فرور دین'' ـ
۲- پنج آهنگ طبع دوم ''فرد'' ـ
۳- کلیات طبع اول ندارد - پنج آهنگ طبع دوم ''قطعه''

بطینتش در آورده ، گویی چمن سرمایهٔ سفالی است ، دسته دسته ریحان از خویش بر آورده ـ دل بنور دین افروختهٔ باز پسین وخشورم ، اگر گویم که گزشتن من بپایه ، از گزشتگان عجب نیست ، چه عجب ـ پرورش آموختهٔ نخستین دستورم ، اگر سنجم که سر آمدن من در شیوه بر هم‌فنان شگفت نیست ، چه شگفت ـ خوان ایزدی نیایش بترهٔ ستایش خویش آراستن بشارهٔ بخششهاے داور افزونی ذوق سپاس خواستن است ـ تکلف بر طرف سعیم در منعم پرستی است ، نه در خود فروشی ـ زمزمهٔ نعت و منقبت در یک پرده بیک آهنگ سرودن ، دلدادهٔ نوای سبز در سبز تولا بودن است ـ تعصب پیشکش قدمم در جاده پیماییست ، نه در بیراهه‌روی ـ

قطعه[۱]

نه چنانم که بر عقیدهٔ خویش از فسون کسی هراس کنم
نتوانم که از نصیحت و وعظ عالمی را خدا شناس کنم
نه که اخبار پاستانی را دیو افسانه‌ها قیاس کنم
نه که زآثار هرچه مشهور است اثری تازه اقتباس کنم
نه که از بهر خنده‌های بهشت ترک آرایش لباس کنم
نه که در عالم فراخ‌روی عار از ژندهٔ پلاس کنم
چون نه من ساقیم نه محتسبم نبریزم ، نه می بکاس کنم
نه بواجب ز سعی وامانم نه بهر مدعا مکاس کنم
بر مدارا اگر مدار نهم کاخ الفت قوی اساس کنم
لیک ناید ز من که در گفتار مدحت لاله سور داس کنم
فصلی از مدح خود توانم خواند گر نه لب را ز لاف پاس کنم
خوشنوایم مرا رسد که ز رشک زهر در جام بو نواس کنم

۱- پنج آهنگ طبع دوم "نظم" ـ

میتوان پنجه از نظامی برد پاره‌ای جمع گر حواس کنم
توسن طبع من بدان ارزد که ز بال پری قطاس کنم
مزرع خویش را بگاه درو ناخن حور صرف داس کنم
همچو سرو از غم خزان برهد گلبنی را که من مساس کنم
کوثر از موج واکند آغوش اگر انداز ارتماس کنم
چه ازین فرقهٔ ادانشناس خویشتن را هلاک یاس کنم
بدو بیتی ز گفته‌های حزین صفحه را طرهٔ ایاس کنم
لایق مدح در زمانه چو نیست خویشتن را همی سپاس کنم
کس زبان مرا نمیفهمد بعزیزان چه التماس کنم

سرو اگر بهوای تلافی عطیهٔ نشو و نما سر بپای ابر ساید و ابر در ادای سپاس سرمایه‌بخشی گهر بر فرق دریا افشاند ، دیده‌وران شناسند که نیروی گستاخی سرو ، هم از پهلوی ابر است و فراخی دستگاه ابر، هم از گنجینهٔ دریا۔ ای بشادروان سهیل و زهره فشان معنی بار نیافته و مرا از کوتهی برداشت یا درازی فروگزاشت بترخانی نپزیرفته ، یکره بدانش و دادگرای و بورزش هنجار درونی جستجو و گردش پرگار آمیغی تگاپو سراپای چون بوی گل از بساطت منهای سخن را بپیمای و هم از خود پرس که روان بشناختن رمز هرگونه گزارش چه مایه دانا و بنان بگزاردن حق هر شیوه نگارش ، چقدر توانا گردد تا ادای سره‌روشی و انداز ویژه‌خرامشی دست بهم دهد و از عالم ناهمواری کیش و آئین هستی‌نشانان آشکاراسگال چهها در اندیشه گرد آید تا برخاستن فرجام دو روبی و درست نشستن نقش یکتا گزینی را دلکشا انگاره‌ای وجود پزیرد ۔ بزبان موجی که صهبا را بپیمانه اندر است سرگزشت جوش خویشتن پالایی که در خلوت خم میزنند شنیدنی است ۔ و بنگاه رگ‌تپشی که پروانه را در بال و

پر است ، ذوق هستی‌فشانی که در نهاد دل دارد ، دیدنی - چنانکه انتهای آرزوی متقدّمین و ابتدای آبروی متاخرین ، شیخ علی‌حزین سراید :

فرد [۱]

شمعها برده‌ام از صدق بخاک شهدا
تا دل و دیدۀ خونابه‌فشانم دادند

انصاف بالای طاعت است ، در هوا یی که بال بالا خوانی زده[۲]، و در ادا یی که خود را بشگرفی ستوده ام ، نیمۀ ازان شاهد بازیست ، یعنی هوا پرستی و نیمۀ دیگر توانگرستاییست ، یعنی بادخوانی - بیداد بین که هر جا بشانه خمی از زلف مرغوله مویان کشوده شود، بلا در من آویزد ، تا دل بپیچاک آن شکن بندمی و خواری نگر که هرگاه از خود غافل و از خدا فارغی، بر اورنگ سروری کج نشنید ، هوس مرا برانگیزد[۳] تا پیشش بنده‌وار راست استمی - شادم از آزادی که بسا سخن بهنجار عشقبازان گزاردستم و داغم از آزمندی که ورق چند بکردار دنیاطلبان در مدح اهل جاه سیه کردستم - دریغا ! که عمر سبک‌سیر، لختی بچامه و چنگ سرآمد وپاره‌ای بدروغ و دریغ رفت ، فرجام گرانخوابی بر نخاست و آشوب هوسناکی فرو ننشست - هنوز خون را در پوست هنگامۀ شورش رستخیز این آز گرم و در جیب دل از خارخارشوق ، زبان خواهش این آرزو دراز است که هرآینه گفتارهای پریشان بفراهم آوردن ارزد و خواهی نخواهی ، اوراق پراگنده بشیرازه بستن سزد ، چه ما یه شرمندگیست درین جهان باد پیمودن و درآن گیتی گسسته دم بودن ،

۱- طبع نول کشور ''زمزمه''
۲- پنج آهنگ ''زده‌ام''
۳- طبع لکهنو ''بر انکیز''

حسن را نظرفریبی رنگ و روان‌آسایی بوی و نشست کرشمه و انگیز اندام و درازی مژه و کوتاهی نگاه و راستی بالا و کژی خوی و دم‌سردی وفا و خونگرمی جفا و دلربایی التفات و جانگزایی تغافل و سبکخیزی مهر و گرانپایی کین و نکویی روی و زشتی گمان و توانایی دل و نازکی میان مسلم و سخن را دوشیزگی نهاد و پاکیزگی گوهر و برشتگی مضمون و گداختگی نفس و چاشنی سپاس و نمک شکوه و نشاط نغمه و اندوه شیون و روایی کار و رسایی بار و پرده‌کشایی راز و جلوه‌فروشی نوید و سازگاری آفرین و دل‌خراشی نکوهش و همواری صلا و درشتی دورباش و گزارش وعده و سپارش پیام و بارنامهٔ بزم و هنگامهٔ رزم حاصل ـ امّا من و ایمان من که بوالادید یگانه‌بینان سهی‌کیش که سیاه و سپید را وجود و پلاس و پرنیان را تار و پود نیافته‌اند ـ این بچراغان دل پروانه و آن بهاران زیر بال بلبل ماند ـ اشیا صور علمیهٔ حق اند و الوان نگار بال عنقا بنقشهای از رگ کلک فرونریخته ـ نقاش را صد رنگ پرده‌دری و بنواهای از ساز بدر ناجسته ، مطرب را هزار پرده رامشگری ـ هرچه از پردهٔ گفت بال هویدایی زند ، جنبش موج شهال ست و هرچه از آیینهٔ دید جلوه انگیزد ، گردش فانوس خیال ـ سبک‌مغزانی که بباد آویخته‌اند از گفتار جز گفتار چه دریافته و گرانجانانی که بهستی اشیا هستو شده‌اند از سمر او جز سمر چه واشگافته؟ چنانکه پردهسنج این سوز و ساز ، خداوند گلشن راز فرماید :

فرد[1]

هر آنکس را که اندر دل شکی نیست
یقین داند که هستی ، جز یکی نیست

هله هان ، اسدالله چامه گردآور نامه‌سیاه ای بکنش تیره و بدانش تباه ، جامه گزاشتن دل در نبرد گردن‌کشان هوا و دامن بدندان گرفتن خرد در پیکار زورآوران ، هوس نه کم اندوهی و اندک تشویریست که بحلقهٔ ماتم نشسته این مصیبت نشاط کار دیگر در خود آهنجد و چشم بر پشت پا دوختهٔ این خجلت سر از زانو برداشتن سنجد -

دین که اشارت بکارنامهٔ مینوست و آن رنگا رنگ آرزوهای هرزهٔ خون گشتهٔ تن‌پرورانی است که بگیتی از سرمایهٔ کامرانی بی‌برگ و نوا - مشتی بفرمان تهیدستی پا بگل وگروهی بامید پاداش سر بهوا بوده‌اند - مزد حسرتیان دنیا که عبارت از هنگامهٔ جاه است و آن گونه گون نقشهای بگزاف‌انگیختهٔ بیخبرانی است که سراب را بمحیطی و هیچ را بهمگی برگرفته ، بی شراره و خاشاک باهم در گرفته‌اند - مفت کثرتیان خیالی ، در نظر خون کردن و گلستان نامیدن ، غباری از رهگزر وهم برانگیختن و آسمان نقش بستن - از معنی بصورت آیم و بمذاق آشکاراپرستان پوزش گزار ، بپادافراه این شوخ‌چشمی که بستودن خویش در حاسدآزاری دلیر کرده ، خونها در دل و عقده‌ها بر لب افگنده‌ام ، سخن را در حق خویش بپستی درافگنم تا آموزگارانه فطرت را گوش‌تابی داده باشم ، لختی خزف‌ریزه بریسمان کشیدن و سلک گوهر شاهوار[2] شمردن ، مشتی نی‌پاره بدمهٔ دم برافروختن و خود را ”هیر بد،، آدر کدهٔ پارس دانستن ، بوریا بافتن و بدیبا طرازی نام

۱- طبع لکھنؤ و پنج آهنگ ”بیت،،
۲- طبع دهلی میں یه صفحه الٹا اور بے محل چھپا ہے -

برآوردن ، سنگ آسیا آژدن و آوازهٔ الماس تراشی درافگندن ، روابودهٔ کدام دستور و بازنمودهٔ کدام فرهنگ است؟ ای آزادهٔ آزگرفتار و ای فرورفتهٔ نشیب‌لاخ پندار ، ای مسلمان زادهٔ کافرماجرا و ای‌شایستهٔ نفت و بوریا، ای بزبان جهان جهان شور و غریو و ای بدل یک اهرمنستان رنگ و ریو ، دلت از تاب ناروا اندیشه‌ها خون و زبانت بکیفر بیمزه گفتارها از قفا بیرون باد! فریبم دهی که هنگام را گنجایی خرد الفنجیدن نیست و بپوستین یاران افتی که هنگامهٔ روایی هنر سنجیدن ندارد - آخر نه از تست؟ در بروی هوس فراز کردن و دیده بدانست خویش باز کردن ، راه دانش و داد سپردن و روزگار بآراستن خوها و کاستن آرزوها و بسر بردن باخویشتن[۱] درافت و با خلق میاویز! بکنج تنهایی بنشین و از سر انجمن آرایی برخیز! فرد[۲]

زالاّ دم زن و تسلیم لا شو! بگو الله و برق ماسوای شو!

اندیشه نسنجد و گمان نسگالد که غالب از دانش[۳] بی‌بهره بدسته‌بستن این گلهای خرزهره ، آهنگ خودآرایی و انداز انگشت‌نمایی دارد -

بلکه خون گرمی ابرام والا برادر، صد ره از جان گرامی‌تر ، بمهر ابر گوهربار بخشم آتش بیزینهار ، تقوی‌پیشه ، سروری دستگاه ، راستی‌اندیشه ، کج کلاه ، بر ورع پیشگی از جنید و شبلی خرقه‌یاب و بکجکلهی روکش کیخسرو و افراسیاب ، پرویزبزم ، تهمتن‌رزم ، مهرجمال ، مشتری‌خصال ، بهشتی‌روی ، بهاران‌خوی ، جفاگسل ، وفاپیوند ، دوست کشای ، دشمن‌بند -

---

۱- پنج آهنگ ۲ "باخویش"
۲- پنج آهنگ ۲ "بیت"
۳- طبع دهلی میں یہ صفحہ بھی الٹا چھپا ہے -

مثنوی

بگیتی از وفاداری ، جهانی محبت را زمین و آسمانی
بدارایان ، بدارایی نشانه بدانایان ، بد دانایی فسانه
بنیرو، سرکشان را پنجه برتاب بدانش ، صاحب آثار فرتاب
نظر، پروانهٔ شمع جمالش تماشا ، بلبل باغ خیالش
نگاهش ، سالک در دل دویدن دلش ، مجذوب بار دل کشیدن
دل و جان تمنا ، جلوه گاهش هجوم آرزوها ، گرد راهش
خطش ، عنوان‌نگار خوبرویی لبش ، فرهنگ‌دان بذله گویی
بهمت ، دهر گلشن ساز ابری بسطوت، سینه روزن کن هزبری
نهادش را ، ز والایی نشانها زبانش را ، ز دانایی بیانها
خیابان نکویی را ، نهالی بیابان شگرفی را ، غزالی
بدریای محبت بی‌بها در ''امین الدین احمد خان بهادر''

آنکه پارسایی را در سرشتش ، از استواری آن پایه که چون منی عمرها از یکدلی یکروی بوده و هیچگاه در حلقهٔ رسوایی من و خلوت برنایی خویش ، لب بمی نیالوده - آنکه مهرش از دل‌نشینی در نهادم بدانمایه که اگر بشایستگی رونمایش مسلم نداشتمی جان را گرامی نپنداشتمی - مرا برین‌کار داشته و همتم را بپینه[۱] دوزی این کهن دلق گماشته است - رنگهای از خجلت این خود نمایی برو شکسته را دیدن برنتابد و ننگهای از قبول این رسوایی بخود باز بسته را شنیدن درنیابد - نه بدان معنی که از سبک مایگی کالا خواری میکشم ، بلکه چون متاعم باب این قلمرو نیست ، از گرانی خاطر احباب شرمساری میکشم - آری چرا چنین نباشد که شخص استعداد مرا پیرایهٔ نازش فضلی و تشریف وجود مرا سرمایهٔ برازش کمالی

۱- پینه بر وزن کینه بمعنی 'پیوند' و هندی آن ''تهگلی'' ۱۲ -

نیست ۔ نه ترانهٔ صرف و اشتقاقم بر لب است و نه زمزمهٔ سلب و ایجابم بزبان نه خون صراحم بگردن است و نه نعش قاموسم بر دوش ۔ نه آبله‌پای جادهٔ صنائعم و نه گوهرآمای رشتهٔ بدایع ۔ کباب گرمی آتش بیدود پارسیم و خراب تلخی بادهٔ پرزور معنی۔ آتشکدهٔ ناؤسیان عجم را سمندرم ، سوز من هم از من پرس و گلزار نخل‌بندان پارس را بلبلم ، شور من هم از من جوی ۔ سبزه دماندهٔ ابرست و گل فشاندهٔ باد و چیدن و دسته بستن کمینه صنعت است و یاران پیشه‌وراند ۔ آری ، بیکار نشاید زیست ، نفس در شراره کاشتن است و زبان در زبانه درودن درگرفتن و هم از خود مایه برگرفتن شگرف حالت است و ما اندرین هنگامه‌ایم ، یعنی از ذوق میتوان مرد—فرد[۱]

در ته هر حرف غالب چیده‌ام میخانه ای[۲]
تا، ز دیوانم که سرمست سخن خواهد شدن[۳]

قطعات

غالب ، از خاک پاک تورانیم لاجرم ، در نسب فره مندیم
ترک‌زادیم و در نژاد همی بسترگان قوم پیوندیم
ایبکیم[۴] از جماعهٔ اتراک در تمامی ، ز ماه ده‌چندیم
فن آبای ما کشا و زریست مرزبان‌زادهٔ سمرقندیم
ور ز معنی سخن گزارده‌ای؟ خود چه گوییم تا چه و چندیم
فیض حق را کمینه شاگردیم عقل کل را بهینه فرزندیم
هم بتابش ببرق دم‌نفسیم هم ببخشش ، بابر مانندیم

۱- طبع دهلی ندارد ۔ پنج آهنگ ''بیت''
۲- شروع میں غالب کا خیال تھا کہ اس دیوان یا کلیات کا نام ''میخانهٔ آرزو،، رکھیں گے ، اسی لیے برائت استہلال کے طور پر ''میخانه آراسته کرنا، لکھا ہے ۔
۳- یه دیباچه ۱۸۳۵ء کے قریب لکھا گیا ہے ۔
۴- ''ایبک ، بهمزهٔ مفتوح و موحدهٔ مفتوح ، قومی از اقوام ترک'' ۱۲ حاشیهٔ طبع لکھنو ، از غالب ۔

بتلاشی که هست، فیروزیم بمعاشی که نیست، خورسندیم
همه بر خویشتن همیگرییم همه بر روزگار میخندیم

قطعه ۲[۱]

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی که اصل گوهرم از دودهٔ جم است؟
میراث جم که می بود، اینک بمن سپار!
زین پس رسد بهشت که میراث آدم است

قطعه ۳

آنم که درین بزم صریر قلم من
در رقص درآورده سپهر نهمین را
رضوان کند از ریزهٔ کلکم، بتبرک
پیوندگری نخلهٔ فردوس برین را
هر ناوک اندیشه که از شست کشادم
بر رهگزر وحی ره افتاد کمین را
بر محضر استادی من بسکه زند مهر
بر خاتم جم سوده‌شود نقش نگین را
با این همه آرایش گفتار که گفتم
از جبههٔ بختم نبود فاصله چین را
بخت صلهٔ مدح و قبول غزلم نیست
تسکین بچه بخشم دل هنگامه گزین را
ور بانگ زنی کان همه دادند بحافظ
گویم‌بحلش باد! ولیکن چه شد این را

۱- طبع اول میں نمبر شمار نہیں ہے، طبع نول کشور میں ہے -

قطعه ۴

منکران شعر من ، هان تا نگویی حاسد اند
کاین قیاس ازبهرشان سامان نازی بوده‌است
رشک از کالاشناسی خیزد و آن مایه‌ایست
کاش باشد رشک کانرا هم جوازی بوده‌است
ور بگویی چون حسد نبود خلاف ازبهر چیست
گویم آری ابن حقیقت را مجازی بوده‌است
خویش را چون من ، مرا چون خویش میدانسته‌اند
چون ، همی‌بینند کاین را سوز و سازی بوده‌است
لاجرم ، بر فکر خود هم اعتمادی کرده‌اند
وین نمیدانند کاخر امتیازی بوده‌است
باغ و زندان را غنایی و [1]عنایی داده‌اند
کوه و هامون را نشیبی و فرازی بوده‌است
بیحیا نبوم معاذ الله ! که گویم در جهان
تره و سروی و گنجشکی و بازی بوده است
در تمیز ار پایهٔ احباب کاهم ، کافرم
شیوهٔ من الفت و عرض نیازی بوده‌است
لیک در فطرت ز هم بیگانه‌ایم و عیب نیست
آفرینش را بهر یک پرده ، رازی بوده است
نالهٔ ناقوس ما و دوستان بانگ نماز
نالهٔ ناقوسی و بانگ نمازی بوده‌است
اضطراب بسمل ازما ، ترکتاز از همفنان
اضطراب بسملی و ترکتازی بوده‌است

۱- لکھنؤ ''غنائے و غنای'' صحیح ''عنای'' ''عنا'' معنی مصیبت ـ غنا و عنا میں تجنیس کے علاوہ تضاد نے بڑا لطف پیدا کر د یا ھے ـ

ما و درد و داغ و همکاران ما و برگ و ساز
درد و داغی بوده‌است و برگ و سازی بوده‌است

دل اگر خام است باید کز فشردن نم دهد
وین بریزش نسبت دور و درازی بوده است

نازم آن دل را که چون اجزای شمع از تاب خویش
سوزد و ریزد فرو ، کاین اهتزازی بوده‌است

اینکه افشارند و نم گیرند ، مشتی بیش نیست
وینکه خود خون گردد و ریزد ، گدازی بوده‌است

غالبا ، دم درکشیدم وین ز عجز نطق نیست
طبع را از خودنمایی احترازی بوده‌است

قطعه ۵

هزار معنی سرجوش خاص نطق من است
کز اهل ذوق دل و گوی از عسل برده‌است

ز رفتگان بیکی گر توارد م رو داد
مدان که خوبی آرایش غزل برده‌است

مراست ننگ ، ولی فخر اوست کان بسخن
بسعی فکر رسا جا بدان محل برده‌است

مبر گمان توارد یقین شناس که دزد
متاع من ز نهان‌خانهٔ ازل برده‌است

قطعه ۶

غالب ، درین زمانه بهرکس که وارسی
مضمون غیر و لفظ خودش بر زبان اوست

زین مایه از کجا که نبالد بخویشتن
هر گنج شایگان که بود رایگان اوست

کس را ز دست برد خیالش نجات نیست
گر پیش ازو گذشته و گر در زمان اوست

مضمون هر که را خوش ادا میکند بناز
گوبی ببزم اهل سخن ترجمان اوست

اما بکنه حسن ادا نارسیده‌است
میلرزد از نهیب و دلم رازدان اوست

جز من کسی بدرد سخن وانمیرسد
گو خوش بخوان که انجمنی مدح‌خوان اوست

آری نه چک بود نه تمسک ، ز هر که هست
نی دستخط ، نه مهر ، نه نام و نشان اوست

مضمون شعر نوت[۱] بود فی زماننا
یعنی ، بدست هر که بیفتاد ، آن اوست

قطعه ۷

ای که در بزم شهنشاه سخن‌رس گفته ای!
کی بپر گوبی ، فلان ، در شعر همسنگ منست

راست گفتی، لیک میدانی که نبود جای طعن
کمتر از بانگ دهل گر نغمهٔ چنگ منست

نیست نقصان یکدو جزو است از سواد ریخته
کان دژم برگی ز نخلستان فرهنگ منست

فارسی بین تا ببینی نقشهای رنگ رنگ
بگزر ، از مجموعهٔ اردو که بیرنگ منست

۱- طبع دهلی نوت

فارسی بین ، تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آن ۱نسخه ارتنگ منست

کی درخشد جوهر آیینه تا باقیست زنگ
صیقلی آیینه‌ام ، این جوهر ، آن زنگ منست

هان، من و یزدان، بنای شکوه بر مهر و وفاست
تا نپنداری ، بپرخاش تو آهنگ منست

دوست بودی شکوه سر کردم، ولی جرم تو نیست
کاین همه بیداد برمن ، از دل تنگ منست

بخت من ناساز و خوی دوست زان ناسازتر
تاچه پیش آید کنون بابخت خود جنگ منست

دشمنی راهمفنی شرط است و آن دانی که نیست
از تو نبود نغمه‌ور سازی که در چنگ منست

در سخن چون همزبان و همنوای من نه‌ای
چون‌دلت را پیچ و تاب از رشک آهنگ منست

راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید
هرچه در گفتار فخر تست ، آن ننگ منست

میفرستم تا نظرگاه جهاندار این ورق
نامه بر ، بادا اگر خود طایر رنگ منست

دیده‌ور سلطان ، سراج الدین بهادر شه که او
آن شرر بیند که پنهان در رگ سنگ منست

جم‌حشم شاهی که در هنگامهٔ عرض سپاه
میتواند گفت دارا را که سرهنگ منست

۱- گویند مانی در یکی از غارهای ترکستان کتاب نوشته و مدعی شد که از آسان برایش فرود آمده‌است و این کتاب که با تصویرهای زیبا زینت یافته ارژنگ و یا ارتنگ و یا ارغنگ و یا صحف انگلیون نام دارد ، مقدمهٔ نفحات جامی از مهدی وحیدی ص ۵۶ -

انوری و عرفی و خاقانی سلطان ، منم
بادشه ، طهمورث و جمشید و هوشنگ منست
شاه میداند که من مداح شاهم ، باک نیست
گر تو اندیشی که این دستان و نیرنگ منست
از ادب دورم ز خاقان ، ورنه در اظهار قرب
خطوه و گام تو گویی میل و فرسنگ منست
مقطع این قطعه زین مصرع مصرع باد و بس
هرچه در گفتار فخر تست ، آن ننگ منست

قطعه ۸

فرصت اگرت دست دهد ، مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابی و سرودی
زنهار ازان قوم نباشی که فریبند
حق را بسجودی و نبی را بدرودی

قطعه ۹

زاهد ، ز طعنه برق فسوسم بجان مریز
نسبت مکن بزندقه؟ ای زشت‌خو مرا!
گویی که ''با کلام مجیدت رجوع نیست،،
دل تیره شد ز کافت این گفتگو مرا
حق است مصحف و بود از روی اعتقاد
در عزت کلام الٰهی غلو مرا
هر صفحه زان صحیفهٔ مشکین رقم بچشم
باشد نکوتر از خط روی نکو مرا
شیطان عدو است لیک ازان نامه هر ورق
بخشد خط امان ز نهیب عدو مرا

دانم که امر و نهی بود در کلام حق
سیرابی نمی است ازان آبجو مرا

با این همه که در خم و پیچ غم و تعب
سرگشته دارد این فلک جنگجو مرا

برخاسته‌است گرد ز سرچشمهٔ حواس
وز حافظه نمانده نمی در سبو مرا

''لاتقربوا الصلوة،، ز نهیم بخاطر است
وز امر یاد مانده ''کلوا واشربوا،، مرا

قطعه ۱۰

ساقی بزم آگهی روزی
راوق ریخت در پیالهٔ من

چون دماغم رسید زان صهبا
شدم از ترکتاز وهم ایمن

هم‌دران سرخوشی حریفانه
بیمحابا گرفتمش دامن

گفتم: ''ای محرم سرای سرور!
از ادب دور نیست پرسیدن

اول از دعوی وجود بگو،،
گفت، کفر است در طریق من!

گفتم، آخر نمود اشیا چیست؟
گفت، هی هی نمیتوان گفتن!

گفتمش، بامخالفان چه کنم؟
گفت، طرح بنای صلح فگن!

گفتم، این حب جاه و منصب چیست؟
گفت، دام فریب اهریمن!

گفتمش ، چیست منشأ سفرم؟
گفت ، جور و جفای اهل وطن!
گفتم ، اکنون بگو که دهلی چیست ؟
گفت ، جانست و این جهانش تن!
گفتمش ، چیست این بنارس؟ گفت
شاهدی ، مست محو گل چیدن!
گفتمش ، چون بود ، عظیم آباد؟
گفت ، رنگین‌تر از فضای چمن!
گفتمش ، سلسبیل خوش باشد؟
گفت ، خوشتر نباشد از [1]سوهن!
حال کلکته باز جستم ، گفت
باید اقلیم هشتمین گفتن!
گفتم ، آدم بهم رسد در وی؟
گفت ، از هر دیار ، از هر فن!
گفتم ، این جا چه شغل سود دهد؟
گفت ، از هر که هست ، ترسیدن!
گفتم ، این جا چه کار باید کرد؟
گفت ، قطع نظر ز شعر و سخن!
گفتم ، این ماه‌پیکران چه کس اند؟
گفت ، خوبان کشور لندن!
گفتم ، اینان مگر دلی دارند؟
گفت ، دارند ، لیکن از آهن!
گفتم ، از بهر داد آمده ام
گفت ، بگریز و سر بسنگ مزن!

۱- صوبۂ بہار ہندوستان کا ایک دریا -

گفتم ، اکنون مرا چه زیبد؟ گفت
آستین بر دو عالم افشاندن!
گفتمش ، باز گو طریق نجات؟
گفت غالب ، بکربلا رفتن !

قطعه ۱۱

چون مرا نیست دستگاه ستیز چون مرا نیست رسم و راه مصاف
میکشایم لبی بهایاهای! میکشم ، خنجر زبان ز غلاف
لیک در همچو بایدم امساک در شکایت نشایدم اسراف
بنده را بوده‌است از سرکار دست مزد مشقت اسلاف
زر سالانه‌ای برای دوام وجه شایسته‌ای بقدر کفاف
ملزمم کرده اند هان ، بدروغ حق من خورده اند هین ، بگزاف
آه! از اقربای بی‌آزرم داد ، از حاکمان نا انصاف

قطعه ۱۲

ای که خواهی که بعد ازین باشم مخلص صادق‌الولای تو، من
گر ترا شیوه شاهدی بودی کردمی جان و دل فدای تو، من
ور ترا پیشه شاعری بودی سودمی چشم و سر بپای تو، من
ور ترا پایه خسروی بودی سفتمی گوهر ثنای تو، من
چون ازینها نه‌ای ، مرا چه ضرور که شوم هرزه مبتلای تو، من
راست گویم بهانه چند آرم ناصح مشفقم برای تو ، من
بسکه بر مال و جاه مغروری نیستم خوش ازین ادای تو، من
چه کنی، این فساد سیم و زر است و ای من ، گر بوم بجای تو، من
بتو هرگز ندادمی زر و سیم خواجه گر بودمی خدای تو ، من

قطعه ۱۳

ایا ، بی‌هنر دشمن دیو سار ! چه نازی بهنگامهٔ زور و زر
ز ما باش فارغ که ما فارغیم نداریم پروای این شور و شر

ترا شیوه دزدی و ما بینوا تو بدروی و بدگوی و ما کور و کر

قطعه ۱۴

دیدی؟ آن بدگہر و مہر و ولایش بیزید
کہ بخشم آید اگر زشت و پلیدش گویند

زانکہ او خود بسر ابن علیؑ تیغ نراند
خواجہ از ننگ نخواہد کہ یزیدش گویند

گفتم البتہ کہ شبیر بدان میارزد
کہ شہیدش[۱] بنویسند و سعیدش گویند

گفت، زان رو کہ عزیزان ہمہ مسلم بودند
نتوان کرد گوارا کہ شہیدش[۱] گویند

قطعه ۱۵

ایا ستم‌زدہ غالب! ز ہاکنس[۲] مسگال
منہ بسینۂ بیکینہ از شکایت داغ

اگر بصدر خلاف تو کردہ‌است رپورٹ
وگر بخصم بقتل تو بستہ‌است جناغ

قضا بنای خرابی فگندہ ہم ز نخست
ندیدہ‌ای کہ ہمان عکس ''غالب'' است ''بلاغ''

۱- طبع دہلی ''شہیدیش''

۲- فرانسس ہاکنس رزیڈنٹ دہلی نواب شمس الدین کے دوست تھے۔ اس لیے مرزا کے خلاف انہوں نے رپورٹ لکھ دی اور کہا کہ ان کا مطالبہ غلط ہے ۔ جس سے متاثر ہو کر مرزا نے ایک تو یہ قطعہ لکھا دوسرے اپنا ایک پرانا قصیدہ:

یافت آیینۂ بخت تو ز دولت پرواز

جو اسی ہاکنس کی مدح میں تھا چارلس مٹکف کے نام کر دیا۔

قطعه ۱۶

کرده‌ای جهدی که در ویرانی کاشانه‌ام
چرخ در آرایش هنگامهٔ عالم نکرد

گر بهجوت رانده‌باشم نکته‌ها بر خود مپیچ
زانکه حرفی زانچه گفتم خاطرم خرم نکرد

بیتی از استاد دیدم ذوقکی بخشید لیک
هیچ در تسکین نیفزود و ز وحشت کم نکرد

همچو تو ناقابلی در صلب آدم دیده‌بود
زان سبب ابلیس ملعون سجده بر آدم نکرد

حاشا لله! بودنت در صلب آدم تهمت است
پیش هر کس گفتم این اندیشه، باور هم نکرد

قطعه ۱۷

ایا، زیان‌زده غالب! که از حدیقهٔ بخت
نمیرسد بتو خار و خسی ز هیچ سبیل

چو لازم است که پروردگار تا دم مرگ
بود برزق ضروریه در عباد کفیل

چراست این که نداری زر از سیاه و سپید؟
چراست این که نیابی بر از کثیر و قلیل؟

فتاده در سر این رشته عقده‌ای ورنه
نه مرده‌ای تو و نی رازق‌العباد بخیل

ز چند سال بمرگ تو و تباهی رزق
شده‌است حکم خود از پیشگاه رب جلیل

فرشته‌ای که وکیل است بر خزاین رزق
نکرد هیچ توقف برزق در تعطیل

دوم فرشته که یادش بخیر مقرون باد
روا نداشت در اهلاک شیوهٔ تعجیل
لطیفه‌ای کنم از قول شاعری تضمین
که در لطیفه مراو را کسی نبود عدیل
''اگر خدای بداند که زنده‌ای تو هنوز
هزار مشت زند بر دهان عزرائیل،،

قطعه ۱۸

چون الف بیگ درکهن سالی پسری یافت سر بسر غمزه
نام او ''همزه بیگ،، کرد بلی الف منحنی بود همزه

قطعه ۱۹

دارم بجهان گربهٔ پاکیزه‌نهادی
کز بال پریزاد بود موج رم او

سرمست ادا چون بزمین باز خرامد
از خاک دمد غنچه ز نقش قدم او

چون صورت آیینه ز افراط لطافت
آید بنظر بچهٔ او از شکم او

هر شیر ژیانی که ببینی بنیستان
دارد سر دریوزهٔ غرش ز دم او

گر جانوری مرده ببیند سر راهی
از پاکی طینت نخورد غیر غم او

هر بچه که گنجشک بوی باز سپارد
در پرورش او نخورد جز قسم او

آری بود از غیرت انداز خرامش
بر کبک و تدرو است اگر خود ستم او

رخشنده ادیم تنش از لطف زبانش
گویی باثر تاب سهیل است نم او

جوش گل و بالیدگی موجهٔ رنگ است
دم لابه کنان آمدن دمبدم او

در عربده چون بند ز دم باز کشاید
لرزد شکن طرهٔ خوبان ز خم او

تا مهره کش صفحهٔ افلاک بود مهر
بادا کف دست من و پشت شکم او

قطعه ۲۰

ای که شایستهٔ آنی که ترا جم و فغفور و سکندر گویم
چون نداری سر شاهی ناچار حاکم و والی و داور گویم
گفته‌ام مدح تو زین پیش و کنون خواهم از گفته نکوتر گویم
باید امسال که چون پار و پرار سخن غیر مکرر گویم
جلوهٔ روی دل‌افروز ترا مهر یا ماه منور گویم
لمعهٔ قهر جهان‌سوز ترا برق یا شعلهٔ آذر گویم
لیک غم سخت گرفتست مرا غم نگویم دم اژدر گویم
زان نیارم که باندازهٔ شوق مدح نواب گورنر گویم
جای آنست که چون غمزدگان غم دل پیش تو یکسر گویم
گه ز بیمهری گردون نالم گه ز ناسازی اختر گویم
چون تو دانی که چه حالست مرا از ادب نیست که دیگر گویم
گویم این سال مبارک بادت وین دو صد سال برابر گویم

قطعه ۲۱

هوا عبیرفشانست و ابر گوهربار
جلوس گل بسریر چمن مبارکباد!

رباب نغمه‌نواز است و نی ترانه‌فروش
خروش زمزمه در انجمن مبارکباد
ببزم نغمهٔ چنگ و رباب ارزانی
بباغ جلوهٔ سرو و سمن مبارکباد!
ز شمعها که بکاشانهٔ کمال برند
فروغ طالع ارباب فن مبارکباد!
ز باده‌ها که بمیخانهٔ خیال کشند
طلوع نشئهٔ اهل سخن مبارکباد!
فضای آگره جولانگه مسیح دمی است
ز من بهمنفسان وطن مبارکباد!
چه حرف همنفسان ، فرخی ز بخت منست
ز بخت فرخ من ، هم بمن ، مبارکباد!
بمن که خسته و رنجور بوده‌ام عمری
نشاط خاطر و نیروی تن مبارکباد!
هزار بار فزون گفتم و کم است هنوز
گورنری ''بجمس طامسن'' مبارکباد؟

قطعه ۲۲

هر کجا منشور اقبالی پدید آورده‌اند
نام ''مکناٹن'' بهادر زیب عنوان دیده‌ام
در شبستانی که بزم‌آرای عیشش کرده‌اند
زهره را رقاص و کیوان را نگهبان دیده‌ام
هر بساطی کاندران محفل بشب گسترده‌اند
صبح زان محفل کله بر فرق خاقان دیده‌ام
تا مراو را در جهان فرمانروایی داده‌اند
چرخ را از فتنه‌انگیزی پشیمان دیده‌ام

هم ببزم شب‌نشینان بساط عشرتش
مهر را پروانهٔ شمع شبستان دیده‌ام

هم بجمع صبح‌خیزان دعای دولتش
آسمان را از کواکب سبحه گردان دیده‌ام

هم بخلقش ، پیشوای مهرورزان گفته‌ام
هم بدینش ، رهنمای حق‌پرستان دیده‌ام

کارگاه دولتش را عالم‌آرا خوانده‌ام
شاخسار همتش را میوه‌افشان دیده‌ام

سایه‌اش را طیلسان مشتری دانسته‌ام
پایه‌اش را گوشهٔ دیهیم کیوان دیده‌ام

حرف من شیرین که با وی درمیان آورده‌ام
چشم من روشن که رویش بامدادان دیده‌ام

داورا امیدگاها! من که اندر عمر خویش
سختی و بیمهری از گردون فراوان دیده‌ام

آن اسیر تیره‌روزستم که عمری در جهان
آفتاب از روزن دیوار زندان دیده‌ام

لاغرم زانسان که هرگه موج بیتابی زده‌است
دل ز پهلو چون می از مینا نمایان دیده‌ام

هر نفس پیچد ز وحشت دود سودا در سرم
بسکه در شبهای غم خواب پریشان دیده‌ام

بعد عمری کاین چنین بگزشت در پایان عمر
از تو نیروی دل و آسایش جان دیده‌ام

مدتی خون کرده‌ام دلرا ز درد بیکسی
کز تو چشم التفات و روی درمان دیده‌ام

با تو میگویم مثالی زان که در عالم ترا
مدعایاب و ادافهم و سخندان دیده‌ام

در پریشانی بدان مانم که گویی پیش ازین
خویش را سرگشته درکوه و بیابان دیده‌ام

تند بادی میوزیده‌است اندران وادی کزو
خویشتن را دمبدم چون بید لرزان دیده‌ام

وندران[۱] صحرانوردیها بشبهای سیاه
رخت‌خواب راحت از خار مغیلان دیده‌ام

با تو پیوستن چنان دانم که ناگاهان براه
چشمه‌سار و سبزه‌زار و باغ و بستان دیده‌ام

باچنین بختی که من دارم عجب دارم که من
خویشتن را مستحق لطف و احسان دیده‌ام

وهم مستولیست برمن وین چرا نبود که من
خود چه نومیدی ز گردشهای دوران دیده‌ام

یک دو پرسش دارم و از لعل گوهربار تو
آرزو را تشنه‌کام پاسخ آن دیده‌ام

عقدهٔ خاطر همانا بر تو خواهم عرضه داد
چون کشایش بی تو مشکل وز تو آسان دیده‌ام

از لبت فیض دم عیسیٰ اگر جویم رواست
زانکه رشح خامه‌ات را آب حیوان دیده‌ام

زآستینت گنج گوهر گر طمع دارم بجاست
زانکه دستت را بریزش ابر نیسان دیده‌ام

گر نهادم دل ببخششهای ظاهر جرم نیست
کز تو گوناگون نوازشهای پنهان دیده‌ام

۱- طبع دهلی ''اندران،،

ور نمودم با تو در خواهش فضولی عیب نیست
خویش را بر خوان افضال تو مهمان دیده‌ام
شادمان باش ای که در عهدتو دادم داده‌اند
جاودان زی کز تو کار خود بسامان دیده‌ام

قطعه ۲۳

ایا محیط فضائل که تا تو در نظری
نظر بشوکت دارا و کیقبادم نیست
بدیده سرمه کشم از سواد نامهٔ تو
اگرچه دیده شناسای آن سوادم نیست
تو اصل دانش و دانسته‌ای که از نه سال
همیتپم بتمنای داد و دادم نیست
بصدر میرود این بازپرس ، بسم الله
همین مراد منست و جز این مرادم نیست
هزار شیوهٔ گفتار و یک قبولم نی
هزار بستگی کار و یک کشادم نیست
تو کردی و تو کنی کارم اعتقاد اینست
بکارسازی بخت خود اعتقادم نیست
رسیدمی و بپای تو سودمی سر عجز
بضاعت سفر و دستگاه زادم نیست
مفید مطلب من هر کتابتی که بود
تو جمع کن که بساز آن میانه یادم نیست
امید لطف تو دل میدهد ، بدین شادم
وگرنه تاب صبوری ازین زیادم نیست
بذوق قرب زمان مراد بیتابم
وگرنه شورش تعجیل در نهادم نیست

بنیم روز بلندن رساندمی زورق
ولی چه چاره که فرمان بر آب و بادم نیست

بالتفات تو صد گونه اعتمادم هست
ولی شتاب که بر عمر اعتمادم نیست

قطعه ۲۴

ایا خجسته‌خصالی که رزق عالم را
کف تو تا بقیامت کفیل خواهدبود

بپشت گرمی لطف تو هر کجا که روم
طرب رفیق و سعادت دلیل خواهدبود

بخدمت تو پی عرض حال بیکسیم
خیال بیکسی من وکیل خواهدبود

قطعه ۲۵

ای نیلگون حصار فلک یادگار تو
وی بارگاه تو ز حوادث حصار من

ای نوبهار باغ جهان گرد راه تو
وی گرد راه تو، بجهان نوبهار من

ای در ثنای خاطر معنی‌گزین تو
پویان بفرق خامهٔ معنی‌نگار من

وی بر توقع نگه حق‌شناس تو
نازان ببخت خویش دل حق‌گزار[1] من

ای برده گرد راه تو در معرض خرام
مشک و عبیر هدیه بجیب و کنار من

۱- طبع لکهنؤ ''گذار''

ای [1]داده تاب روی تو در موقف سوال
از ماه و مهر مژده بلبل و نهار من

ای طرهٔ تو هندوی روی نکوی تو
وی دامن تو قبلهٔ مشت غبار من

رویت بیاض صفحه‌نگار یمین تو
مویت سواد نامه‌نویس یسار من

مهر تو در حیات بهار بساط من
داغت پس از وفات چراغ مزار من

فصل بهار شعله ز رویت نهاد من
لوح طلسم دود ز خویت دمار من

از تو که داد از تو و از روی و موی تو
از من که وای بر من و بر روزگار من

از دسته دسته سنبل و گل رختخواب تو
وز پشته پشته دود و شرر پود و تار من

نواب ذوالفقار[2] بهادر که بوده‌است
یاد تو در مصاف فلک ذوالفقار من

دانی که در فراق تو ای رشک مهر و ماه!
روزم سیه‌تر است ز شبهای تار من!

۱- کلیات طبع لکھنؤ ''وی داده تاب،،

۲- نواب ذوالفقار الدولہ بہادر نواب باندہ ، دھلی اردو اخبار ، کی اشاعت یکم جون ۱۸۵۱ء یکشنبہ ۲۹-رجب ۱۲۶۷ھ یکشنبہ میں ہے ''۱۷- مئی کو نواب صاحب کا لاشہ باندے سے آگرے آیا اور ہاتھی' گھوڑوں ' پانسو آدمیوں کے ساتھ خواجہ صا ب لایا جا رہا ہے،، ۔ (امتیاز علی خان عرشی)

آلوده دامنت نکند روز بازپرس
در خون طپیدن[1] دل امیدوار من
خم خم شراب عربده داری دگر چراست؟
خاطر شکستن و نشکستن خمار من
خود در هوای نامهٔ ناز تو بوده‌است
گنجینه پاشی، کف گوهرشمار من
ای صد هزار فصل ربیعی نثار تو!
وی بی شمار مرگ طبیعی دوچار من!
ای از خیال و وهم فزون اختیار تو
وی از شمار خلق برون اضطرار من
آرم باستعاره دو مصرع ز اوستاد
گرد سر تو زندگی مستعار من
"یادم نمیکنی و ز یادم نمیروی
عمرت دراز باد فراموش‌کار من"
باید نگاه داشتن اندازهٔ ادب
کوته کنم سخن، نه فضولیست کار من

قطعه ۲۶

مرا در بیخودی نظاره‌گاهیست تعالیٰ شانه الله اکبر
نه باغستی که در پهناش بینی گل و ریحان و شمشاد و صنوبر
محبت نام، نورانی بنایی است ز سیمای نکویان دلکشاتر
فضایی در وی از فیض الٰهی بساطی در وی از مهر پیمبر
فضایش را صباحی جلوه‌پالا بساطش را نسیمی روح‌پرور
صباحش چون دل عارف منزه نسیمش چون دل غالب معنبر
نسیمش رنگ و بوی هشت گلشن صباحش آبروی هفت کشور

۱- کلیات طبع لکهنؤ: "تپیدن دل"۔

نسیمش چون دم عیسی روان‌بخش صباحش چون کف موسی منور
صباحش را سرشت از غازهٔ حور نسیمش را نهاد از موج کوثر
صباحش را شهودی در مقابل نسیمش را بهشتی در برابر
دم صبحش ز مهر آیینه در کف نسیمش از بهاران حله در بر
دم صبحش بفیروزی مشخص نسیمش در دل‌افروزی مصور
دم صبحش ''ضیاءالدین احمد،، نسیمش ''ذوالفقار الدین حیدر،،

قطعه ۲۷

آن پسندیده خوی ، عارف نام که رخش شمع دودمان منست
از نشاط نگارش نامش خامه رقاص در بنان منست
آنکه در بزم قرب و خلوت انس غم‌گسار مزاجدان منست
زور بازوی کامرانی من راحت روح ناتوان منست
همنفس گشته در ستایش من بمسیحا که مدح خوان منست
بتولا فدای نام علی است چون نباشد چنین که جان منست
هم بروی تو مائلم ، مائل کاین گل باغ و بوستان منست
هم ز کلک تو خوشدلم ، خوشدل کان نهال ثمرفشان منست
سود سرمایهٔ کمال منی سخنت گنج شایگان منست
جای دارد که خویش را نازی که ظهور تو در زمان منست
جای دارد که خویش را نازم که فلانی ز پیروان منست
بیقین دان که غیر من نبود گر نظیر تو در گمان منست
جاودان باش! ای که در گیتی سخنت عمر جاودان منست
ای که میراث‌خوار من باشی اندر اردو که آن زبان منست
ارمغانی ز مبدأ فیاض باد آن تو هرچه آن منست

قطعه ۲۸

ای کلک تو در معرض تحریر گهرپاش
وی تیغ تو در موقف پیکار سرافشان

ای کوی تو چون عرصهٔ گلزار فرح‌بخش
وی دست تو چون پنجهٔ [1] خرشید زرافشان

ای بوی تو بر مغز صبا غالیه‌پیما
وی خشم تو در پیرهن جان شررافشان

در رزمگه از بیم تو صفها متزلزل
در بزمگه از جود تو کفها گهرافشان

در محکمه از عدل تو جانها طرب‌آباد
بر مایده از فیض تو لبها شکرافشان

در شوق تو باخویش کنم عهد که هان دل
چندان که توانی بطلب بال و پر افشان

در هجر تو بر دیده زنم بانگ که هان چشم
گر خون نبود از مژه لخت جگر افشان

آیا چه شد آن هدیه که بردی دلم از دست
باری چه شد آن نخل که بودی ثمرافشان

جاوید بمان تازه و چون نخل بهاری
چندان که ثمر بیش رسد بیشتر افشان

هم بوی نشاط از گل ذوق سخن انگیز
هم گرد کساد از رخ جنس هنر افشان

قطعه ۲۹

ای که والایی متاع سخن میتوانی که در نظر سنجی
گنج قارون رود بپاسنگی هر کرا پایهٔ هنر سنجی
پایهٔ فضل من گرایش تست بس بود گر خود اینقدر سنجی
دانیم بیش ازین گرانمایه بار احسان خویش گر سنجی
بو که از ساز نطق زمزمه‌ای بنواسازی اثر سنجی

۱- طبع لکهنؤ ''خورشید،،

این نخواهم که در ستایش خویش پیکرم را بسیم و زر سنجی
بر خریدار عرضه ده گهرم تا برم سود در گهرسنجی

قطعه[۱] ۳۰

''جان جا کوب بهادر،، که ز یزدان دارد
خوبی خوی و فروزندگی جوهر رای
طالعش حوت بود تا بنظرگاه کمال
مشتری سوی سعادت بودش راه‌نمای
بحمل مهر درخشان و عطارد با وی
چون دبیری که بود پیش شهنشاه بپای
بسوم خانه که ثور است مه و زهره و راس
آن یکی در شرف خویش و دگر خانه‌خدای
بنهم خانه ذنب عقده‌طراز و برجیس
بقوی‌پنجگی از کار ذنب عقده‌کشای
دلو کان زایل ساقط بود از روی حساب
کرده‌مریخ و زحل هر دو دران زاویه جای
مهر در ساقط مایل شده تمثال‌طراز
ماه در زایل ناظر شده آیینه‌زدای
هر دو نیر ز شرف یافته اقبال قبول
هر دو کوکب ز خوشی آمده اندوه ربای
زهره و ماه بهم فرخ و فرخ‌تر ازان
که شود راس بدین فرخی اندازه‌فزای
ماه و ناهید بتسدیس بطالع نگران
زده برجیس بتثلیث دم مهرگرای

۱- طبع نول کشور میں اس قطعے سے پہلے نواب یوسف علی خان کے لیے قطعۂ تہنیت اور اس کے بعد اڈمنسٹن کی تعریف ہے ، پھر یہ قطعہ ۳۳

نظر کلفت تحسین ز طالع ساقط
چشم بد دور ازین طالع عالم‌آرای
آن که این اختر مسعود نگارد غالب[۱]
بهر تحریر مداد آورد از ظل ہمای

در[۱] تہنیت عطای ملک از جانب سرکار انگریزی بحضرت فلک رفعت، نواب یوسف علی خان بہادر، فرمان روای رام پور

قطعه[۲] ۳۱

ای آنکه خود بمہر ہمیپروری مرا
از غیب مزد کار تو اجر عظیم باد!
رای تو در زمانه بامضای کارہا
با اہتمام سہم سعادت سہیم باد!
در صبح دولت تو ز گلہای رنگ رنگ
دائم مشام دہر رہین شمیم باد!

۱- دیوان طبع دہلی میں اس کے بعد قطعات تاریخ ہیں لیکن کلیات میں کچھ قطعات کا اضافہ ہے ۔ ہم پہلے کلیات کے قطعات نقل کرتے ہیں پھر قطعات تاریخ ۔

۲- یہ قطعه طبع دہلی میں نہیں ہے ، طبع نول کشور میں اس کا نمبر ۳۰ ہے اور صفحہ۲٦ سطر ٦ سے شروع ہو کر صفحہ۲۷ سطر ۷ پرختم ہوتا ہے۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ ۲۵-نومبر ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل کی طرف سے ایک خط لکھا گیا جس کی رو سے ''پرگنہ' کاشی پور ضلع مراد آباد جس کی جمع ایک لاکھ چار ہزار چار سو روپے سالانہ ہے معافی میں بخشا،، صفحہ ۲۴ ، مکاتیب غالب طبع اول -یہ قطعہ اسی موقع پر کہا گیا، لیکن تاریخ کی تعیین اس لیے نہ ہوسکی کہ قطعہ شامل مثل نہیں ہے۔

آن دم که مرده را باثر زنده ساختی
در باغ طالع تو بجای شمیم باد!

پاشند آب گر برهت بهر دفع گرد
هر قطره زان نمونهٔ در یتیم باد!

هر صیغه‌ای که وضع وی از بهر امر تست
فارغ ز ننگ زحمت تقدیم میم باد!

گر بهر خویش نیز دعایی کنم، چه باک
این نغمه هم گزیدهٔ طبع سلیم باد!

آزاده‌ام ، خلوص وفا شیوهٔ منست
راهم ورای مسلک امید و بیم باد!

چون رهروی که بر نمط جاده ره رود
پیوسته سیر من بخط مستقیم باد!

مانند فکر من ، رخ بخت تو دل‌فروز
مانند کلک من ، دل دشمن دو نیم باد!

پابستهٔ زمان و مکان نیست دردمند
گر خود رود بکعبه برین در مقیم باد!

شادم بکنج امن و نگویم که بنده را
خشتی ز زر خالص و خشتی ز سیم باد

مقصود از لباس ، همان پوشش تنست
پوشش گر از حریر نباشد ، گلیم باد

بالجمله این سه بیت که سرجوش فکر تست
درخورد لطف خاص و عطای عمیم باد

نواب مهر مهر ، منوچهر چهر را
حاصل جمال یوسف و قرب کلیم باد

چون غنچه ای که پهلو گل بشگفد بباغ
ملک جدید شامل ملک قدیم باد

هر دم ترا بخلوت راز و ببزم انس
روح الامین مصاحب و غالب ندیم باد

قطعه[۱] ۳۲

فرزانهٔ یگانه ، اڈمنسٹن بهادر
کآموخت دانش ازوی آیین کاردانی

در محفل نشاطش ، زهره بنغمه‌سنجی
هر گوشهٔ رباطش ، کیوان بپاسبانی

ای شمع بزم صورت، روی تو در فروزش
وی موج بحر معنی ، رای تو در روانی

دانم که میشناسی کاندر قلمرو هند
کس در سخن ندارد چون من گهرفشانی

از غم چنان ستوهم کاینک نماند با من
تاب سخن‌طرازی ، نیروی مدح‌خوانی

اکنون در آتش غم، با داغ همنشینم
در نطق بود زین پیش با شعله همزبانی

سوزان چو شمع بودن دانی که میتوانم
داغ از دلم زدودن، دانم که میتوانی

در آتشم بیفگن تا سر بسر بسوزم
گر خود نمیگرایی کاین را فرونشانی

از حضرت شهنشه خاطرنشان من بود
در مزد مدح‌سنجی صد گونه کامرانی

---

۱ - ''قطعه ۳۱''—صفحه ۲۷ سطر ۸

ناگه ز تند بادی کان خاست در قلمرو
برهم زد آن بنا را نیرنگ آسمانی

در وقت فتنه بودم غمگین و بود با من
زاری و بینوایی پیری و ناتوانی

حاشا که بوده‌باشم باغی بآشکارا
حاشا که کرده‌باشم ترک وفا نهانی

از تهمتی که بر من بستند بدسگالان
حکام راست با من یک گونه سرگرانی

در پیریم ازین غم جز مرگ چاره نبود
خود پیر گشتمی من بودی اگر جوانی

دارم شگرف حالی از مرگ و زیست بیرون
جان گرچه هست شیرین، تلخست زندگانی

رونق‌فزای ملکی در معدلت‌طرازی
امیدگاه خلقی در منفعت‌رسانی

زان پس که از تو در دل نومید گشته‌باشم
هیچ آرزو ندارم جز مرگ ناگهانی

قطعهٔ ۳۳[۱]

ای خداوند هنرمند هنرورپرور
مهردیدار، فلک‌مرتبه، سیسل بیڈن

هرچه از جاه فریدون شمری تا هوشنگ
هرچه از شوکت کسریٰ نگری تا بهمن

شود این تذکره چون حرف مکرر بیکار
رود آنجا که ز فرتاب شکوه تو سخن

۱- کلیات طبع لکهنؤ ''قطعه ۳۲''، نه شعر دارد، دیوان طبع دهلی خالی ازآنها۔

بامید توام از یاری اختر فارغ
در پناه توام از گردش گردون ایمن
مسکن من بجهان صورت مدفن دارد
بزمین بسکه فروبرد مرا بار محن
آن کرم پیشه ''پرنسب،، دگر آن ''استر لنگ،،
آن ''جمس تامسن،، و ''ماڈک،، و جی مکناٹن،،
همه را بود بدین خسته‌جگر ، در هر وقت
خواندن از رافت و از راه کرم پرسیدن
حیف باشد که ز الطاف تو باشد محروم
هم چو من بندهٔ دیرین و نمکخوار کهن
نالم از غم که نه شایسته و درخور باشد
خاص در عهد تو ، ناکامی و نومیدی من

قطعه ۳۴

ایا ، بکوشش و بخشش رئیس ملت و ملک
ایا ، بدانش و بینش مدار دولت و دین
غبار راه ترا آفتاب ذره‌نشان
لواء[۱] جاه ترا روزگار سایه‌نشین
بداستان تو شه در سپاس رانده زبان
بر آستان تو مه در سجود سوده جبین
هم از روانی حکم تو در دل اندیشم
که خاتم تو ز الماس تیغ داشت نگین
هم از بلندی جاه تو در نظر دارم
که منظر تو ز سطح سپهر یافت زمین

۱- طبع لکهنؤ ''لوای،،

کشاده لب باماں چرخ تا کشیده کماں
کشیده رخت بخون فتنه تا کشاده کمین

پس از ثنای تو دارم سر ستایش خویش
سخن‌شناس چناں و سخن‌سرای چنین

منم بدهر که پیش از وجود لوح و قلم
بخامه شیوهٔ تحریر کرده‌ام تلقین

قلم ز نسبت دستم نهال روضهٔ خلد
ورق ز صنعت کلکم نگارخانهٔ چین

دلم خزینهٔ راز دو عالم است ولی
ز بیزبانی خویشم بگنج راز امین

نبشته‌ام بثنای شه ستاره‌سپاه
قصیده‌ای که ز خوبی بود بدان آیین

که گر بشاه دهی ، شه گماں کند که وزیر
بروی تخت فروریخت زآستین پروین

قصیده‌ای که گرش بر گذشتگاں خوانند
ز همفنان نوآیین ترانهٔ پیشین

کمال را بعناد از نفس چکد زهراب
ظهیر را ز حسد در جگر خلد ژوپین

چه خوش بود که بری پیش شاه عرضه دهی
که اینت پیشکش شاه سلک در ثمین

حریص بخشش شاهم ، ولی پس از انصاف
نوازش صله خواهم، ولی پس از تحسین

امید جائزه و چشم آفرین دارم
ز بادشاه سخن رس، هم آن خوش است و هم این

سخن دراز شد این پرده تا کجا سنجم
گرفتم آن که دل از کف برد نوای حزین
دگر ز بہر بقای تو و سلامت شاه
ز من نوای دعای و ز روزگار آمین

قطعہ[۱] ۳۵

بہار در چمن انداز گلفشانی کرد
بشاخ نخل تمنا ثمر، مبارک باد

زمانه بزم طرب را ز انجم آیین بست
طلوع مہر و فروغ سحر، مبارک باد

عروس ملک بآرایش دوام جہاں
بشاهزادهٔ فرخ گہر، مبارک باد

بپور شاه "جوان بخت" در سلامت شاه
نشاط فتح و نوید ظفر، مبارک باد

دگر بشہر جنیبت کشان موکب خاص
زدند گل بسر رہ گزر، مبارک باد

شه فرشته سپه شد سوار، نیست عجب
که بشنوند ز دیوار و در، مبارک باد

۱- قطعه نمبر ۳۵، طبع لکھنؤ—عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ اردو اخبار اشاعت ۱۱-اپریل ۱۸۵۲ء مطابق ۲۰-جمادی الآخرہ ۱۲۶۸ھ میں ہے "۲۷-مارچ سال حال کو ساچق مرشد زادۂ آفاق مرزا جوان بخت بہادر کی گئی، ۳۱-مارچ کو حنابندی اور یکم ماہ حال کو برات اور دوسری کو وداع عروس—جہیز وغیرہ از طرف ولی داد خان بہادر بھی زائد از متخیلۂ خاص و عام نمایاں ہوا۔ اس موقع پر مرزا نے یہ قطعہ لکھا جو اخبار مذکور میں شائع ہوا۔

غبار راه‌گزر سرمهٔ سلیمانیست
صفای آینه‌های نظر، مبارک باد

صلای عام تماشای جشن جمشیدی
بعهد خسرو جمشیدفر، مبارک باد

نه اهل شهر رضاجوی شهریار خود اند؟
بلی، بیک دگر از یک دگر، مبارک باد

بمن که از ستم چرخ تیزگرد مرا
کمست ساز طرب، بیشتر، مبارک باد

بروی چتر ز بالا همیفشاند مشک
ببوی گل ز هوا بال و پر مبارک باد

بدیده بینش و بینش بجلوه کام رواست
بقای پادشه دیده‌ور، مبارک باد

عطای شاه بنزدیک و دور یکسانست
ازین نشاط بدوران خبر، مبارک باد

چو شد نثار شهنشه، قبول دیگر یافت
بمهر ارزش لعل و گهر، مبارک باد

بپادشه نظر انجم و بانجم چرخ
شمار کثرت ذوق نظر، مبارک باد

هر آنچه در دو جهان دستمایهٔ ناز است
بقبلهٔ دو جهان، "بوظفر"، مبارک باد

لواء و پرچم و اورنگ و چاربالش ناز
نگین و تیغ و کلاه و کمر، مبارک باد

دگر خطاب زمین‌بوس مالد از تیغش
شرف بغالب آشفته‌سر مبارک باد

بلندنام ، جہان‌داورا! بہفت اقلیم
طراز سکۂ نامت بزر مبارک باد

ترا بقا و بقا را سعادت ارزانی
مرا دعا و دعا را اثر مبارک باد

قطعہ ۳۶

در تہنیت شادی[1]

دیدہ‌ور یوسف علی خان کز فروغ رای او
مہر تابان برد قسط فیض و من ہم یافتم

از ولی‌عہدش سخن رانم که چون ماہ منیر
طلعتش را دیدہ‌روشن‌ساز عالم یافتم

وان دگر فرزانه فرزند فرہمندش که ہست
کوکبی کش در دل‌افروزی مسلم یافتم

خواست تا سازد بآیین بہینش کدخدا
شاد گشتم چون خبر زین جشن اعظم یافتم

بہرہ بردم در تصور زان ہمایون انجمن
بسکه در خود طاقت رنج سفر کم یافتم

بزم طوی فرخ ''حیدر علی خان،، را بدہر
خوشتر و خرم‌تر از بزم کی و جم یافتم

۱- قطعہ ۳۶، طبع اول لکھنؤ۔
صاحبزادہ سید حیدر علی خان ، نواب یوسف علی خان کے منجھلے بیٹے کی شادی ۱۷-ذی حجہ ۱۲۷۷ھ ۲۷-جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی تھی ، نواب صاحب نے اس سلسلے میں مرزا کو بھی دعوت دی تھی ، لیکن مرزا نہ جا سکے ، نواب صاحب نے تورہ و خلعت بھیجا ، مرزا نے یہ قطعے شکریے میں ارسال کیے ۔ مکاتیب طبع اول حاشیہ ص ۲۹

سال این دولت‌فزا شادی بامعان نظر
مشتری با زهره در طالع فراهم یافتم[1]

قطعه ۳۷

هم در تهنیت این شادی

بهار هند که نامند برشگال آن را
پس از دو سال باهل جهان مبارک باد

بباغ و کشت و بیابان و کوه سر تا سر
سحاب و سبزه و آب روان مبارک باد

گزشت عهد سموم و وزید باد خنک
ز جان بتن، دگر از تن بجان مبارک باد

اگرچه رحمت عامست ، لیک بالتخصیص
برام پور ، کران تا کران ، مبارک باد

ز برگ برگ نیستان که گرد آن شهراست
رسد بگوش چنان کز زبان مبارک باد

ز انبساط پر است آن چنان که از رگ ابر
بجای قطره تراود همان مبارک باد

سپس بداد گرایم که اهل دانش را
شود هر آینه خاطرنشان مبارک باد

خود ابر و باد بگیتی ز دهر باز نبود
عطیه‌ایست که بر همگنان ، مبارک باد

معاف باشم اگر خود ز خویشتن پرسم
برام‌پور خصوصاً چسان مبارک باد

۱- مشتری ، زهره اور طالع کے اعداد جمع کرنے سے ۱۲۷۷ شادی کا سنہ مستخرج ہوتا ہے - ۱۲ فاضل

چو رام‌پور بود وجه تازه‌رویی دهر
ز هرچه این همه گل کرد آن مبارک باد

ز فیض همت فرمان‌روای آن شهراست
که ورد خلق بود هر زمان مبارک باد

ظهور میمنت کتخدایی فرزند
بر آن رئیس سپهرآستان مبارک باد

که میهمان حق است آن و ما طفیلی او
نزول مائده بر میهمان مبارک باد

بجیب و دامن مردم ز بخشش نواب
متاع خاصهٔ دریا و کان مبارک باد

کشایش در گنجینه وانگه از در گنج
بدر شتافتن پاسبان مبارک باد

بطالبان زر و سیم ، سیم و زر فرخ
بسائلان تهی‌کاسه نان مبارک باد

بمن که تشنه‌لب باده‌های پرزورم
ازآن میان ، دوسه رطل گران ، مبارک‌باد

مگو ز شادی اهل زمین که میگویند
فرشتگان بلند آسمان مبارک باد

بدین ترانه که هان ای امیر شاه‌نشان
نوید فرخی جاودان مبارک باد

ازآن جهت که ستایش‌نگار نوابی
ترا هم ای اسد الله خان مبارک باد

قطعه۱ ۳۸

جم‌حشم شاهزاده فتح‌الملک
مرحبا طالع مظفر تو

خود ظفر بی‌تو ناتمام بود
گرچه جزویست از ظفر فر تو

ای که از روی نسبت ازلی
درخور افسر است گوهر تو

نه ز تقصیر ، بلکه از ادبست
افسر ، ارجا نکرد بر سر تو

نه ز تعطیل ، بلکه از خوبیست
مملکت گر نشد مسخر تو

بادشاه قلمرو نازی
کله کج خوش است افسر تو

مرزبان ممالک حسنی
ملک دلها بس است کشور تو

هم فلک را نباشد این رفعت
کش توان گفت طرف منظر تو

هم زمین را نباشد این وسعت
که شود خیمه‌گاه لشکر تو

این که پنداشتی فلک ، نبود
جز غبار رم تگاور تو

۱- شہزادہ غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو ، مخاطب بہ فتح الملک ابن بہادر شاہ متوفی ۱۰-جولائی ۱۸۵۶ء کی مدح ہے اور اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۰ء یا اس سے کچھ پہلے کہے گئے ہیں -

وین که دانسته ای زمین نبود
جز فضای فراخ بر در تو

ای که باشد فروغ اختر روز
لمعه ای از فروغ اختر تو

آفتابی و شیر مرکب تست
آسمانی و جبهه نیر تو

مهر و مه صرف آب و گل کردند
تا بیاراستند پیکر تو

نرسد تا ز چشم زخم گزند
گشت انجم سپند مجمر تو

رنگ بازد ز بس نکورویی
لاله در پیش ورد احمر تو

بالد از بس بلندبالایی
سرو در سایهٔ صنوبر تو

بندد از برگ بوی گل احرام
در هوای طواف بستر تو

آورد خط بندگی ریحان
پیشگاه خط معنبر تو

ای که باشد خط غلامی من
نام آبای من بدفتر تو

پیش ازین گرچه زاقتضای قضا
بنده را ره نبود بر در تو

میشمردم ولی ز روی شمار
خویش را زله خوار و چاکر تو

خستهٔ دهرم و بود بسخن
دم من تیزتر ز خنجر تو
نیست در بذله کس قرینهٔ من
نیست در بذل کس برابر تو
ابری و جوی خضر رشحهٔ تو
تیغی و فتح ملک جوهر تو
غالب می‌کشم، نه گستاخی ست
گر کنم عرض مدعا بر تو
چشم دارم عطیهٔ تحسین
از لب لعل روح‌پرور تو
تشنهٔ باده‌ام تکلف چیست
بنمی قانعم ز کوثر تو
رند و آزاده‌ام چرا نخورم
باده از دست فیض‌گستر تو
آن کرم کن که در جهان خراب
تا زیم می خورم ز ساغر تو
خوش بود گر بجرعه‌ای باشم
هم دعاگوی و هم ثناگر تو
لطف خاص تو باد یاور من
ایزد پاک باد یاور تو

قطعه ۳۹

در ثنای ,,معظم الدوله[۱]،،
عقل فعال همزبان منست

۱- معظم الدوله سے مراد مٹکاف، ریزیڈنٹ دهلی هیں۔ دیکھیے حاشیهٔ آینده۔

منش امیدگاه خود سنجم
عقل سنجد که قدردان منست

من خداوند خویشتن گویم
عقل گوید خدایگان منست

عقل گوید، نعم، اگر گویم
آستان وی آسمان منست

گویم ''آری،، اگر خرد گوید
رای وی شمع دودمان منست

در هنر من ثناگر عقلم
در سخن عقل مدح‌خوان منست

من ز خودرفتهٔ رسائی عقل
عقل دل‌دادهٔ بیان منست

هان و هان گرچه عقل دوراندیش
در ره مدح همعنان منست

لیکن از روی رشک همسخنی
محو سود خود و زیان منست

من عیار خرد همیگویم
عقل در بند امتحان منست

هرچه از غیب در دلم ریزند
عقل گوید که هم آزان منست

هرچه دانش ز خامه انگیزد
گویم آوردهٔ بنان منست

من سخن گوی و عقل گرم نزاع
کاین متاعیست کز دکان منست

عقل اندیشه‌زای و من بفغان
کاین حدیثیست کز زبان منست

غالبا ، گر بحضرت نواب
گفتمی قطعه ارمغان منست

عقل هر مصرع مرا بگزاف
گفتی ، این ناوک از کمان منست

لاجرم مهر بر ورق زده‌ام
خود همین نام من نشان منست

قطعه ۴۰[۱]

در فتح پنجاب

چون بر هزار و هشتصد و چل‌فزود شش
نو شد شمار سال درین کاخ ششدری

ناگه درین زمانهٔ فرخ که آفتاب
در دلو جای داشت بتربیع مشتری

روزی که بست و هفتم ماه گزشته بود
وان بود چار شنبهٔ آخر ز جنوری

دشتی که بر کنارهٔ دریای ستلج است
گردید جلوه‌گاه دو سد سکندری

۱- طبع اول نول کشور "قطعه ۴۰" اکیس شعر هیں -

۱۷-نومبر ۱۸۴۵ء سے انگریزوں اور سکھوں میں جنگ شروع ہوئی ، ۲۸-فروری ۱۸۴۶ء کو انگریزوں نے لاهور پر قبضه کیا ، لیکن ۱۳-جنوری ۱۸۴۹ء کو جلیانواله میں اور ۲۱-فروری کو گجرات مین معرکه هوا ، آخر مولراج نے بهی شکست کهائی ، ۲۹-مارچ ۱۸۴۹ء انگریزوں نے دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب پر مکمل قبضه کر لیا-

بستند از دو سو دو سپه صف بعزم جنگ
بر خویشتن دمیده فسون دلاوری

زین سو بهادران جهان‌جوی نامدار
استاده زیر ظل لوای گورنری

دریاکشان میکدهٔ علم و آگهی
مشائیان قاعدهٔ جاه و سروری

از حق امیدوار بفرخنده‌طالعی
با خلق سازگار ز پاکیزه‌گوهری

زان سو سیه‌دلان کج‌اندیش بدنهاد
در سر فگنده باد خلاف از سبک‌سری

داغ جبین دهر ز ناپاک مشربی
روز سیاه خویشتن از تیره‌اختری

از مغرب آن رسیده بسان سواد شام
از مشرق این دمیده چو خورشید خاوری

دلها ز تاب کینه چنان گرم شد که کرد
هر قطره خون بمجمرهٔ سینه اخگری

دانادلان دادگر انگلنڈ را
بخشیده حق زبسکه بهر شیوه برتری

دارند هم بتیغ‌زنی زور رستمی
دارند هم بکج‌کلهی فر قیصری

بستند راه خصم و شکستند فوج خصم
از روی چیره‌دستی و زور غضنفری

با دشمنان دولت فرماندهان شرق
دولت نکرد همرهی و بخت یاوری

لاهوریان هرزه ستیز گریزپا
کردند در گریز دخانی و صرصری
چل (۴۰) توپ کان بماند بمیدان کارزار
با جان آن گریختگان کرد اژدری
سرهای شان شکسته بچوگان ز بی‌تنی
تنهای شان فتاده بمیدان ز بیسری
عنوان فتحنامهٔ پنجاب بوده‌است
سیهای این فتوح که فتحیست سرسری
این قطعه بین که کرد "اسداللہ‌خان" رقم
روز دو شنبه و دوم ماه فروری

۱۸۴۶ء

قطعه ۴۱

دی بهنگامهٔ هنگام فرو رفتن مهر
روی ابروی نمود از افق چرخ هلال

اندرین روز دل‌افروز بود عید سعید
عید فرخندهٔ فرخ رخ ماه شوال

عید را آینه طلعت سلطان خواهم
تا بدان آینه در بنگرم آثار جمال

نه جمالیکه بود آینه‌ساز رخ و زلف
نه جمالیکه بود نکته‌طراز خط و خال

بی خط و خال جمالیکه بود در اسلوب
مصدر اسم جمیل و متقابل بجلال
مظهر کامل آثار جمال آمده‌است
ذات سلطان فرشته‌فر فرخنده خصال

جامع مرتبهٔ علم و عمل ''فتح الملک''
فخر دین عین یقین عز شرف حسن کمال

گر باندازهٔ سرمایه کند جلوه گری
اندر آیینه هر آیینه نگنجد تمثال

ای ارم در ره همتایی گلزار تو زار
وی زبان در دم گویایی اجلال تو لال!

فتح خود نامزد تست بتوقیع ازل
دیگران راست ز نام تو نوید اقبال

گوی از دودهٔ گستاشپ نبردی شه روم
گر نه در معرکه نام تو همیبرد بفال

زان سیاست که بود عدل ترا در همه جای
زان حراست که بود لطف ترا در همه حال

دم ضیغم زده در کلبهٔ روبه جاروب
چشم شاهین شده در پای کبوتر خلخال

ناز بر خود کند ار خست بتیر تو عقاب
باز برگردد اگر جست ز دام تو غزال

باد را گرد سپاه تو در آرد از پای
ابر را برق سنان تو کشاید قیفال

شه نشانا! بتو صد حرف موجه دارم
کرده ام نظم درین قطعه بوجه اجمال

حیله بهر طلب دایه به از عید کجاست
شوق میگویدم امروز که همچون اطفال

هرچه در دل گزرد خواه ز یزدان بدعا
هرچه ممکن نبود جوی ز سلطان بسوال

خواهم اما نه چو آلوده درونان بفریب
که نمایند همی مشک و فروشند زگال

از تو گیرم بگدائی زر و پاشم بر خلق
گویی از جود تو آموخته‌ام بذل و نوال

فی‌المثل گر بودم دست بگنجینهٔ غیب
چون شوم تشنه ببخشم بدمی آب زلال

هفت گنجینهٔ پرویز نسنجم بدو جو
تشنهٔ بادهٔ نابم ، نه گداپیشهٔ مال

چون‌عطای توبودپاک ز تحریم چه باک
می حرام‌است ولی میخورم از وجه حلال

آنچه میخواهم ازین توطیه دانی چه بود
کنجی از باغ و خمی‌از می و جامی‌زسفال

بسته بر غیر در کلبه و بر نظم طراز
رفته‌از زاویه خاشاک و ز دل گرد ملال

گه‌دران گوشه ز خودرفته و گاهی هشیار
گه دراندیشه غزل سنج و گهی مدح سگال

گه ز اسرار ازل یافته در سینه نشان
گه ز آثار خرد ریخته بر صفحه لآل

تا بود روز بهر سوکه فتد سایه‌بخاک
جا گزینم بکنار چمن و پای نهال

چون شود شام نهم شمع فروزنده بپیش
از درخشندگی جوهر عقل فعال

دارم امید که غالب اگرش عمر بود
هم‌بدین سان گزراند شب‌و روز و مه و سال

جاودان شاه‌نشان باش که‌اندر کف‌تست
دولت دین که بود ایمن از آسیب زوال
دولت و عمر ازان بیش که گنجد بشمار
شوکت و جاه فزون زانکه درآید بخیال

قطعه ۴۲

بر رگ شاه بوسه زد نشتر
آهنین دل ادب نگاه نداشت
لیک دانم که اندرین پرخاش
سر آزار جسم شاه نداشت
آری آهن که اصل شمشیر است
جز کف دست شه پناه نداشت
جزو آن کل که نیشتر باشد
چون محابا ز عز و جاه نداشت
داشت لیکن ز روی رای صواب
در دل اندیشه زین گناه نداشت
در تن شاه تیره خونی بود
وان خود از هیچ سوی راه نداشت
راه واکرد تا فرو ریزد
ره همین بود و اشتباه نداشت
درسخن گر سخن بود، گو باش
نتوان طعنه زد که آه نداشت
همچو مژگان که دم بدم جنبد
هرگز آرام هیچ گاه نداشت
درد دل با زمانه چون میگفت
لب گویای عذرخواه نداشت

در دلم رخ نهفت از تشویر
زین نکوتر گریزگاه نداشت

رفت و با خود گرفت غالب را
چه کند چون دگر گواه نداشت

وای کان خسته خود ز تنگ‌دلی
راه در صحن بارگاه نداشت

پا اگر داشت ، پا نمی جنبید
سر اگر داشت ، سر کلاه نداشت

داشت آهنگ پای‌بوس ولی
طالع مهر و بخت ماه نداشت

قطعه ۴۳

ای که گفتی که در سخن باشد
حاصل جنبش زبان ، گفتن

تا ندانی که راز دل با دوست
جز بگفتن نمی‌توان گفتن

خامه را نیز در گزارش شوق
هست دستی بداستان گفتن

گر قلم ور زبان ترا نه یکیست
این نوشتن شما و آن گفتن

بقلم ساز میدهم گفتار
تا نگنجد درین میان گفتن

زانکه دانم کزین خروش لبم
ریش گردد ز الامان گفتن

مشکل افتاده‌است درد فراق
با مظفر حسین خان گفتن

قطعه ۴۴

بآدم زن بشیطان طوق لعنت
سپردند از ره تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم
گران‌تر آمد از طوق عزازیل

قطعه[۱] ۴۵، بیان چراغاں که در دهلی بباغ بیگم بکمال تجمل و تکلف رونق پذیرفته بود

درین روزگار همایون فرّخ
که گویی بود روزگار چراغان
شده گوش پر نور چون چشم بینا
ز آوازهٔ اشتهار چراغان
مگر شهر دریای نور است کاین جا
نگه گشته هر سو دوچار چراغان
بسر برده بر چرخ مهر منور
همه روز در انتظار چراغان
گواه من اینک خطوط شعاعی
که دارد دلش خارخار چراغان
درین شب روا باشد از چرخ گردان
کند گنج انجم نثار چراغان
نبود است در دهر زین پیش هرگز
بدین روشنی روی کار چراغان

۱- یہ قطعہ دیوان طبع اول دهلی میں اور دستنبو طبع اول میں نہیں ہے۔ غالب نے دستنبو طبع ثانی میں، پھرکلیات طبع اول لکھنؤ میں اس کا اضافہ کیا، طبع لکھنؤ میں اس قطعے کا نمبر ۵۹ اور دستنبو میں صرف ''در روشنی دهلی'' لکھا ہے۔ دونوں نسخے بلا اختلاف ہیں۔

شد از حکم شاهنشه انگلستان
فزون رونق کاروبار چراغان
جهاندار وکٹوریا ، کز فروغش
ز آتش دمد لاله‌زار چراغان
ز عدلش چنان گشته پروانه ایمن
که شد دیدبان حصار چراغان
به فرمان ''سر جان لارنس'' صاحب
شد این شهر آیینه‌دار چراغان
بدهلی فلک رتبه ''ساںڈرس'' صاحب
بر آراست نقش و نگار چراغان
شد از سعی ''ہنری اجرٹن'' بہادر
روان هر طرف جویبار چراغان
سخن‌سنج غالب ز روی عقیدت
دعا میکند در بهار چراغان
که بادا فزون سال عمر شهنشه
بروی زمین از شمار چراغان

[1]قطعه ۴۶ در مدح ویسرای صاحب بہادر

۳

سپهر مرتبه ای ویسرای کشور هند
کز التفات [2] تو دل بشگفد چوگل ز نسیم
بقدر فهم منست این که گفته‌ام ورنه
نوازش تو دمد روح در عظام رمیم

۱- سبد چین میں اس کا عنوان ہے ''قطعه در مدح گورنر صاحب بہادر''
۲- مطابق ابر گہر بار و سبد چین ، لیکن باغ دودر میں '' ز التفات ''۔

ز روی و خوی تو هر دم مدد رسد در بزم
نگاه را بفروغ و مشام را بشمیم

شگفت نیست که نوشیروان و سنجر را
کنی قواعد انصاف گستری تعلیم

تو آن امیر کبیری که در جهانگیری
خدا کلاه ترا داده ارزش دیہیم

رواست سکه بنام تو لیک حرف این است
که ننگ داشته نام تو از سبیکهٔ سیم

ز رافت تو الف دال یافت بعد از شین
بهر کجا که الف نون بود بعد از جیم

پس از خرابی دهلی تو آمدی که دگر
کنی فلک‌زدگان را درین دیار مقیم

سپس بنام تو شهری جدید خواهد بود
نه آنکه شاه جهان ساخت در زمان قدیم

ترا چنانکه توی چون توان ستایش کرد
چه آید از اسدالله خان بجز تسلیم

قطعه ۴۷

بزم نوّاب جم حشم مکلوڈ
بوستانیست پر ز نعمت و ناز

وندران[۱] بزم‌گاه گسترده
اطلس چرخ جای پانداز

در فیضش بسان آئینه
مانده همواره بر رخ همه باز

۱- سبد چین میں ''اندران بزم گه'' ہے۔

سوده از بهر سرفرازی خویش
سروران بر درش جبین نیاز
ما همه بندگان فرمان‌بر
او خداوندگار بنده‌نواز

آمدم تا بپیش وی نالم
از جفای زمانهٔ ناساز
از ادب دم نمی‌توانم زد
با چنین داغهای سینه گداز

آلهٔ ساعتم که در شب و روز
ندهد جز بوقت خویش آواز
چون رسد وقت کار سر تا سر
گویم اما بشیوهٔ ایجاز

مدح بانوی انگلستان است
بر زبان من از زمان دراز
اندرین پایه با من مسکین
نیست در هند هیچ کس انباز

غالبم اسم شعر و نام من است
اسد الله خان مدح‌طراز

قطعه ۴۸ در[1] امیدواری پروانهٔ آفرین

فلک مرتبت منٹگمری بهادر
که در سروری میکنی بادشاهی
ببزم طرب ماه گیتی فروزی
برزم عدو شاه انجم سپاهی

---

۱ - این قطعه در ابر گهر بار نیز هست

بدست تو مفتاح کشورکشائی
بفرق تو دیہیم عالم‌پناہی

ہم از روی معنی سلیمان‌شکوہی
ہم از روی صورت فلک‌بارگاہی

تو ای ماہ تابان بہ پرتو فشانی
تو ای مہر رخشان بزرین کلاہی

بسویم کہ نومیدم از چرخ و انجم
ہر آئینہ بنگر کہ امید گاہی

عجب نیست پیش از اجل گر بمیرم
کہ پیوستہ غم میکند عمرکاہی

فرو مرد بختم بخواب از گرانی
گرو برد روزم ز شب در سیاہی

نبودہ است در ہیچ ہنگام کارم
بغیر از دعا گوئی و خیرخواہی

در آن دم کہ برگشت ہنجار گردون
خرد را نگہداشتم از تباہی

ہمین خوبیٔ نظم من در ستایش
دہد بر وفاداریٔ من گواہی

مہین داورا غالب خستہ‌دل را
گنہ نیست جز دعویٔ بی گناہی

وگر خود گنہگارم ، امیدوارم
کہ آمرزشم از گورنمنٹ خواہی

دما دم فزون باد لطف تو بر من
بدانسان کہ بر تست فضل الہی

قطعهٔ ۴۹ مبارک باد سال نو

در آخر دسمبر و آغاز جنوری
سال‌نو است و روز کلان روزگار را
از من هزار گونه نیایش قبول باد
کشور خدیو ، نامور نامدار را
یا رب! ز روی عین عنایت نگاه‌دار
جم‌رتبه منتگمری والاتبار را
یا رب ! بروز نامهٔ عمر عزیز او
این یک هزار و هشت صد و شصت وچار را
هم بهر وی خجستگی بیشمار بخش
هم بر بقای وی بفزا این شمار را
نشگفت ، گر دهند دبیران دفترش
توقیع لطف غالب امیدوار را

قطعه ۵۰ ، در تهنیت به‌شهزادهٔ فتح الملک

نوروز و مهرگان نبود در طریق ما
اما شگفته روئی گلهای تر خوش است

نوروز عید نیست ، بهارست و در بهار
آئین شادمانی و ذوق نظر خوش است

از باد زمهریر بگیتی نشان نماند
جوش گل و نشاط نسیم سحر خوش است

بویش مشام‌پرور و رنگش نظرفروز
خوش باد وقت گل که جهان سربسر خوش است

از رنگ رنگ تره و از گونه گونه گل
گلزار و شهر و بیشه و کوه و کمر خوش است

دریا خوش و شراب خوش و کوهسار خوش
منزل خوش است و توشه خوش است و سفر خوش است

این ها خوش است و بهر تو آورد روزگار
هم بهر تست هرچه ازین بیشتر خوش است

از حسن التفات ولی‌عهد و پادشاه
با ما جمال فتح وکمال ظفر خوش است

از بهر آنکه بر سر ما سایه گسترد
فرزانه بادشاه کیومرث فر خوش است

وز بهر آنکه ظلمت بدعت ز ما رود
سلطان حق‌پرست حقیقت نگر خوش است

امسال و سال دیگر و دیگر هزار سال
در شادی و خوشی همه با همدگر خوش است

برخور ز روزگار که ما از تو بر خوریم
خوش باش کز تو غالب آشفته سر خوش است

قطعه ۵۱ در ارسال اشعار

دگر در سرستم که از روی مستی
شرابی بساقیٔ کوثر فرستم

بپهنای فردوس سنبل فشانم
بگردون گرداننده اختر فرستم

باستاد منشور معنی نویسم
بجمشید اورنگ و افسر فرستم

برخسارهٔ مهر گلگونه بخشم
بگنجینهٔ شاه گوهر فرستم

همانا بر آنم که اشعار خود را
بمرزا خدا بخش[1] قیصر فرستم

قطعه ۵۲

در خطره بودن عزت و جان

جان عزیز است و اهل عزت را
عزت از جان عزیز تر باشد
خود بفرما چسان تواند زیست؟
هرکرا هر دو در خطر باشد

قطعه ۵۳

بتقریب ولادت "فرزند معظم الدوله امین الملک" اختصاص یار خان، فرزند ارجمند، جان پیوند سلطانی، بارنٹ تامس تهیافلس مٹکاف[2] بهادر فیروز جنگ

۳

امین ملک و ممالک، معظم الدوله
امیر شاه نشان و کریم ابر نوال
سران بمعرکه فیروزجنگ خوانندش
زهی بطالع فیروز خویش فرخ فال

۱- شاہ عالم بادشاہ کے نواسے مؤلف تذکرۂ گلستان سخن کے ماموں، مومن کے شاگرد بہت منکسر مزاج، شعر دوست اور معمر بزرگ تھے - غدر مین مرزا کالے کی رپورٹ پر پھانسی دی گئی - (صابری: ۱۸۵۷ء کے مجاهد شعرا، ص ۳۱۵)

۲- یہ قطعہ سبد چین اور باغ دودر میں نہیں ہے - ہم 'غالب' طبع ۱۹۴۶ء لاہور، ص ۴۷۰ سے نقل کر رہے ہیں- یہ مٹکاف صاحب وہی ہیں جو کئی سال تک دہلی کے رزیڈنٹ رہے - ان سے اور مرزا سے اچھے تعلقات تھے، کلیات کا قطعہ ۳۹، (نول کشور، ص ۳۴) بھی انہی سے متعلق ہے -

ستوده ، متکف فرزانه ، تهیافلس تامس
ریاض شان و شکوه و بهار جاه و جلال

مآثر حکمش نور دیدهٔ دولت
مکارم کرمش[1] روح قالب اقبال

ز ترکتاز سواران موکب جاهش
بسان سبزه شود چرخ نیلگون پامال

به منظرش چه زنی دم ز نیرّ رخشان
که آن در اوج هوا طائریست زرّین بال

کدام نیرّ رخشان که خود ز منظر او
پدید گشته در آئینهٔ فلک تمثال

زهی عطای تو کشّاف عقدهٔ حاجات
خهی نگاه تو وصّاف صورت آمال

ز قیصر و جم و دارا فسانه‌ها دانم
ولی نظیر توام نگزرد به‌وهم و خیال

مگر خدای جهان‌آفرین بشوکت و جاه
نیافریده ترا در جهان عدیل و همال

یکی منم ز مسیحادمان فن کلام
یکی منم ز هماشهپران اوج کمال

که چون بمدح تو روی آورم فروماند
زبان ز نکته‌سرائی چنان که گردد لال

به‌بارگاه تو کز آسمان بود صحنش
می‌کنم بسخن تحفهٔ دعا ارسال

۱- مآثر قلمش—آجکل دہلی فروری ۱۹۶۵ع -

ترا که رونق این گلشنی ، مبارکباد
طرب‌فزائی پیوند نودمیده نهال
ثمرفشانی این نخل بینی و بجهان
ز نخل عیش و طرب برخوری هزاران سال

قطعهٔ مثنوی ۵۴

از جگر تشنه بدریا سرود
وز تن بیجان بمسیحا درود
از شب دیجور بنیر سلام
وز لب مخمور بصهبا پیام
از دل افگار بمرهم سپاس
وز من ره‌جوی بخضر التماس
(کلیات نثر ص ۱۶۸)

قطعه ۵۵

بروز حشر الٰهی چو نامهٔ عملم
کنند باز که آن روز بازخواه منست
بکن مقابله آن را ز سرنوشت ازل
اگر زیاده و کم باشد آن گناه منست
(تذکرهٔ غوثیه ، ۳۰۶)

قطعهٔ مثنوی ۵۶

وفات حسرت آیات میرزا یوسف

دریغ آن که اندر درنگ سه بیست
سه ده شاد و سی سال ناشاد زیست
ته خاک بالین ز خشتش نبود
بجز خاک در سرنوشتش نبود

خدایا ! برین مرده بخشایشی
که نادیده در زیست آسایشی

سروشی بدلجوئی او فرست
روانش بجاوید مینو فرست

(دستنبو ، طبع دوم ، ص ۳۶)

قطعهٔ ۵۷ تہنیت سال گره

ترا ای آفتاب عالم‌افروز
پس از نوروز سال نو مبارک

گره بعد از گره در رشتهٔ عمر
مسلسل تا ابد بشنو مبارک

نظام الدین وقتی در طریقت
بغالب پایهٔ خسرو مبارک

قطعه ۵۸

تہدیۂ ''دستنبو'' بنواب وزیر الدوله[1]

نذر نواب وزیرالدوله
آن محیط کرم و دانش و داد

هم بدین حیله مگر یاد آید
غالب خسته که رفتست ز یاد

قطعه ۵۹ برای[2] ''درفش کاویانی''

نازم بخرام کلک و طرز رقمش
ماناست ز تیزی بدم تیغ دمش

چون اسم کتاب قاطع برهان بود
گردید ، درفش کاویانی علمش

۱- ماه نامه 'آجکل' دهلی ، فروری ۱۹۵۷ع-
۲- دیباچهٔ درفش کاویانی -

قطعه ٦٠ سفرنگ دساتیر[۱]

نگار خانهٔ چین شد دژم ازین ارتنگ
لطافت قلم نقشبند را میرم

هم آن دبیر روان‌تازه‌ساز را نازم
هم این سواد سویداسپند را میرم

قطعه ٦١ اعتذار بنام حالی پانی پتی

تو ای که شیفته و حسرتی لقب داری
همی بلطف تو خود را امیدوار کنم

چو حالی از من آشفته بی‌سبب رنجید
تو گر شفیع نگردی ، بگو، چه‌کار کنم؟

دوباره عمر دهندم اگر بفرض محال
بران سرم که دران عمر این دو کار کنم

یکی ادای عبادات عمر پیشینه
دگر به‌پیش گه حالی اعتذار کنم

۱- سبد ، باغ دودر ، حصهٔ نثر ، ص ۹۹-

قطعات تاریخ[1]

۱۔ طبع اول نول کشور میں ہے ''قطعہ ۴۵ ''۔ لیکن طبع اول دہلی میں مندرجہ بالا عنوان بتاتا ہے کہ اب قطعات تاریخ شروع ہوتے ہیں ، چنانچہ ہم نے طبع نول کشور کے قطعات تاریخ کو اس متن کے بعد نقل کیا ہے ۔

(۱) در وفات مستر استرلنگ بہادر

۱

فروغ طالع ایام مستر ''استرلنگ''
که فر خسرویش تافتی چو خور ز جبین
شگفته‌روی و پسندیده‌خوی ومشکین‌موی
به‌رأی نیک و بگوہر خوش و بشیوه گزین
بہار خوش نگہان را نسیم پرده کشا
بساط کج‌کلہان را امیر صدرنشین
لطافت از لب و کامش اسیر حرف و سخن
سعادت از سر و دستش رہین تاج و نگین
سواد ہند ز فیضش شکنج طرۂ حور
بساط دہر ز لطفش فضای خلد برین
بدہر زد سر پائی و جان بجانان داد
ز خود گزشت ببال نگاه بازپسین
بصد نشاط سی و پنج‌ساله از دنیا
جریده رفت و جوانان چنین روند چنین
بروز بست و سوم از مئی بہنگامی
که بود خسرو انجم ببرج ثور مکین
ہزار و ہشتصد و سی ز عہد عیسیٰ بود
که جست برق جہان سوز این الم ز کمین
من و خدا که درین پیچ و تاب نیست شگفت
زہم گسستن شیرازۂ شہور و سنین
تنی چنانکه شگفتی بہار ازو گل گل
سری چنانکه فشاندی فلک بر او پروین

۱- یادگار غالب صفحه ۵۲ ہر چہار قطعات بالا درہیچ مجموعه داخل نشده بود.

چه اوفتاده که از خاک باشدش بستر
چه روی داده که از خشت گرددش بالین
همین مراست نه تنها زبان فغان پیما
همین مراست نه تنها جگر شگاف آگین
لباس نیلی و رخت سیاه پوشیده
سپهریان بسپهر و زمینیان به‌زمین
دگر زبان بثنای که جنبدم بدهن ؟
دگر امید وفای که بخشدم تسکین ؟
بشوق کوی که گردم دگر بسر پویان؟
بذوق حرف که سازم دگر سخن شیرین؟
ز مدح فیض که بخشم سفینه را زیور؟
ز شکر لطف که بندم صحیفه را آئین ؟
ستم نگر که کنون بایدم بمرثیه ریخت
ز درج مدح گهرهای آبدار ثمین
نه‌رفته نقش خیال وی و نخواهدرفت
ز خاطر اسدالله دادخواه حزین
برائے آنکه بهشت برین بود جایش
ز من دعا و ز انصاف پیشگان ''آمین''

(۲) در تاریخ ورود نواب گورنر جنرل بهادر بدهلی[۱]

داور شاه‌نشان ، لارڈ کونڈس بنٹنگ
کز نهیبش تپش از شعله رمیدن دارد
کوکب از چرخ ز تاثیر نگه غضبش
متصل چون عرق از جبهه چکیدن دارد

۱- طبع اول لکھنؤ ''قطعه ۶ھ تاریخ ورود۔''

هر کجا برق عتابش علم افراشته است
شعله را رعشه بر اندام دویدن دارد

هر کجا پرتو لطفش اثر انپاشته[1] است
گل شاداب ز هر خار دمیدن دارد

بسکه چون مهر جهانتاب بسر گرمی مهر
خود بحال دل هر ذره رسیدن دارد

اندرین سال مبارک ز غبار ره خویش
بر رخ هند سر غازه کشیدن دارد

خستگان ، مژده! که نواب معلّٰی القاب
کردن و گفتن و پرسیدن و دیدن دارد

با خرد گفتم اگر سال ورودش در هند
بازجوئی و بگوئی که شنیدن دارد

لیک در تعمیه آویز و هم از لفظ ''ورود''
طرحی انداز که این شیوه گزیدن دارد

گفت نواب زآغاز و زانجام ''ورود''
از کرم جان بتن خلق دمیدن دارد

۱۸۳۱ع

(۳) در تاریخ طوی کتخدائی شاه سلیمان جاه پادشاه اودھ[1]

لوحش الله ز جوش گل که دهد
عرض گنجینهٔ صبا و شمال

۱- طبع اول لکھنؤ ''قطعه ۷۴، در تاریخ طوی کتخدائی پادشاه اودھ''
—نصیر الدین حیدر سلیمان جاه ، ابن غازی الدین حیدر، مولود ۲۲- جمادی الاولی ۱۲۱۸ھ، تخت نشینی ۲۸-ربیع الاول ۱۲۴۳ھ، مطابق ۲۰-اکتوبر ۱۸۲۷ع ، متوفی ۴-ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ ، مطابق ۸ - جولائی ۱۸۳۷ع-

بخت گوید بخرمی که بناز
عیش پیچد بتازگی که ببال

رنگ را بو رسد بعذر قدوم
لاله را گل دود باستقبال

همه می میچکد ز مغز غبار
همه گل میدمد ز شاخ غزال

باغ از نقشهای رنگا رنگ
نیکوان راست نامهٔ اعمال

راغ از لاله‌های گونا گون
عاشقان راست کارگاه خیال

سروها در هجوم جنبش شاخ
قمریان زمردین پر و بال

شاخها در نمایش شبنم
حله‌پوشان گوهرین تمثال

دهر گوئی شده است سر تا سر
بزم طوی شه ستوده خصال

شاه عالم نصیر دین که بود
دولتش ایمن از گزند زوال

بطراز رقم سلیمان جاه
بنشاط اثر همایون‌فال

بادای ادب سپهرشکوه
بصلای کرم سحاب‌نوال

بزمش از دلکشی بهشت‌نظیر
قصرش از برتری سپهرمثال

طالعش نقد کیسۂ ایام
دولتش روح قالب اقبال

رزم گاهش خطر گه ارواح
بزم گاهش نظر گه آمال

می بجامش چو نور با نیرّ
زر بدستش چو آب در غربال

هر ادای که آیدش بضمیر
هر نوای که پیچدش بخیال

بندد آن باغ خلد را آئین
گردد این ساق عرش را خلخال

چون چنین شاه را چنین جشنی
آمد آرایش دوام جمال

اسد الله خان که خوانندش
در سخن غالب لطیفه سگال

بادای گذارش تاریخ
ریخت بر گوشۂ بساط لآل

بهر ترتیب این همایون جشن
که بخسرو خجسته باد بفال

زد رقم "بزم عشرت پرویز"
۱۲۵۰ھ

وینکه گفتم بود ز روی 'وصال'

ور تو خواهی که آشکار شود
نقش اندازۂ مسیحی سال

"شاهد بخت بادشاه نویس
وانگہش بر فزای[1] "جشن کمال"

۱۸۳۴ء

(۴) در تاریخ اتمام مثنوی[2]

چو از خامهٔ فکر فضل عظیم
فرو ریخت این سلک در یتیم
تماشای این عنبرآگین بساط
بیندود مغزم بعطر نشاط

بایجاد تقریب عرض نیاز
شدم فکر تاریخ را چارەساز
درخشید برقی ز جیب خیال
که کار عظیم است تاریخ سال

۱۲۴۱ھ

(۵) در تاریخ تعمیر مکان[3]

حان جاکوب آن امیر نامور
دست وی آرایش تیغ و نگین
ساخت زانسان منظری کز دیدنش
حور گفت احسنت و رضوان آفرین

۱- طبع اول دهلی "برفرازی حسن کمال۔"
۲- طبع اول نول کشور "قطعہ ۴۸ تاریخ اتمام مثنوی" آخر میں اعداد نہیں ہیں، طبع اول دہلی میں تمام قطعات کے نیچے اعداد ہیں۔
۳- طبع اول لکھنؤ میں اس سے پہلے قطعہ ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳ ہے اور یہ قطعہ نمبر ۵۴ ہے۔ ہم نے یہ قطعات قصائد سے پہلے والے حصے میں درج کیے ہیں۔ (مرتضیٰ)

در بلندی افسر فرق سپهر
در صفا گلگونهٔ روی زمین
بایدش گفتن گلستان ارم
زیبدش خواندن نگارستان چین
خود سه اشکوب و هر اشکوبش در اوج
در نظر باشد سپهر هفتمین
غالب جادو دم نازک خیال
کش بود اندیشه معنی‌آفرین
گفت تاریخ بنای آن مکان
آسمانی پایه کاخ دل نشین

۱۲۵۵ھ

(۶) در تاریخ بنای چاه[1]

آن میجر فرزانه که موسوم بجان است
وان راست دم دانش و والائی دریافت
فرمود پئی کندن چاهی که دران‌ست
آبی که سکندر بهوس جست و خضر یافت
خود چشمهٔ ''فیض ابدی'' گفت بغالب
بنوشت چو آن دل شده از راز خبر یافت
بستود و درین قطعه در آورد و همان وقت
تاریخ دگر نیز باسعان نظر یافت
''خرشید زمین'' گفت و درین زمزمه دل بست
۱۲۵۵ھ
وین تعمیه را خوبتر از گنج گهر یافت

۱- طبع اول لکهنؤ ''قطعه ۵۵''

(۷) در تاریخ تعمیر مسجد و امام باڑه[1]

صحن امام باره و مسجد هر آن که دید
در کربلا زیارت بیت الحرام کرد
مفتیٔ عقل از پئی تاریخ این بنا
ایما بسوی من ز ره احترام کرد
گفتم بوی بدیهه خوشا خانهٔ خدا
شد خشمگین دمی که نظر بر کلام کرد
حاشاک رفت‌وپای ادب در شکنجه ریخت
ایهام را بتخرجه معنی تمام کرد

۱۲۴۴ھ

(۸) در تاریخ تعمیر امام باڑه سراج الدین علی خان قاضی القضات[2]

چون شد بصحن مدفن خان بزرگوار
طرح امام باڑهٔ عالی سپهرسا
رضوان ز خلد نور بران بام و در فشاند
تا گشت سنگ و خشت چو آئینه رونما
رحمت پئی بساط دران بزم تعزیت
آورد اطلس سیه از سایهٔ هما
رفتم نیازمند بپیش سروش فیض
گفتم که پرده از رخ تاریخ برکشا
"در تعزیت سرای" بزد "ناله" و بگفت

۱۲۴۴ھ

اینست ساز نغمهٔ تاریخ این بنا

۱- طبع اول لکهنؤ "قطعه ۴۹-"

۲- طبع لکهنؤ "قطعه ۵... علی خان"- "قاضی القضات" ندارد -

(۹) در تاریخ وفات مولانا فضل امام طاب ثراه[1]

ای دریغا قدوهٔ ارباب فضل
کرد سوی جنت الماوی خرام

کار آگهی ز پرکار اوفتاد
گشت دارالملک معنی بی نظام

چون ارادت از پی کسب شرف
جست سال فوت آن عالی مقام

چهرهٔ هستی خراشیدم نخست
تا بنای تخرجه گردد تمام

گفتم اندر سایهٔ لطف نبی
باد آرامشگه فضل امام

۱۲۴۴ھ

(۱۰) در تاریخ وفات میر فضل علی مغفور[2]

چو میر فضل علی را نمانده‌است وجود
تو روی دل بخراش ای اسیر رنج و محن

چو شد وجود گم و روی دل خراشیده
شود ز اسم خودش سال رحلتش روشن

۱۲۴۷ھ

(۱۱) در تاریخ وفات میرزا مسیتا بیگ کوتوال لکھنؤ[3]

ز سال واقعهٔ میرزا مسیتا بیگ
مآت راست شمار از ائمهٔ امجاد

۱- طبع لکھنؤ "قطعه ۵۱ ——" "طاب ثراه" ندارد—
۲- طبع لکھنؤ "قطعه ۵۲ تاریخ——" مغفور ندارد—طبع لکھنؤ میں ترتیب بدل گئی ہے -
۳- طبع اول دھلی تاریخیں ختم ، طبع اول لکھنؤ "قطعه ۵۳ مروره مرزا——" کوتوال لکھنؤ ندارد - نول کشوری ایڈیشن میں مثنویات سے پہلے نوحے اور ترکیب بند ھیں مگر ھم نسخۂ دھلی کی ترتیب ھی سے شایع کر رہے ھیں -

صحیفه‌های ساوی مبین از عشرات
حدیقه‌های بهشتی مشخص از آحاد
بحرمت ده و دو هادی و چهار کتاب
که در نشیمنی از هشت خلد جایش باد

۱۲۴۸ھ

(۱۲) قطعهٔ تاریخ تفسیر [۱]

چشم و چراغ دودهٔ مودود آنکه هست
صفدر حسن به‌تسمیه معروف در انام
نازم نژاد وی که بمودود میرسد
تا حضرت علی نقی ، آن دهم امام
آراست مصحفی و نوشت اندران نورد
فهرستی از علوم[۲] بهر گونه اهتمام
رسم‌الخط و قرائت و تجوید و ترجمه
شان نزول و ناسخ و منسوخ در کلام
علم حدیث و فقه و سلوک و شمار حرف
هر یک بشیوهٔ که پسندند خاص و عام
شرح فوائد و قصص و نکته‌های راز
هر گونه دانشی که مر آن را نهند نام
علم خداشناسی و اسرار معنوی
تفسیر هرچه هر که پژوهد بهر مقام

۱- طبع اول دهلی ندارد ، طبع اول لکھنؤ ''قطعه ۵۶'' جناب احسان دانش نے یہ تاریخ صفدر حسن صاحب کے ترجمے سے نقل کر کے مجھے دی ، جس کا سرنامہ ہے : ''قطعهٔ تاریخ ترجمه و تفسیر قرآن مجید از سید صفدر حسن مودودی نتیجهٔ فکر مرزا اسد الله خان، غالب ۔''

۲- نقل تاریخ ترجمہ ''فهرستی از علوم به صد گونه ۔''

حسن نگارشی که چو بینی گمان بری
گوهر[۱] فشانده کلک گرانمایه در خرام

یا خود ز خط و نقطه پئی طائر نگاه
افگنده‌اند دانه و گسترده‌اند دام

از نقطه ، خال عارض خوبان شود خجل
وز خط ، بنفشه‌زار برد تازگی بوام

نظارهٔ دوائر الفاظ گر کنی
بینی پر از زلال خضر صد هزار جام

هر جا[۲] که گشته ترجمهٔ ''واقتلوا'' رقم
گردیده نوک خامه بتیزی دم حسام

هر جا[۳] که رفته معنی ''لا تقنطوا'' بکار
پیچیده بوی سنبل فردوس در مشام

گفتم ستایم این رقم دل‌فروز را
اما نگشت همت من فائز[۴] المرام

در راه وصف پویه روا داشتی خرد
بودی کمیت خامه اگر گوهرین ستام

بالجمله مصحفی که بود جامع این چنین
نبود بزیر این فلک آبگینه فام

چون سید بزرگ چنین مصحف مجید
ناگه پیش غالب مسکین مستهام

۱- نقل تاریخ ''پروین فشانده -''
۲- نقل تاریخ ''جای که گشته ترجمه -''
۳- نقل تاریخ ''وانجا که رفته -''
۴- نقل تاریخ ''همت من مفضی المرام -''

آورد و گفت کاین گہرآگین صحیفه را
''ختم الصحائف'' آمده تاریخ اختتام

۱۲۶۰ھ

زان رو که در ضوابط فن سخنوری
تاریخ ، جز به نظم نمی یابد انتظام
رفتیم و ساختیم طلسم از برای گنج
این قطعه را اساس نہادیم ، والسلام

(۱۳) قطعه تاریخ وفات (تفضل[1] حسین خان)

چون تفضل حسین خان که نبود
کس نظیرش به‌شیوه و هنجار
آنکه او را همی‌توان گفتن
مردم دیدهٔ اولوا الابصار
آنکه او را روا بود خواندن
گوهر بحر حیدر کرّار
آنکه از رای روشنش در دهر
مہر را بود گرمیٔ بازار
در کرم گستری لطیف نہاد
در وفا پیشگی شگرف آثار
داشت اندر شکنج راحت و رنج
داشت اندر نورد لیل و نہار
تیزیٔ هوش و موشگافیٔ فکر
خوبیٔ خوی و شوخیٔ گفتار
جان بجان آفرین سپرد و گزشت
زین گزرگاه تنگ و ناهموار

۱- طبع نول کشور ''قطعه ۵۷ تاریخ وفات ـ''

نی ، غلط گفته‌ام ، نمی میرد
این چنین مرد زنده دل زنهار

تا شود محرم سرای سرور
زین جهان دژم گرفت کنار

جستم از سال رحلتش اثری
گفت غالب که خود ز روی شمار

از بروج سپهر جوی مآت
عشرات از کواکب سیّار

گفتم ، آحاد ؟ گفت ، شرمت باد
از خداوند واحدالقهار

۱۲۷۱ھ

(۱۴) قطعهٔ تاریخ ولادت[1] (فرزند مرزا شهاب الدین خان)

درخشید از سپهر جاه ماهی
بفرخ طالع و فرخنده هنگام

زهی چشم و چراغ دودهٔ حسن
که افزاید فروغ دین اسلام

سراج الدین احمد خان بهادر
نهادند اختر رخشنده را نام

همین نام است تاریخ ولادت
خوشا نام‌آور شایسته فرجام

خدایا! اندرین گیتی که آن را
نداند جز تو کس آغاز و انجام

رسد تا قطره‌زن ابر از پی باد
شود تا جلوه‌گر صبح از پس شام

۱- کلیات میں ہے ''قطعہ نمبر ۵۸''

نگہدار این ہمایون نامور را
نشانمند نشاط و عیش و آرام

(۱۵) قطعهٔ تاریخ ''گلشن بیخار''

غالب[۱] ، این رنگین کتاب ''گلشن بیخار'' نام
روکش جنات تجری تحتہاالانہار هست
گر کسی لب تشنهٔ تاریخ اتمامش بود
جوی های آب هم در گلشن بیخار هست

(۱۶) قطعهٔ تاریخ بنای گرمابه

احترام الدوله فرمان داد تا
دلکشا گرمابهٔ انجام یافت
بامدادان رفت آنجا بہر غسل
آنکه در گفتار غالب نام یافت
قطعهٔ تاریخ آن فرخ بنا
هم در آنجا صورت ارقام یافت
شست پا ، چون راحت و آرام جست
هر دو را در گوشهٔ حمام یافت

(۱۷) قطعهٔ تاریخ وفات بانوی شاه اوده

درهزار و دوصد و شصت و شش از دنیا برفت
بانوی شاه اوده مریم‌مکانی نام او
آنکه چون بالای بام کاخ شستی روی خویش
آب حیوان ریختی از ناودان بام او
مردنش هم بر کمال حسن او آمد دلیل
چون مه کامل بدهر از نور پر شد جام او

۱- هرسه قطعات از ''سبد چین'' و ''باغ دودر'' است و عنوان ها از خود بنده است که مطابق اسلوب دیوان طبع دهلی است -

در نورد رهروی شد سامره منزل گهش
خود اساس آن زمین بود از پی آرام او

گفت غالب سال فوتش ، لیکن از روی نیاز
باد ، با بنت رسول هاشمی انجام او

(۱۸) قطعه تاریخ تعمیر چاه

میر سعادت علی کرد در اجمیر طرح
مسجد و چاهی که هست چشمهٔ آب بقا

زانکه ز باقر علی تا بعلی میرسد
حلقه بحلقه بهم سلسله اش مرحبا

ساخته شد چون مکان کرد بدل اجر آن
از ره صدق و صفا نذر رسول خدا

از پی این سال نیک ، گفت همایون سروش
چشمهٔ زمزم صفت ، مسجد کعبه بنا

(۱۹) قطعه تاریخ ولادت فرزند فتح الملک

با خرد گفتم ، شد فرزانه فتح الملک را
خود چگویم ، گفت فخر دودهٔ آدم بگو

گفتم ، او را نونهالی رسته در باغ مراد
گفت ، کش سرو روان گلشن عالم بگو

گفتم ، از خوبی رخش مانا بخرشید ست ، گفت
سال این فرخ ولادت ''نیر اعظم'' بگو

گفتمش دیگر چه گوئی ؟ زیر لب خندید و گفت
بای زاید باید افگند از ''بگو'' این دم بگو

(۲۰) قطعه در تاریخ تعمیر در

نهاده بنا احسن الله خان
سر ره بدانسان در دلکشا

که غالب پی سال تعمیر او
رقم زد در دلکشا مرحبا

(۲۱) تاریخ تعمیر مسجد دهلی از نواب سید حامد علی خان ملقب به دانش الملک، سرفراز الامرا نواب اعتماد الدوله بهادر مهتمم جنگ[1]

۳

اعتماد الدوله کز افراط جود
هست در پیش کفش قلزم ، غدیر

دیده ور ، حامد علی خان کز صفا
بیند اسرار ازل را در ضمیر

ساخت در دهلی همایون مسجدی
تا شود طاعت گه برنا و پیر

غالب آن طوبی نشیمن عندلیب
زد بانداز سخن سنجی صفیر

شد نظیر کعبه در عالم پدید
سال تعمیرش بود "کعبه نظیر"

۱۱۵۷ھ

۱- "الحمرا" لاهور ، شماره فروری ۱۹۵۴ع، ص ٦٥، نیز "العلم"، کراچی، اپریل، ۱۹۵۹ع، ص ۱۰۳ ببعد) - یہاں سے وہ قطعات شروع ہوتے ہیں جو سبد چین اور باغ دودر حصہ نظم میں نہیں ہیں -

(۲۲) تاریخ تعمیر امام باڑہ برست ضلع کرنال

گلی ز گلبن حیدر شگفت در عالم
بباغ آل نبی حامد علی بسخا

بابر فیض دل سنگ را نماید آب
بلطف بلبل تصویر را کند گویا

بنا نمود چو قصری پی عزای حسین
زہر رواق بلند است نالۂ زہرا

چو آہ داشت ستونش ، دگر خم محراب
دہد بیاد ہلال مہ محرم را

برای سال بنایش بگریہ ہاتف گفت
مکان ماتم آل عبا ، متین بنا

۱۲۴۸ھ

(۲۳) تاریخ غدر

چون کرد سپاہ ہند در ہند
با انگلسیان ستیز بیجا[1]
تاریخ وقوع این وقایع
واقع شدہ ''رستخیز بیجا''

(۲۴) تاریخ قاطع برہان

یافت چون گوشمال این تحریر
آنکہ برہان قاطعش نام[2] است
شد مسمی بہ قاطع برہان
''درس الفاظ'' سال اتمام است

۱- دیباچۂ قاطع برہان ص ۱، سبد ، باغ دودر ، ص ۹۳ -
۲- قاطع برہان -

(۲۵) تاریخ وفات مرزا یوسف

ز[1] سال مرگ ستم دیده میرزا یوسف
که زیستی بجهان در زخویش بیگانه

یکی در انجمن از من همی پژوهش کرد
کشیدم آهی و گفتم ''دریغ دیوانه''

۱۲۹۰—۱٦ = ۱۲۷٦ع

(۲٦) قطعه[2] تاریخ وفات فرزند علاؤالدین خاں

درگریه اگر دعوئ هم چشمئ ما کرد
بینی که شود ابر بهاری خجل از ما

ناچار بگرییم شب و روز که این سیل
باشد که برد کالبد آب و گل از ما

گفتی که نگهدار دل از کش مکش غم
خود گرد بر آورد غم جاں گسل از ما

یحییٰ شده از شعلهٔ سوز غم هجرش
چوں شمع دود دود به سر متصل از ما

غم دیده نسیمی پیٔ تاریخ وفاتش
بنوشت که در داغ پسر سوخت دل از ما

۱۲۷۴ھ

۱۔ دستبنو، طبع ۲، ص ۳٦ -

۲۔ یه قطعه کلیات و باغ دودر میں نہیں ہے - غالب نے علاؤالدین احمد خان کے خط مکتوبہ ۲۷ - رمضان ۱۲۷۴ھ میں لکھا ہے اور حساب یه لکھتے ہیں : ''ما'' کے عدد ۴۱ - ''دل'' کے عدد ۳۴، ''ما'' میں سے ''دل'' گیا ، گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گئے- باقی رہے سات ، وہ ''داغ پسر'' پر بڑھائے - ۱۲۷۴ ہاتھ آئے -''

مثنویات

انخستین مثنوی، موسوم به "سرمۂ بینش"[1]

بشنو از نی چون حکایت میکند
از جدائی ها شکایت میکند

من نیم کز خود حکایت میکنم
از دم مردی روایت میکنم

از دم فیضی کز استاد آورم
خامه را چون نی بفریاد آورم

نالۂ نی از دم مرد رہست
کان هم از ساز و هم از راز آگہست

بر نوای راز حق گر دل نہی
بایدت چون نی ز خود بودن تہی

گر ندای دلریش، از مستی ملاف
کاین می از تندی بود پہلو شگاف

ای که از راز نہان اگہ ندای
دم مزن از رہ که مرد رہ ندای

دست در دامان مرد راه زن
لیک رہبر را شناس از راہزن

در ہزاران مرد، مرد رہ یکیست
آدمی بسیار، اما شہ یکیست

۱- کلیات طبع نول کشور میں مثنویات سے پہلے "قطعات فاتحہ" اور نوحہ‌جات ہیں۔ ہم نے طبع اول دہلی کی ترتیب باقی رکھی ہے جس میں یہ قطعات مثنویات کے بعد ہیں۔
مخطوطہ ۱۸۳۸ع (جسے میں نے جناب ڈاکٹر وحید مرزا صاحب بالقابہ کے پاس دیکھا) "افتتاح عنوان مثنویات کہ چمن در چمن و باغ در باغ است بمثنوی مسمیٰ به درد و داغ مثنوی۔"

مرد رہ باید کہ باشد مرد عشق
لب ترنم خیز و در دل درد عشق
ور تو میپرسی کہ مرد راہ کیست؟
جز سراج الدین بہادر شاہ کیست؟

در طریقت رہنمای رہروان
در خلافت پیشوای خسروان
آن کہ چون از راز وحدت دم زند
دفتر کون و مکان برہم زند

آن کہ چون در نی نوا را سر دہد
نی شود نخلی کہ شبلی بر دہد
آن کہ چون شوق آسمان‌تاز آیدش
تخت چون رفرف بپرواز آیدش

شبلی از منبر دہد آواز عشق
شاہ ما بر تخت گوید راز عشق

عشق دارد پایۂ ہرکس نگاہ
منبر از شبلی و تخت از پادشاہ
آنچہ ابراہیم ادہم یافت است
بعد ترک مسند جم یافت است

شاہ ما دارد بہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاج خسروی
شاہی و درویشی اینجا باہم است
بادشاہ عہد ، قطب عالم است

ہم بشاہی ناظر وجہ اللّٰہی
ہم بدرویشی درش فرّ شہی

چرخ در رقص از نوای ساز اوست
قدسیان را گوش بر آواز اوست

دارد این دانادل دانش‌پسند
در خدادانی سخنهای بلند

به ز شه راز نهان نشناخت کس
لیک شه را در جهان نشناخت کس

چشم ما کوراست و حسن آئینه‌جوی
فهم ما کند است و خاقان رمزگوی

صبحدم سلطان سریر آرای بود
از مریدان مجمعی برپای بود

ابر رحمت گوهر افشاندن گرفت
شاه از عرفان سخن راندن گرفت

چون بقدر فهم مردم خواست گفت
در لباس رمز حرفی راست گفت

گفت کاندر معرض اسرار دوست
هر که باشد طالب دیدار دوست

خواهد از نور جمال یار خویش
روکش مشرق در و دیوار خویش

بایدش کاشانه نیکو ساختن
حجره از نامحرمان پرداختن

خار و خس از خانه بیرون ریختن
مشک تر با خاک راه آمیختن

زان سپس کاین کار را یکرو کند
خانه را زینگونه رُفت و رو کند

آورد آب و زند در رہ‌گزار
تا هوا از ره نینگیزد غبار

برگ گل در ره فشاند مشت مشت
تا نیاید خاک زیر پا درشت

رخت گرد آلوده از تن برکشد
خامهٔ پاکیزه اندر بر کشد

چون درآید آن نگار از خود رود
خوش باستقبال یار از خود رود

عاشق از خود رفت دلبر ماند و بس
سایه گم شد مہر انور ماند و بس

جمله جانان ماند و جسم و جان نماند
حسرت وصل و غم هجران نماند

شبنمی را طعمهٔ خرشید کن!
خویش را قربانیٔ این عید کن!

تیرگی بزدای تا رخشان شوی
قطرگی بگزار تا عمّان شوی

معنی رمزی که شه فرموده‌است
حفظ ناموس شریعت بوده‌است

''رُفتن کاشانه و صحن سرا''
دفع اوهام است و نفی ماسوا

مدعا تہذیب اخلاقست و بس
سعی در تحصیل اشراقست و بس

وان خودآرا دلبری کز در رسد
جذبهٔ باشد که از حق در رسد

"رفتن عاشق به استقبال دوست"
مطلب از محویت آثار اوست

سالک آزادهٔ چابک‌خرام
چون رسد اینجا ، شود سیرش تمام

نیست کس بعد از خدا غیر از خدا
این بود سرّ بقا بعد الفنا

غالب از رازی که گفتی دم مزن
سنگ بر پیمانهٔ عالم مزن

راز وحدت بر نتابد گفتگو
حرف حق را در نیابد گفتگو

بر دعای شه سخن کوتاه باد
تا خدا باشد بهادر شاه باد!

دومین مثنوی "درد و داغ" نام

بی‌ثمری بزرگری پیشه داشت
در دل صحرای جنون ریشه داشت

دست تهی آئینه قسمتش
زخم دل و داغ جگر دولتش

خانه اش از دشت خطرناک تر
پیرهنش از جگرش چاک تر

مایهٔ او داغ و همان در برش
حاصل او خاک و همان بر سرش

هر سحرش تیره تر از تیره شام
فاقه پی فاقه کشیدی مدام

مادرکی و پدری پیر داشت
ربط بهم چون شکر و شیر داشت

شام و سحر گرمی دلسوزیش
خدمت شان ، کار شباروزیش
چون لب نان و دم آبش نبود
فائده جز رنج و عذابش نبود

بار که بر گردنش افتاده بود
درپی افگندنش افتاده بود
تابکی از گرسنگی سوختن
سیر شد از زندگی خویشتن

ننگ شد آئین وطن داریش
سلسلهٔ بگسیخت گرفتاریش
بسکه دل از تنگی سامان گرفت
با اب و ام راه بیابان گرفت

هر سه تن آئینهٔ وحشت شدند
بادیه‌پیمای سیاحت شدند
ریخت جنون بر تپش آهنگها
ماند وطن دور بفرسنگها

مرحلهٔ چند نوشتند راه
تا برسیدند بدشتی تباه
وادی دردی که هزارش بلا
خاک بلاخیز و غبارش بلا

لالهٔ خودروش ز خون شهید
ذره‌اش از جوهر تیغ یزید
گشت دران وادی آشوبناک
جامهٔ عریانی شان چاک چاک

هر قدم آنجا به سردار بود
عربدهٔ آبله و خار بود

بود بهم هر غم و رنجیکه بود
تشنه لبی آفت دیگر فزود

شد هوس آب بدل شعله زن
سوختن آمد بجگر سوختن

هوش دران معرکه بیهوش گشت
پا بوداع قدم آغوش گشت

تیزی رفتار ستم کرده بود
پای تگ و تاز قلم کرده بود

آبله ساغر شد و ساغر نشد
زهره شد آب و لب‌شان تر نشد

از تپش دل بتمنای آب
طرف نبستند بجز اضطراب

دامن جهدی بکمر بر زدند
تا قدمے چند مکرّر زدند

گرد سیاهی بنظر ها ز دور
سایهٔ نخلے و هجوم طیور

پا بخرامید بسعی نگاه
تا برسیدند بدان جایگاه

بود به‌پیغولهٔ ویرانی
تکیهٔ درویش بیابانی

تا بسر تکیه رسیدند شان
آب به ایما طلبیدند شان

مرد فقیر از سر سجاده جست
جام بدستی و سبوی بدست

تا نم آبی بگلوها رسید
دور پیاپی بسبوها رسید

ریشهٔ هستی بدمیدن رسید
نشهٔ مستی برسیدن رسید

تشنهٔ عرض سخن آمد فغان
گشت بیانها بسخن تر زبان

هر یکی از درد بدرویش گفت
پارهٔ از درد دل خویش گفت

کای چمن‌آرای گلستان فیض
خضر قدم‌گاه بیابان فیض

ما سه تن آفت‌زدهٔ قسمتیم
ساغر سرشار مئی کلفتیم

در قفس گردش چرخ دورنگ
قافیهٔ عیش بما گشته تنگ

از تپش‌آباد جنون میرسیم
تا کمر و سینه بخون میرسیم

گر نگهی نامزد ما کنی
عقده ز سررشتهٔ ما وا کنی!

بو که هوس بال‌فشانی کند
کار فروبسته روانی کند

از نفسی فیض مسیحا بیار
مژدهٔ اقبال تمنا بیار

آئینهٔ بخت سیاهیم ما
حسرتی سعی نگاهیم ما

پیر بجوشید زگفتار شان
گریه اش آمد بسر و کار شان

کرد نگه بر ورق دل درست
طالع شان در نظر آورد چست

دید که در قسمت شان هیچ نیست
حاصل شان غیر خم و پیچ نیست

باب کرم بر رخ شان باز نیست
بخت کمانکش غلط انداز نیست

زار بنالید که یا ذوالجلال!
آب شدم از اثر انفعال!

بر دل اندوه گزینم ببخش!
جرم سه تن را بیقینم ببخش!

خسته دلانند تو مرهم فرست!
دولت و راحت ز پی هم فرست!

ای تو خداوند جهان رحم کن!
بر من و این غمزدگان رحم کن!

هاتفی از خلوت اسرار فیض
گفت که ای جلوه طلبگار فیض

درس حقیقت بتو فرموده‌ایم
اختراینان بتو بنموده‌ایم

قسمت شان از کرم ما همینست
سابقهٔ روز ازل این چنینست

در طلبت شیفتهٔ همت است
عالم ابرام جنون وسعت است
باش که شرحی ز تسلی دهیم
پرتوی از جلوهٔ معنی دهیم

در خم محراب فریب آرزو
با سه تن این مژدهٔ دلکش بگو
کز اثر عاجزیم در جناب
شد سه تمنای شما مستجاب

هر یکی از شوق نوائی زند
دست بدامان دعائی زند
باز سروکار دعاها ببین
چشم بخوابان و تماشا ببین

پیر برآورد سر از جیب ناز
گشت بدلداری شان نکته‌ساز
مژدهٔ صبح طرب آورد و گفت
رنگ تبسم بلب آورد و گفت

کای زدگان ستم روزگار
آئینهٔ رحمت پروردگار
شاد شوید از غم دل وارهید!
دلشدگان داد هوسها دهید

رحمت حق آئینه‌دار شماست
وقت پزیرفتن یک یک دعاست
از غم گردون بپناهید تان
هر چه بخواهید، بخواهید تان

سامعه را صافی این گفتگو
داد بامواج گهر شست و شو
ذوق ببالید و تپش ساز کرد
حسرت دل بیخودی آغاز کرد
راست چو گل خنده‌زنان خواستند
دست فشانان و دنان خواستند
ناله بصید اثر از خویش رفت
هر یکی از دیگر خود پیش رفت
ماند بران پیرزن دل جوان
قرعهٔ [۱] دیباجگئی امتحان
قامت خم گشتهٔ آن پیرزن
راست شد از بهر دعا خواستن
دست بر آورد و فغان ساز کرد
مویهٔ از درد دل آغاز کرد
گفت که ای کارروای همه!
سوی درت روی دعای همه!
از غم ایام ستم‌دیده‌ام
پیرزن عاجز غم‌دیده‌ام!
عمر بافلاس بسر رفته است
نقد من از کیسه بدر رفته است!
عمر تلف گشت بداغ وصول
تا سه دعا کردهٔ از ما قبول
شوهر من طالب مالست و بس
دولت دنیاست مر او را هوس

۱- طبع دهلی اول ''قزعه ـ''

تیر دعایش چو رسد بر هدف
ساز دو عالم هوس آرد بکف
میکشد و عرض تنعم کند
در طرب خویش مرا گم کند

خوش ننشیند نشکوهد ز من
کام دل خود نپژوهد ز من
با دگران ساغر عشرت زند
با من ژولیده بنفرت زند

پس ز تو خواهم که جوانم کنی!
رونق خوبان جهانم کنی!
ده بمن ، ای رازق برنا و پیر!
حسن و جمالیکه بود دلپذیر

یوسف اقبال بخوابم رسان
همچو زلیخا بشبابم رسان
چون سرش از سجدهٔ حق راست شد
دید بدانسانکه همیخواست ، شد

حسن خودش چون بنگه باز خورد
آئینه گوئی دلش از دست برد
دید که مه‌چهره و زیباستم
حیرت خویشم چه تماشاستم
چهره بر افروخت ز تاب عذار
یافت خزان را سرو برگ بهار
ارث خم پشت بکاکل رسید
سلسلهٔ ناز بسنبل رسید

قمری طاؤس پدید آمده
چون رمضان رفته و عید آمده

تازه فسونی بتمنا دمید
شاد و نوان بر سر شوهر رسید

تاب عذارش بسیاهی موی
زد شبخونی بدل و جان شوی

دست کشاد آن صنم شیر گیر
دل بربود از کف دهقان پیر

شوهرش از وجد برقص اوفتاد
دیده بگل‌چینی رویش کشاد

ترشد ازان شوخی و برنائیش
ساخت سراسیمه تبه‌رائیش

بسکه بران دلشده مشکل فتاد
با پسرش عربده در دل فتاد

خاطرش از بند غم آزاد شد
گرم شد و مست شد و شاد شد

بهره ز امید ربایان همی
حوصلهٔ آز فزایان همی

یافت پری در بر و دیوانه گشت
با زن و فرزند سوی خانه گشت

جلوهٔ مقصود به آئینه در
حاصل آفاق بگنجینه در

خواست بکاشانه در آید بناز
تا در آن خانه کشاید بناز

در حق ویرانه دعائی کند
دعوت برگی و نوائی کند
حال وی از مال دگرگون شود
گنج بیندوزد و قارون شود

خاک زاکسیر دعا زر شود
هم بدمی چند توانگر[1] شود
کرد جوان نیز تمنای خویش
منحصر مسکن و ماوای خویش

همچو پدر محو زر او بود نیز
تشنهٔ لعل و گهر او بود نیز
شد بتگی چند خرام سفر
تکیهٔ درویش نهان از نظر

بر دل از امید رقمها زنان
دست فشانان و قدمها زنان
هر یکی از رفته سگالش کنان
بود دران بادیه چالش کنان

می بچمیدند بذوق وطن
هم چو نسیم سحری در چمن
ماند چو کاشانه بفرسنگکی
داد برون ساز غم آهنگکی

ناگه ازان بادیه گردی بجست
بر سر اقبال هوسها نشست
از دل آن گرد سواری دمید
نی غلطم آئینه‌زاری دمید

۱- کلیات طبع اول دهلی میں عموماً ''توانگر'' کا املا ''تونگر'' ہی ہے -

جلوه گر از آینه شهزادهٔ[1]
دور ز فوج و سپه افتادهٔ

درپی صیدی بهوس میدوید
تا بنظرگاه غریبان رسید

شد نگهش با زن دهقان دوچار
گشت دل از ناوک نازش فگار

از سر ابرو بادای شگرف
کرد عبارات دل‌آهنج صرف

در خم دامش چو بیفشرد تنگ
آن زن بیچاره بگرداند رنگ

کرد دل و جان بهوایش اسیر
رفت ز دل مهر کشاور ز پیر

گفت ، خوشا خوبی جاه و جلال
شوهر اگر مال برد ، کو جمال؟

شوخ وش و نغزجوان[2] یافتش
سر بسر آرامش جان یافتش

پشت هوسهای نهان گرم کرد
جای در آغوش جوان گرم کرد

عهد حق صحبت و الفت شکست
رنگ برخسارهٔ عصمت شکست

در هوس جلوهٔ رنگ حنا
دست بیالود بخون وفا

۱- طبع اول دهلی ''شه زادهٔ''
۲- طبع اول دهلی ''نغز و جوان''

رام نگه دید دلآرام خویش
حیله برانگیخت پی کام خویش
پردهٔ آزرم ز رخ برگرفت
سویه کنان گریهٔ از سر گرفت

ناله برآورد که ای نوجوان
داد ز بیمهری این رهزنان
خوش کسم و هیچکسم کرده‌اند
بلبلم و در قفسم کرده‌اند

زیور و پیرایهٔ من برده اند
بیخودم از قافله آورده اند
زین غم و دردم بدر دل رسان
همره خود گیر و بمنزل رسان

خوش بغم خسته روانان برس[1]
نغز جوانا، بجوانان برس[1]
برد جوانش بکمرگاه دست
داد پس خود بتکاور نشست

برد و روان گشت، روان همچو باد
گرد رهش بر سر دهقان فتاد
وقف ردیفش چو بدین رنگ دید
قافیهٔ صبر و سکون تنگ دید

ماند بحسرت نگرانش که چه؟!
سر بفلک سود فغانش که چه؟!
ناله نوید اثری باز داد
هاتفی از پرده‌اش آواز داد

۱- طبع دوم نول کشور ''برش''

کای علم قدرت ایزد بدست
ناوک دلدوز رها کن ز شست

تیر دعای نفست بی‌خطاست
حکم ترا حکم خدنگ قضاست

پیر خرف دود فغان برکشید
شعله شد و از دل خود سر کشید

زار بنالید بپیش خدا
گفت که ای صانع ارض و سما!

روز من از جوش بلا تیره شد
چشم من از تاب جفا خیره شد

بخت درین مرحله با من چه کرد
ناله گواه ست که این زن چه کرد

انده من زهره‌گداز آمده‌است
پیش تو سائل بنیاز آمده‌است

خست دل از تیزی رفتار او
داد گرا[1]، کیفر کردار او

ساز تلافی سلوکش بساز
مسخ کن و مادهٔ خوکش بساز

در خم پوزش بادای سجود
بود لبش محو دعائی که بود

کان زن بدطینت پیمان‌شکن
دید سیاه آئینهٔ خویشتن

۱- طبع اول دهلی و لکھنؤ میں ''داد کرا'' ہے۔

خوک شد و بد نفسی ساز کرد[1]
با سر و رو عربده آغاز کرد

دید جوان کاینچه بلا شد ، چه شد؟!
آهوکی خوک‌نما شد ، چه شد؟!

از دل شهزاده[2] برآمد غریو
زار بترسید ز آسیب دیو

غول بیابان رگ جانش گرفت
خواست بنالد که زبانش گرفت

راست ز اسپش بزمین برفگند
بر سر خاک از سر زین برفگند

گشت هراسان و عنان درگسیخت
آب رخ برق بجولان بریخت

وان[3] زن فرتوت جوان گشته‌
در قفس خوک نهان گشته‌

جانب شوی و پسر خود دوید
لابه کنان در قدم شان تپید

جنبش دم طرز هواداریش
سر زدن ، آئین طلبگاریش

حیف کنان ، بر اثر ساز خود
نوحه بر انگیخت بآواز خود

۱- طبع اول دهلی میں ہے ''وپنجه زدن ساز کرد'' ناطق مکرانی نے اس پر اعتراض کیا جسے مرزا نے قبول کیا اور کلیات طبع نول کشور میں ''و بد نفسی ساز کرد'' بنا دیا، دیکھیے ''جوہر معظم'' ۔ متفرقات غالب ص ۱۵٦ ، پنج آہنگ ص ۲۴۴ -
۲- طبع اول دہلی میں اس کا املا ہے ''شه زاد''
۳- طبع نول کشور ''زان زن فرتوت''

تا پسرش را بهم آمد درون
کرد ز بیتابی خاطر جنون

مادر خود را بچنان حال یافت
چاره سگالید و بزاری شتافت

کرد دعا صرف مددگاریش
زار بنالید بغمخواریش

کای اثر ایجاد نفسهای ما
گر تو نبینی سوی[1] ماوای ما

رحمت خاصی بسر ما فرست
مژدهٔ آرامش جانها فرست

این زن پیر آئینهٔ عبرت است
ننگ تخیل کدهٔ صورت است

حسن و جمالش همه برباد رفت
صورت اصلیش هم از یاد رفت

داغ نکوهیده سرشتی چراست
خوبی اگر رفت بزشتی چراست

کسوت این شکل برآر از برش
از وسخ مسخ بشو پیکرش

باز نخواهم که بدانسان کنش
صورت اصلی ده و انسان کنش

ناله ز توفیق اثر بهره برد
نقد تمنا بکفش در سپرد

کسوت آن خوک قبا گشته دید
پیکری از پوست جدا گشته دید

۱- طبع لول کشور ''سو ماوائے ما''

پیر زنی ، پشت خم استاده یافت
حرف و سخن را چو خود آماده یافت

چشم بمالید و مژه برشکست
باورش آمد که همان مامکست

روی همان ، موی سفیدش همان
چشم همان ، قوت دیدش همان

پشت خم و ربط عصایش همان
وان لب و دندان و صدایش همان

آئینه از زنگ وساوس ز دود
شکر بدرگاه الٰهی نمود

غالب اگر محرم معنی شوی
آئینه‌پرداز تسلی شوی

تا نبود یاری بخت بلند
چارهٔ عیسیٰ نفتد سودمند

نیم دعا گر شودی مستجاب
مفت بود سود برون از حساب

طالع آن بی‌سر و پایان نگر
دست گه عقده کشایان نگر

کز اثر رافت آن رازدار
یافته هر یک سر و برگ بہار

رحمت حق جوش عطاها نمود
رنگ اثر صرف دعاها نمود

نور اجابت ز کمین جلوه کرد
شک ز میان رفت و یقین جلوه کرد

بود زبس طالع آنان نژند
همت شان قرعهٔ پستی فگند

شد سه دعا با همه لطف اثر
صرف علاج سه بلای دگر

آن همه آرایش حسن قبول
رنگ هوس باخت بگرد فضول

حاصل شان زان تگ و تاز هوس
رفتنی و آمدنی بود و بس

بخت چو پوید ره مکر و فریب
کیست که از اوج نیفتد بشیب؟

عالم تقدیر چنین است و بس
حاصل تحریر من اینست و بس

سومین مثنوی موسوم به "چراغ دیر"

نفس با صور دمساز است امروز
خموشی محشر راز است امروز

رگ سنگم ، شراری مینویسم
کف خاکم ، غباری مینویسم

دل از شور شکایتها بجوش است
حباب بی‌نوا طوفان خروش است

بلب دارم ضمیر لابیانی
نفس خون کن ، جگرپالا فغانی

پریشان‌تر ز زلفم داستانی است
بدعوی هر سر مویم زبانی است

شکایت گونهٔ دارم ز احباب
کتان خویش میشویم بمهتاب

در آتش از نوای ساز خویشم
کباب شعلهٔ آواز خویشم

نفس ابریشم ساز فغان است
بسان نی تبم در استخوان است

محیط افگنده بیرون گوهرم را
چو گرد افشانده آهن جوهرم را

ز دهلی تا برون آورده بختم
بطوفان تغافل داده رختم

کس از اهل وطن غمخوار من نیست
مرا در دهر پنداری وطن نیست

ز ارباب وطن جویم سه تن را
که رنگ و رونق[1] اند این نه چمن را

چو خود را جلوه سنج ناز خواهم
هم از حق، فضل[2] حق را باز خواهم

چو حرز بازوی ایمان نویسم
حسام‌الدین[3] حیدر خان نویسم

چو پیوند قبای جان طرازم
امین‌الدین احمد خان طرازم

۱- طبع اول دهلی ''رونق است۔''
۲- فضل حق، از مدرسین مبرز فلسفه و منطق و عالم شهیر که از غالب صداقتی تمام داشت ۔ در ۱۲۷۸ھ در اندمان وفات یافت ۔
۳- حسام الدین حیدر خان بهادر حسام جنگ از اقارب سلاطین اوده که بدهلی آمده و از غالب الفت و موانست میداشت در سنه ۱۸۴۶ع وفات یافت — امین الدین احمد خان نواب لوهارو می‌باشد ۔

گرفتم کز جهان آباد رفتم
سر اینان را چرا از یاد رفتم
مگو داغ فراق بوستان سوخت
غم بی‌مهری این دوستان سوخت

جهان‌آباد گر نبود الم نیست
جهان آباد بادا جای کم نیست

نباشد قحط بہر آشیانی
سر شاخ گلی در گلستانی

سپس در لاله‌زاری جا توان کرد
وطن را داغ استغنا توان کرد

بخاطر دارم اینک گل‌زمینی
بہارآئین سواد دل‌نشینی

که می‌آید بدعوی‌گاه لافش
جهان‌آباد از بہر طوافش

نگه را دعوی گلشن‌ادائی
ازان خرّم بہار آشنائی

سخن را نازش مینوقماشی
ز گلبانگ ستایشهای ''کاشی''

تعالی الله بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور

بنارس را کسی گفتا که چین است
هنوز از گنگ چینش بر جبین است

بخوش پرکاری طرز وجودش
ز دهلی میرسد هردم درودش

بنارس را مگر دید است درخواب
که میگردد ز نهرش در دهن آب
حسودش گفتن آئین ادب نیست
ولیکن غبطه گر باشد[۱] عجب نیست
تناسخ‌مشربان چون لب کشایند
بکیش خویش کاشی را ستایند
که ''هرکس کاندران گلشن بمیرد
دگر پیوند جسمانی نگیرد''
چمن سرمایهٔ امید گردد
بمردن . زندهٔ جاوید گردد
زهی آسودگی بخش روانها !
که داغ جسم میشوید ز جانها
شگفتی نیست از آب و هوایش
که تنها جان شود اندر فضایش
بیا ، ای غافل از کیفیت ناز
نگاهی بر پریزادانش انداز!
همه جانهای بی‌تن کن تماشا
ندارد آب و خاک این جلوه حاشا
نهاد شان چو بوی گل گران نیست
همه جانند و جسمی درمیان نیست
خس و خارش گلستانست گوئی
غبارش ، جوهر جانست گوئی
درین دیرینه دیرستان نیرنگ
بهارش ایمن است از گردش رنگ

۱- طبع دهلی ''ولیکن غبطه باشد گر عجب نیست -''

چه فروردین چه دی ماه و چه مرداد
بهر موسم فضایش جنت‌آباد

بهاران در شتا و صیف ز آفاق
بکاشی میکند قشلاق و ئیلاق

بود در عرض بال‌افشانیٔ ناز
خزانش صندل پیشانی ناز

بتسلیم هوای آن چمن‌زار
ز موج گل بهاران بسته زنار

فلک را قشقه‌اش گر بر جبین نیست
پس این رنگینی موج شفق چیست

کف هر خاکش از مستی کنشتی
سر هر خارش از سبزی بهشتی

سوادش پای تخت بت‌پرستان
سراپایش زیارت گاه مستان

عبادت‌خانهٔ ناقوسیان است
همانا کعبهٔ هندوستان است

بتانش را هیولی شعلهٔ طور
سراپا نور ایزد ، چشم بد دور

میانها نازک و دلها توانا
ز نادانی بکار خویش دانا

تبسم بسکه در لبها طبیعی است
دهنها رشک گلهای ربیعی است

ادای یک گلستان جلوه سرشار
خرامی صد قیامت فتنه در بار[1]

۱- طبع لکهنؤ ''در مار'' بمیم-

بلطف از موج گوهر نرم‌روتر
بناز از خون عاشق گرم‌دوتر

ز انگیز قد انداز خرامی
بپای گلبنی گسترده دامی

ز رنگین جلوه‌ها غارتگر هوش
بهار بستر و نوروز آغوش

ز تاب جلوهٔ خویش آتش‌افروز
بتان بت‌پرست و[1] برهمن‌سوز

بسامان دو عالم گلستان رنگ
ز تاب رخ چراغان لب گنگ

رسانده از ادای شست و شوئی
بهر موجی نوید آبروئی

قیامت قاتان مژگان درازان
ز مژگان بر صف دل نیزه‌بازان

بتن سرمایهٔ افزایش دل
سراپا مژدهٔ آسایش دل

بمستی موج را فرموده آرام
ز نغزی آب را جشیده اندام

فتاده شورشی در قالب آب
ز ماهی صد دلش در سینه بیتاب

ز بس عرض تمنا میکند گنگ
ز موج آغوشها وا میکند گنگ

ز تاب جلوه‌ها بیتاب گشته
گهرها در صدفها آب گشته

۱- طبع اول دهلی ''و'' ندارد- ''بتان بت پرست برهمن سوز'' متن مطابق طبع لکهنؤ-

مگر گوئی بنارس شاهدی هست
ز گنگش صبح و شام آئینه در دست

نیاز عکس روی آن پریچهر
فلک در زر گرفت آئینه از مهر

بنام ایزد زهی حسن و جمالش
که در آئینه میرقصد مثالش

بهارستان حسن لاابالیست
بکشورها سمر در بے مثالیست

بگنگش عکس تا پرتو فگن شد
بنارس خود نظیر خویشتن شد

چو در آئینهٔ آبش نمودند
گزند چشم زخم از وی ربودند

بچین نبود نگارستان چو اوئی
بگیتی نیست شارستان چو اوئی

بیابان در بیابان لاله‌زارش
گلستان در گلستان نوبهارش

شبی پرسیدم از روشن‌بیانی
ز گردشهای گردون راز دانی

که بینی نیکوئی‌ها از جهان‌رفت
وفا و مهر و آزرم از میان رفت!

ز ایمانها بجز نامی نمانده
بغیر از دانه و دامی نمانده!

پدرها تشنهٔ خون پسرها
پسرها دشمن جان پدرها !

برادر با برادر در ستیز است
وفاق از شش جهت رو در گریز است

بدین بی پردگیهای علامت
چرا پیدا نمیگردد قیامت ؟

بنفخ صور ، تعویق از پئی چیست؟
قیامت را عنان گیر جنون کیست؟

سوی کاشی بانداز اشارت
تبسم کرد و گفته این عمارت!

که حقا نیست صانع را گوارا
که از هم ریزد این رنگین بنا را

بلند افتاده تمکین بنارس
بود بر اوج او اندیشه نارس

الا ، ای غالب کار اوفتاده!
ز چشم یار و اغیار اوفتاده

ز خویش و آشنا بیگانه گشته
جنون گل کرده و دیوانه گشته

چه محشر سرزد از آب و گل تو
دریغا از تو و آه از دل تو!

چه جوئی جلوه زین رنگین چمنها
بهشت خویش شو از خون شدنها

جنونت گر بنفس خود تمام است
ز کاشی تا بکاشان نیم گام است

چو بوی گل ز پیراهن برون آی
به‌آزادی ز بند تن برون آی

...

مده از کف طریق معرفت را
سرت گردم ، بگرد این شش جهت را

فرو ماندن بکاشی نارسائی است
خدارا این چه کافرماجرائی است

ازین دعوی بآتش شوی لب را
بخوان غم‌نامهٔ ذوق طلب را

بکاشی لختی از کاشانه یاد آر
درین جنت ، [۱]ازان ویرانه یاد آر

دریغا در وطن واماندهٔ چند
بخون دیده زورق راندهٔ چند

هوس را پای در دامن شکسته
بامید تو چشم از خویش بسته

بشهر از بیکسی صحرانشینان
بروی آتش دل جاگزینان

مگر کان قوم را دهر آفریده
ز سیمابی[۲] بر آتش آرمیده

همه درخاک و خون افگندهٔ تو
بحکم بیکسیها بندهٔ تو

چو شمع از داغ دل آذرفشانان
ببزم عرض دعوی بی‌زبانان

سر و سرمایه غارت کردهٔ تو
ز تو نالان ولی در پردهٔ تو

۱- طبع دهلی ''ازین ویرانه یاد ، آر''
۲- طبع دهلی و لکهنؤ ، ''زسیماب برآتش آرمیده -''

ز آنانت تغافل خوشنما نیست
بداغ شان هوای گل روا نیست!
ترا ای بیخبر کاریست در پیش
بیابانی و کهساریست در پیش!
چو سیلابت شتابان میتوان رفت
بیابان در بیابان میتوان رفت!
ترا زاندوه مجنون بود باید
خراب کوه و هامون بود باید!
تن‌آسانی بتاراج بلا ده!
چو بینی رنج خود را رونما ده!
هوس را سر ببالین فنا نه!
نفس را از دل آتش زیر پا نه!
دل از تاب بلا بگداز و خون کن!
ز دانش کار نکشاید جنون کن!
نفس تا خود فرونشیند از پای!
دمی از جاده پیمائی میاسای!
شرار آسا فناآماده برخیز!
بیفشان دامن و آزاده برخیز!
ز الا دم زن و تسلیم لا شو
بگو، ''الله'' و برق ماسوا شو!

چارمین مثنوی موسوم به ''رنگ و بو''

بود جوان دولتی از خسروان
غازه‌کش عارض هندوستان
بادهٔ سرمستی دل را خمی
از نم تردستی خود قلزمی

ماندہ گستردہ بپہنای آز
عالمی از برگ نوالش بساز

آئنۂ صورت جود آمدہ
جود خود از وی بوجود آمدہ

بستہ کمر بہر کشود ہمہ
بودہ زیان خود و سود ہمہ

وا بگل و خار چو آغوش ابر
پیش کفش غاشیہ بر دوش ابر

چرخ ز دست گہرافشان او
لطمہ خور موجۂ طوفان او

داشت پئی طرح کرم ریختن
لعل و گہر بر سر ہم ریختن

صبحدمی جلوہ بر اورنگ داشت
افسرش از موج شفق رنگ داشت

دادہ بہر گوشہ صلای کرم
ہر نفسش پردہ کشای کرم

بہرہ پژوہندہ گروہا گروہ
سر زدہ چون لالہ ز دامان کوہ

در صف ارباب طلب نا گرفت
نقش غمی بال زد و جا گرفت

تیرہ سرانجام حریفی چو آہ
کرد سیاہی ز در بارگہ

جولقی زہر بلا خوردۂ
از رم طالع سر پا خوردۂ

از تب و تاب دل خویش اخگری
زیر لحاف کف خاکستری

بوده ز خاکستر اعضای او
کلفت نظاره سراپای او

هیچ گه از بخت نیاسودهٔ
چهره بگرد سفر اندودهٔ

سر بسر آئینهٔ عرض شکست
کهنه گلیمی و کدوی بدست

کهنه گلیمی که ز هر پینهٔ
پرده کشای غم دیرینهٔ

شام بلا از رقمش گردهٔ
سایهٔ چغد از اثرش پردهٔ

از اثر تیرگیش در نظر
دود دلی بسته تتق سر بسر

خشک کدو کاسهٔ ناشستهٔ‌ای
از نم زهر آب عنا رستهٔ‌ای

آب ز مغز سر مجنون درو
بادهٔ گلفام شدی خون درو

تا ز روش زهرهٔ بینش گداخت
سامعه آتشکدهٔ راز ساخت

گرد بلا بر سر نظاره ریخت
از نفس آهنگ بپیغاره ریخت

کای شه آزاده! گدا نیستم
طالب ایثار و عطا نیستم!

شانه‌کش طرهٔ سوداستم
با تو فروشندهٔ کالاستم

کز کرم آوازه در افگنده‌ای
شور صلایم بسر افگنده‌ای

بو، که متاعم بهائی رسد
وقت مرا از تو صفائی رسد

شه پس ازان کز نفسش راز جست
داد زر و دلق و کدو باز جست

برد گلیم و ز زرش مایه داد
مهر ببیعانگی سایه داد

رفت فروشنده و زر باز برد
مشتری آن جنس بخازن سپرد

گفت که این نقد بگنجینه به
جای دل اندر صدف سینه به

خود نه گلیم و نه کدو برده‌ایم
مادل غمدیدهٔ او برده‌ایم

گرچه بدین مایه چه بالیم ما
لیک چو در پرده سگالیم ما

در نظر مردم دانا دل است
نیک نگه دار همانا دل است

چون روش نیّر گیتی فروز
پرده فروهشته برخسار روز

خرقه بتن کرده ز کحلی پرند
چرخ بدریوزه بر آمد نژند

در خم و پیچ روش جستجو
شام گلیم آمد و ماهش کدو

شه بشبستان حرم جای کرد
اطلس افلاک ته پای کرد

خلوت ازو مژدهٔ آرام یافت
بستر خواب از تپش آرام یافت

قند بطوفان می ناب رفت
چشم جهان‌بین بشکرخواب رفت

تا نگهش پردگی کار شد
نقشی ازان پرده نمودار شد

دید ز تمثال سراپای حور
ریخت گل جلوه به جیب شعور

رایتی از نور برافراشته
پردهٔ رنگی بگل انباشته

پیکری از لطف فراهم شده
صافی آئینه مجسم شده

جلوهٔ گل مشعله‌دار رهش
فرّ ها گرد و غبار رهش

در نظر از شوخی اعضای او
بوده چمن خیز سراپای او

گل بگریبان جهاندار ریخت
زمزمهٔ رخصتی از تار ریخت

شاه فرومانده پژوهید راز
کای ز منت مژده بفرمای باز

کیستی و این همه تصدیع چیست؟
آئنه‌پردازی تودیع چیست؟
گفت که من دولت و مال توام!
آئنهٔ جاه و جلال توام!

شمع طرب، محرم نور از من است
روشنی بزم سرور از من است
بوده‌ام آئینهٔ تمثال تو
صورت معقولهٔ اقبال تو

بوی گلیمی بدماغم زدی
سیلی صرصر بچراغم زدی
هین که مرا از تو درین دیولاخ
حوصله تنگ است، بیابان فراخ

رفتم و وارستم از آزار تو
باد خدای تو نگهدار تو
همت شه عجز تقاضا نکرد
هیچ ازان عربده پروا نکرد

برگ رضا دادش و خوشنود کرد
دم ز شگرفی زد و پدرود کرد
برق دگر بر اثرش ریخت باز
جلوهٔ دیگر ز در آمد فراز

هیکلی از کوه تنومندتر
بوده ازو جبههٔ الوندتر
پیل‌تنی کز پئی عرض شکوه
رسته رگ گردنش از مغز کوه

چین جبینش ز غضب تیغ‌زن
تیزی تیغش شغب بخت تن

رند قوی پنجهٔ خصم افگنی
جم‌سر و برگی و تهمتن تنی

گفت منم قوت نیروی تو
طاقت سر پنجهٔ بازوے تو

حلقه بگوش توام ار سرکشم
آب توام گرچه نهاد آتشم

پشت من از مژدهٔ دولت قویست
دلق و کدو مایهٔ بی‌دولتیست

با تو دگر نام و نشانم مباد
جان بتن نکبتیانم مباد

بال‌فشان گشت ز دنبال رفت
بر اثر پیکر اقبال رفت

بسکه دران فتنه محابا نرفت
تاب و توان رفت و دل از جا نرفت

نوری ازان پرده برون تافت باز
دیدهٔ شه روشنی یافت باز

بوی گلی با نفس آمیخته
صورتی از مایهٔ جان ریخته

دامن برچیده بدست اندرش
هر مژه برهم‌زدنی شهپرش

چهره بخوناب جگر شستهٔ
چون نفس از پردهٔ دل رستهٔ

راد حریفی که چو ساغر زند
خون دو عالم بقدح در زند

رفتگی از غاشیه داران او
بیخودی از باج گذاران او

جلوه گری آفت نظارهٔ
برق ز تمثال [ ] وی انگارهٔ

رنگ گل آئینهٔ دیدار او
موج پری جوهر رفتار او

جلوهٔ جنت ز غبارش رمی
چشمهٔ کوثر ز محیطش نمی

نشه[۱] ز صهبا و رسیدن ازو
خون ز جگرها و دویدن ازو

ولوله در جان و دل شاه ریخت
طرح قیامت بنظرگاه ریخت

گفت من آئینهٔ ناز توام
همت آفاق گداز تو ام

آمده پیشم ز درت دورئی
آمده‌ام پیش تو دستورئی

شاه سر از ملتمسش[۲] باز زد
چنگ بدامان وی از ناز زد

گفت دریغا چه ستم میکنی
رام که‌ای کاین همه رم میکنی

۱- نول کشور طبع اول ''نشاهٔ زصهبا۔''
۲- طبع اول دهلی ''ملتمسش ساز زد۔''

فارغ از اندیشهٔ امید و بیم
گنج فشاندن بہای گلیم

مایهٔ تشویش نگہداشتن
خاطر درویش نگہداشتن

دولت و اقبال برانداختن
آئنه ، در رہگذر انداختن

بر اثر بخت روان باختن
دست و دل و تاب و توان باختن

آن همه پرواز ببال تو بود
شوخی آهنگ کمال تو بود

منکه کنون جز تو ندارم دگر
دامنت از کف نگزارم دگر[۱]

ریشهٔ مهر تو بجان منست!
مغز تو اندر سُتخوان منست!

شمع و چراغ شب تارم توای!
خاکم و سامان بہارم توای!

برق خرابی بسوادم مزن!
آتش حسرت بنہادم مزن!

ای ز تو کار دو جہان ساختن
چون تو نباشی چه توان ساختن

همت از آنجا که تقاضای اوست
کرسی نُہ پایه ته پای اوست

خواری سایل نپسندد همی
در برخ عجز نبندد همی

۱- طبع دهلی ''از کف نگذارم دگر'' مگر املا ےغالب مطابق طبع لکهنؤ۔

جوش گل از حسن خداداد زد
بوسه بدست شه آزاد زد
ریخت گل غمزه بجیب امید
داد ز خرسندی خویشش نوید
گفت که از بند غم آزاد باش!
من بتو شادم تو بمن شاد باش!
جان وفا زنده ببوی تو باد!
جلوهٔ من غازهٔ روی تو باد!
دولت و اقبال غلام تو باد!
تاب و توان بادهٔ جام تو باد!
کاین همه قایم بوجود من است
بل همه موجود ز جود من است
بال و پر نشه[1] ز صهباستی
دستگه قطره ز دریاستی
نشه بود دولت و صهبا منم
قطره بود سطوت و دریا منم
صورت من معنی آزادیست
پیشهٔ من مردمی و رادیست
همچو من آزاد و سبکبار شو
ده همه و هیچ خریدار شو
در شو و بر روی وفا باز باش
در ره دل خانه برانداز باش
در دل از آزار دل اندیشه کن
گنج برافشان و کرم پیشه کن

۱- طبع لکهنؤ ''نشاة زصهباستی.''

یاوری از بخت و کرامت ز تست
دیر بمان ای که سلامت ز تست
غالب افسرده دل و جان بیا!
بی سر و پا در صف رندان بیا!

بیخبران را خبری باز ده
زان می دیرین قدری باز ده
آن اثر پردهٔ سازت چه شد؟
زمزمهٔ خاره گدازت چه شد؟

آن ز جنون پرده کشائیت کو؟
ولولهٔ سلسله خائیت کو؟
آن نفس ناله کمندت کجاست؟
وان نگه جلوه پسندت کجاست؟

در هوس جاه فرورفته‌ای
حیف که در چاه فرورفته‌ای
راه غلط کرده بافسون دیو
میسپری مرحلهٔ رنگ و ریو

تا پی نیرنگ و فن افتاده‌ای
از نظر خویشتن افتاده‌ای
بندهٔ زر بودن از اهرمنی است
مرد خدا، اینچه خداد شمنی است!

آه! ز دنیا طلبی‌های تو
وین همه ابرام و تقاضای تو!
گرمی خونت که ازین پیش بود
صرف برانداختن خویش بود

آتش هنگامه بجان داشتی!
داغ مغان ، شیوه بتان داشتی!

بود بپیچ و خم سودای کار
کار تو چون زلف بتان تار و مار

بسکه همین تیره‌تر از شام بود
روز تو داغ دل ایام بود

چشم پریشان نظری داشتی
جلوه بهر ره‌گزری داشتی

بسکه بلا بر اثر انداختی
دیده بصد جا سپر انداختی

زان همه اجزای زمانی که رفت
وان همه خونابه فشانی که رفت

هر چه کنون میرسدم در نظر
شاهد و شعر است و شراب و شکر

چرخ بسا روز بگشت این چنین
آه ز عمری که گزشت این چنین

حال بدین مایه تباهی که هست
خاصه بدین روی سیاهی که هست

آن همه دیوانگی و جاهلی
وین همه ناکامی و بیحاصلی

آن همه بدمستی و تن‌پروری
وین همه شیادی و افسونگری

آن همه بیراهه‌روی های تو
وین همه بیصرفه‌دوی های تو

آن ز جنون برق بخرمن زدن
وین بخم دام هوس تن زدن
آن همه خون بوده و خاکست این
آن مرضی بود و هلاکست این

آن چه روش وین چه پسیچ است های
آن همه پوچ این همه هیچ است های
نیمه شب از عمر تو در خواب رفت
نیمه بپیمودن مهتاب رفت

هین که درین کارگه پیچ پیچ
ماحصل سعی تو هیچ است هیچ
نقد تمنا بکف افتاده گیر
خسروی دست بهم داده گیر

ای همه تن وسوسه سود تو کو ؟
دهر سراب است وجود تو کو ؟
هرچه ازین پرده هویداستی
نقش و نگار پر عنقاستی

هستی اشیا که غبار فناست
پرده کشای اثر سیمیاست
خلق که از وهم نمودیش هست
وهم تو دانست که بودیش هست

پیروی وهم مکن زینهار
سر ز گریبان حقیقت بیار
خیز و چو منصور نوای بزن!
هستی خود را سر پای بزن

خلق اگر روس وگر روم گیر
هرچه بجز حق همه معدوم گیر

آنکه درین پرده سگالی بود
از اثر همت عالی بود

ساقی همت که صلا میدهد
باده ز خم‌خانهٔ لا میدهد

کاتب توفیق که دم میزند
بر رقم غیر قلم میزند

همت اگر بال‌کشائی کند
صعوه تواند که همائی کند

نیر توفیق اگر بردهد
لاله عجب نیست کز اخگر دهد

همت ما نیز شهود حق است
هر چه بسنجیم وجود حق است

همت ما غیرت حق است و بس
کثرت ما وحدت حق است و بس

از اثر سطوت حق در کلام
حرف ز لب میرمدم والسلام!

پنجمین مثنوی موسوم به ''باد مخالف''

ای تماشائیان بزم سخن!
وی مسیحا دمان نادر فن!

ای گران مائگان عالم حرف!
خوش‌نشینان این بساط شگرف!

[1]ای سخن پروران کلکته!
وی زبان آوران کلکته!

هر یکی صدر بزم بارگهی
شمع خلوت سرای کارگهی

هر یکی پیش‌تاز قافلهٔ
هر یکی کدخدای مرحلهٔ

ای بشغل وکالت آماده
داد غم‌خواری جهان داده

ای شگرفان عالم انصاف!
بسفارت رسیده از اطراف

[2]ای سخن را طراز جان داده!
صفحه را ساز گلستان داده

عطر بر مغز گیتی افشانان
پهلوانان پهلوی دانان!

ای گرامی فنان ریختہ گو!
نغز دریا کشان عربده جو!

ای رئیسان این سواد عظیم
وی فراهم شده ز هفت اقلیم!

همچو من آرمیدهٔ این شهر
بهر کاری رسیدهٔ این شهر

۱- متفرقات غالب میں یہ چھٹا شعر ہے اور ''ای شگرفان عالم انصاف'' تک مسلسل ہے۔

۲- متفرقات غالب میں یہ تیسرا شعر ہے۔ ترتیب اشعار میں بہت اختلاف ہے۔

اسد الله بخت برگشته[1]
در خم و پیچ غیر سرگشته
گرچه ناخوانده میہان شہاست
بی‌سخن ریزه چین خوان شہاست

بتظلم رسیده است اینجا
بامید آرمیده است اینجا
آرمیدن دهید روزی چار
خسته‌ای را بسایهٔ دیوار

کار احباب ساختن رسم است
میہان را نواختن رسم است
آن ره و رسم کار سازی کو؟
شیوهٔ میہان نوازی کو؟

کیستم ؟ دل شکسته غمزدهٔ
بیدلی ، خستهٔ ، ستم‌زدهٔ!
برق[2] بیطاقتی بجان زدهٔ
آتش غم بخانمان زدهٔ

از گداز نفس بتاب و تبی
در بیابان یاس تشنه لبی
خس طوفانی محیط بلا[3]
سر بسر گرد کاروان فنا

۱- متفرقات غالب میں اس شعر کی روایت یوں ہے :
اسدالله خان هیچ مدان جاده پیمای وادی حرمان

۲- متفرقات غالب میں شعر یوں ہے :
برق بی تابیی بجان زدهٔ مست آتش بخانمان زدهٔ

۳- متفرقات غالب : ''خس طوفانی هجوم بلا ''

دردمندی ، جگر گداخته‌ٔ
از غم دهر زهره‌باخته‌ٔ
در آگاهی فنا زدهٔ
همه بر خویش پشت پا زدهٔ

چه بلاها کشیده‌ام آخر
که بدینجا رسیده‌ام آخر
بسیه‌روز غربتم بینید!
تیره شبهای وحشتم بینید!

انده دوری وطن نگرید!
غم هجران انجمن نگرید!
نه همین ناله و فغان بلبم
من و جان آفرین که جان بلبم!

مویه چون موی کرده است مرا
غصه بدخوی کرده است مرا
[1]ذوق شعر و سخن کجاست مرا!
کی زبان سخن سراست مرا!

دارم آری ، ز هرزه لائی خویش
نوحه بر خویش و بینوائی خویش!
گردش روزگار خویشتنم
حیرت کار و بار خویشتنم
با من این خشم و کین ، دریغ دریغ!!
من چنان ، تان چنین ، دریغ دریغ!!

۱- متفرقات غالب میں اس کے بعد یہ شعر بھی ہے :
انده خویش کرده زار مرا باسخن پروری چه کار مرا؟

بر غریبان کجا رواست ستم؟
رحم اگر نیست خود چراست ستم؟

ور بگویند ، ماجرائی رفت
از تو در گفتگو خطائی رفت

مهربانان ، خدایرا انصاف!
تا نخست از که بود رسم خلاف

نمک اندر سبوی می که فگند؟
بچمن رستخیز دی که فگند؟

زلف گفتار را که درهم کرد؟
بزم اشعار را که برهم کرد؟

''همه عالم غلط که گفت نخست؟
پارۀ زین نمط که گفت نخست

''بیش'' را ''بیشتر'' که گفت بمن؟
بد زمن پیشتر که گفت بمن؟

''موی را بر کمر'' که گفت غلط؟
شعر را سر بسر که گفت غلط؟

چون بدیدید کاعتراض خطاست
هر چه غالب نوشته‌است بجاست

رشتهٔ باز پرس تاب که داد؟
معترض را ز من جواب که داد؟

چون بدیدید بیگناهی من
تان نشستید روسیاهی من

هر که دیدم ، ره خموشی رفت
بود لازم برآن گرفت ، گرفت

از چه بود آن بعرصه دم نزدن؟
در ره آگہی قدم نزدن؟
نکشودن لبی بیاوریم
خیره بگذاشتن بداوریم

تا بشورید دل ز بیچگری
بفغان آمدم ز خیره سری
از غم دل ستوه گردیدم
چہره با یک گروه گردیدم

گله مندانه گفتگو کردم
پارۂ در سخن غلو کردم
چون شنیدم که نکته پردازان
قدر دانان و انجمن سازان

از من آزرده اند زان پاسخ
بنیایش بخاک سودم رخ
خجلت آوردم و جنون کردم
خویشتن آب و دیده خون کردم

آب گردیدم و چکیدم من
قطره آسا بسر دویدم من
نفس من بجمع درنگرفت
کس نیازم بہیچ برنگرفت

روی دعوی بسویم آوردند
سخن من برویم آوردند
داغ گشتم ازان ملامتہا
سوختم از تف ندامتہا

نه امیدم ز شاعریست، نه بیم
بود شایسته مر مرا تسلیم

کاش[۱] با اعتراض ساختمی
ناله در زیر لب گداختمی

زان که آنهم رضای یاران بود
رنگی از جوش این بهاران بود

خار دامان دوستان بودن
خوشتر از باغ و بوستان بودن

دیگرم با هزار رنگ خروش
این نوا میخورد بپردهٔ گوش

که دگر بلبلی صفیر زده است
طعنه بر طعنهٔ فقیر زده است

وای با آنکه شعر من صاف است
''زده'' را میزند چه انصاف است؟

اعتراض آتشم بجان زده است
شعله در مغز استخوان زده است

''زده'' را کسره از ظرافت نیست
یای وحدت بود، اضافت نیست

واضع طرز این زمین نه منم
درخور سرزنش همین نه منم

۱- متفرقات غالب میں ایک شعر زائد ہے اور ترتیب یوں ہے :
زانکه آنهم رضای یاران بود رنگی از جوش این بهاران بود
کاش با اعتراض ساختمی ناله در زیر لب گداختمی
رخ دعویِ نه برفروختمی بیزبان همچو شمع سوختمی

دیگران نیز گفته اند چنین
گوهر راز سفته اند چنین

شورش آماده رفته اند همه
هم برین جاده رفته اند همه

در نورد گذارش زده ها
کرده اند از نشاط عربده ها

اکثر از عالم ''شتاب زده''
''می زده'' ''غمزده'' ''شراب زده''

'می زده' 'غمزده' که ترکیب است
بقیاس فقیر تقلیب است

چون برآید ز انگبین مومش
''زدهٔ غم'' دمد ز مفهومش

لیک در بعض جا نه در همه اش
لفظ ''مارے ہوئے'' است ترجمه اش

وین[۲] خود از شان فاعل است که هست
حق بود حق نه باطل است که هست

همچنان آن محیط بی ساحل
قلزم فیض ، میرزا بیدل

۱- غزل غالب که شاید مورد اعتراض است :
کیستم ، دست به مشاطگی جان زدهٔ
گوهر آمای نفس از دل دندان زدهٔ
متفرقات غالب میں دو شعر زائد ہیں :
حاصل معنی ای ذوی الافهام میتراود ازین سیاق کلام
ایک مدت سے یاں ہم آئے ہوئے بیٹھے ہیں آپ کو مٹائے ہوئے
۲- طبع دہلی ''و این خود''۔

از محبت حکایتی دارد
که بدینان بدایتی دارد
''عاشقیا، بیدلے، جنون زدۂ
قدح آرزو بخون زدۂ''
اوّلش خود مضاف مقلوب است
دو یمین تا کدام اسلوب است
کرده ام عرض همچنان ''زدۂ''
طعنه بر بحر بیکران زدۂ؟
مگر این شعر زان نمط نبود
ور بود شعر من غلط نبود
گرچه بیدل ز اهل ایران نیست
لیک همچون قتیل نادان نیست
صاحب جاه و دستگاهی بود
مرو را زین نمد کلاهی بود
نه غلط گفته است در خود گفت
راست گویم در آشکار و نهفت
دعوئ بنده بی سر و بن نیست
شعر بیدل بجز تفنن نیست
پارۂ از کلام اهل زبان
می فرستم بخدمت یاران
تا بدین پرده آشنا باشند
با من زار همنوا باشند
وه، که دیگر ز جاده بر گشتم
خیره بودم، سفیه تر گشتم

۱- بیدل کا شعر 'زدہ' کی سند اور معترض کے جواب میں پیش کیا گیا ہے۔

وعدهٔ خامشی ز یادم رفت
شیوهٔ عجز از نهادم رفت

ساده لوحم مرا چه رنگ و چه ریو
آوخ ، آوخ، ز جاهلانه غریو

من که و عزم داوری کردن؟
ساز بزم سخنوری کردن؟!

خاک پاے سخن ورانستم
دوستان را ، ز کهترانستم

با بزرگان ، نیازها دارم
هم بدین شیوه ، نازها دارم

بنده ام بنده مهربانان را
رمز فهمان و نکته دانان را

نه ز آویزش بیان ترسم
من و ایمان من ، کزان ترسم

که پس از من بسالهای دراز
بزبان ماند این حکایت باز

که سفیهی رسیده بود اینجا
چند روز آرمیده بود اینجا

با بزرگان ستیزه پیش گرفت
زحمتی داد و راه خویش گرفت

شوخ‌چشمی و زشت خوی بود
بی‌حیای و هرزه گوی بود

هم سفیهانه گفتگوی داشت
هم خراباتیانه هوی داشت

برگ دنیا نه ساز دینش بود
ننگ دهلی و سرزمینش بود

آه ، ازان دم که بعد رفتن من
خون دهلی بود بگردن من

تابوم ، رنج دوستان باشم
بر دل انجمن گران باشم

شاد گردند کز میان بروم
آوخ ، از من که من چنان بروم

خسته و مستمند برگردم
دژم آیم ، نژند برگردم

به‌وداعم ، کس از شما نرسد
شوق را مژدهٔ وفا نرسد

زین سپس نیست دعویٔ سخنم
ندمد دود شمع ز انجمنم

ناله بی صرفه ، چون جرس نزنم
بی صدا گردم و نفس نزنم

نشکنم بر رخ بیان رنگی
برنخیزد ز سازم آهنگی

تاب هنگامه ام ، خدارا نیست!
مهربانان دلست ، خارا نیست!

وین که در پیشگاه بزم سخن
بزبانها فتاده است زمن

که فلان با قتیل نیکو نیست
مگس خوان نعمت او نیست

زله بردار کس چرا باشم؟
من همایم مگس چرا باشم!

خود کسی نا سزا چرا گوید
ناسزا آنکه ، ناسزا گوید

فیضی از صحبت قتیلم نیست
رشک بر شهرت قتیلم نیست

نه هوا خواهیٔ نه دشمنیٔ
درمیانست پای ، همفنیٔ

حاش لله ، که بد نمیگویم
وانهم از پیش خود نمیگویم

مگر آنان که پارسی دانند
هم برین عهد و رای و پیمانند

که ز اهل زبان نبود قتیل
هرگز از اصفهان نبود قتیل

لاجرم اعتماد را نسزد
گفته‌اش استناد را نسزد

کاین زبان خاص اهل ایران است
مشکل ما و سهل ایران است

سخن است آشکار و پنهان نیست
دهلی و لکهنؤ ز ایران نیست

دوستان را اگر ز من گله است
که خرامت خلاف قافله است

می رویم از پی قتیل همه
ساخته مرو را دلیل همه

تو ازین حلقه ، چون بدر زدهٔ
گام بر جادهٔ دگر زدهٔ

ای تماشائیان ژرف‌نگاه
هان ، بگوئید حسبهً لله

که چسان از حزین بپیچم سر
آن بجادو دمی ، بدهر سحر

دل دهد ، کز اسیر برگردم
زان نو آئین صفیر برگردم

دامن از کف کنم چگونه رها
طالب و عرفی و نظیری را

خاصه روح و روان معنی را
آن ظهوری جهان معنی را

آنکه از سرفرازی قلمش
آسمان ساست پرچم علمش

طرز اندیشه آفریدهٔ اوست
در تن لفظ جان دمیدهٔ اوست

پشت معنی قوی ، ز پهلویش
خامه را فربهی ز بازویش

طرز تحریر را نوی از وی
صفحه ارتنگ مانوی از وی

فتنهٔ گفتگوی اینانم
مست لای سبوی اینانم

آن که طی کرده این مواقف را
چه شناسد قتیل و واقف را

لیک با آن همه که این دارم
گنج معنی در آستین دارم
دل و جانم فدای احباب است
شوق وقف رضای احباب است

میشوم خویش را بصلح دلیل
میسرایم نوای مدح قتیل
تا نماند زمن دگر گله‌ٔ
رسد از پیروان وی صله‌ٔ

گفتن آئین هوشیاری نیست
لیک دانستن اختیاری نیست
گرچه ایرانیش نخواهم گفت
سعدی ثانیش نخواهم گفت

لیک از من هزار بار به است
از من وهمچو من هزار به است
من کف خاک و او سپهر بلند
خاک را کی رسد، بچرخ کمند

وصف او حدّ چون منی نبود
مهر در خورد روزنی نبود
مرحبا ، ساز خوش بیانی او
حبّذا ، شور نکته دانی او

نظمش ، آب حیات را ماند
در روانی ، فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است
انتخاب صراح و قاموس است

پادشاهی که در قلمرو حرف
کرده ایجاد نکته‌های شگرف
خامه هندوی پارسی دانش
هندیان ، سر بخط فرمانش
این رقمها که ریخت کاک خیال
بود سطری ز نامهٔ اعمال
از من نارسای هیچ مدان
معذرت نامه‌ایست زی یاران
بو ، که آید ز عذر خواهی ما
رحم بر ما و بیگناهی ما
[1] آشتی نامهٔ وداد پیام
ختم شد والسلام والاکرام

[2] بیان نموداری شان نبوت و ولایت که در حقیقت پرتوِ نور الانوار حضرت الوهیت است

مثنوی ششم

بعد حمد ایزد و نعت رسول
مینگارم نکتهٔ چند از اصول
تا سوادش بخشد اندر رسم و راه
دیده‌ور را سرمه ، اعمیٰ را نگاه

۱- طبع اول دهلی ''کاش شد نامهٔ وداد تمام۔''
قلمی دیوان ۱۸۳۸ع میں بھی ۱۰۴ شعر ھیں لیکن متفرقات میں ۱۷۶ شعر ھیں اور قاضی عبدالودود صاحب کی شایع کردہ مثنوی میں شاید کچھ اور تعداد ہے ۔
ـ طبع دھلی کی یہ آخری مثنوی ہے، اس کے بعد ''فاتحہ''
''بہر ترویج جناب والی یوم الحساب'' ہے ۔
۲- یہ مثنویاں کلیات طبع اول لکھنؤ سے نقل کی جارھی ھیں ۔

حق بود حق ، کآمد از نورش پدید
آسمان ها و زمین ها را کلید

نور محض و اصل هستی ذات اوست
هرچه جز حق بینی از آیات اوست

تا بخلوت گاه غیب الغیب بود
حسن را اندیشه سر در جیب بود

صورت فکر اینکه باری چون کند؟
تا ز جیب غیب سر بیرون کند

جلوه کرد از خویش هم بر خویشتن
داد خلوت را فروغ انجمن

جلوهٔ اول که حق برخویش کرد
مشعل از نور محمد ص پیش کرد

شد عیان زان نور در بزم ظهور
هرچه پنهان بود از نزدیک و دور

همچو آن ذرات کاندر تاب مهر
از نقاب غیب بنمایند چهر

مهر بر ذرات پرتو افگنست
عالم از تاب یک اختر روشنست

نور حقست احمد ص و لمعان نور
از نبی در اولیا دارد ظهور

هر ولی پرتو پزیرست از نبی
چون مه از خور مستنیرست از نبی

جلوهٔ حسن ازل مستور نیست
لیک اعمی را نصیب از نور نیست

از نبی و از ولی خواهی مدد
تا نه پنداری که ناجائز بود

بر نیاید کار بی فرمان شاه
لیک آئینهاست باخاصان شاه

هر که او را نور حق نیرو فزاست
هر چه از وی خواستی هم از خداست

بر لب دریا گر آبی خوردهٔ
آب از موجی بجام آوردهٔ

آب از موج آید اندر جام تو
لیکن از دریا بود آشام تو

وقت حاجت هر که گوید ''یا علیؑ''
باحقش کارست و پوزش با علیؑ

''یا محمدؐ'' جان فزاید گفتنش
''یا علیؑ'' مشکل کشاید گفتنش

چون اعانت خواهی از یزدان پاک
''یا معین‌الدین'' اگر گوئی چه باک؟

ابلهان را زانکه دانش نارساست
گفتگو ها بر سر حرف نداست

مولوی معنوی عبدالعزیز
وان رفیع الدین دانشمند نیز

شاه عبدالقادر دانش سگال
کاین دو تن را بود در گوهر همال

بردن نام نبی و اولیا
خود روا گفتند باحرف ندا

وان دگر فرزانهٔ قدسی سرشت
رہنمای مسلک پیران چشت
آنکه شیخ وقت و خضر راه بود
نام والایش کلیم الله بود

گفت : استمداد از پیران رواست
هرچه پیر راه گوید آن رواست
کی غلط گوید چنین روشن ضمیر
خرده بر قول کلیم الله مگیر

همچنین شیخ المشائخ فخر دین
آفتاب عالم علم و یقین
همبرین هنجار و آئین بوده است
شیخ ما حق گوی و حق بین بوده است

تا نه پنداری زپیران خواستیم
حاجت خود را زیزدان خواستیم
لیک در پوزش بدرگاه رفیع
ما همی آریم پیران را شفیع

اینچنین پوزش روا نبود چرا؟
بحث با عارف خطا نبود چرا؟
ور سخن در مولد پیغمبرست
بزمگاه دلکش و جان پرورست،

خود حدیث از سرور دین میرود
میرود وانگه بآئین میرود
سعی ما مشکور و نقد ما روا
چیست آن کان را شماری نا روا

نکهت موی مبارک جانفزاست
یا رگ جانش همی پیوندهاست

بر تن نیکو تر از جان رسته است
لاجرم از آب حیوان رسته است

دلنشین ما بود زان روی موی
وه که گرداند کسی زان موی روی

هر کرا دل هست و ایمان نیز هم
چون نورزد عشق با "نقش قدم"

در ره دین تا قدم بنهاده اند
عشقبازان را نشانها داده اند

برد از خویشم دو صد فرهنگ رشک
می برم زین نقش پا برسنگ رشک

نقش پائی کاینچنین افتاده است
اهل دل را دلنشین افتاده است

کی نشیند در دل آن بدگهر
کش دلی از سنگ باشد سخت تر

بوی پیراهن بمصر آرد صبا
دیدهٔ یعقوب زو یابد جلا

بر ردا و پیرهن کز مصطفیٰ ص ست
جان نیفشاندن ز اُمت کی رواست؟

در عرب بودست منعم زادهٔ
قیس نامی، دل به لیلیٰ دادهٔ

بر سگی کز کوچهٔ لیلاستی
قیس از خویشش فزونتر خواستی

میتوانی گفت هان ای تن پرست!
پیر کنعان بود پیراهن پرست؟
یاتوان گفتن که خود چون بوده است
سگ پرستی کیش مجنون بوده است؟

"حاش لله! کاینچنین باشد نورد
رفت از حد سوی ظن کافر نکرد
عشق گر با پیرهن ور با رداست
نیست بهر جامه از بهر خداست

حق فرستادست بهر ما رسول
کرده ایم از بهر حق دینش قبول
گر بسوی خواجه رو آریم ما
دوست از بهر حقش داریم ما

چون نگردد طالب دیدار دوست
شاد از نظارهٔ آثار دوست
ایکه بردی بهره از خوان نبی
بردهٔ از یاد احسان نبی

آمد و آورد پیغام از خدا
"لوحش الله" مرحبا نام خدا
جادهٔ راهی نمایان کرد و رفت
راه رفتن بر تو آسان کرد و رفت

چون تو کی از ناسپاسانیم ما
پیرو ایزد شناسانیم ما
حق پرستان جمله این ره رفته اند
زان که با دلهای آگه رفته اند

اصل ایمانست طرز خاص ما
خالصاً لله بود اخلاص ما

عرس واین شمع و چراغ افروختن
عود در مجمر بر آتش سوختن

جمع گشتن در یکی ایوان همی
پنج آیت خواندن از قرآن همی

نان بنان خواهندگان دادن دگر
مرده را رحمت فرستادن دگر

گر پی ترویج روح اولیاست
در حقیقت آنهم از بهر خداست

اولیا را گر گرامی داشتیم
نز پیٔ رومی و شامی داشتیم

از برای آنکه این آزادگان
از ره حق جان بجانان دادگان

از شهود حق طرازی داشتند
با خدای خویش رازی داشتند

نور چشم آفرینش بوده اند
شمع روشن ساز بینش بوده اند

حق پرستانرا بباطل کار نیست
محو لیلیٰ را به محمل کار نیست

گر نه از لیلیٰ بود دیدار جوی
کی به محمل آورد دیوانه روی؟

گر چه با لیلیست حرف از جان زدن
لیک بر محمل اکد نتوان زدن

آن ولی در یاد حق مستغرقست
عین حق گر نیست خود محو حقست
حق بود پیدا نہاں دیگر چه ماند؟
چون ولی رفت از میان دیگر چه ماند؟

خیز تا حد ادب داری نگاه
بی ادب را بر دم تیغست راه
با ولی آویختی دیوانهٔ
یا بر آتش ریختی پروانهٔ

نیستی عارف که گویم خود مباش
بد مبین و بد مگوی و بد مباش!
بد شمردی رهروان پیش را؟
رهرو چالاک گفتی خویش را؟

گر سفر اینست منزلگه کجاست؟
"لا اله" گفتی "الّا الله" کجاست
هست رسم خاص در هر مرز بوم
خود چه میخواهی ز نفی این رسوم

نفی رسم کفر ما هم می کنیم
داد با دانش فراهم می کنیم
نفی کفر آئین ارباب صفاست
نفی فیض ای تیره دل! رسم کجاست؟

نفی رسم و ره هوا را می کشد
نفی فیضست اینکه ما را می کشد
ای گرفتار خم و پیچ خیال!
نفی بی اثبات نبود جز ضلال!

ور تو گوئی "میکنم اثبات حق"
از چه روئی منکر آیات حق؟

دانم از انکار انکار آوری
پیچشی در زلف گفتار آوری

منکر اثبات گوئی نیستم
من حریف این دو روئی نیستم

اولیا خاصان شاهی نیستند
یعنی آیات الٰہی نیستند

معجزات انبیا آیات کیست؟
وین صفتها را ظهور از ذات کیست؟

این و آن را هرزه انگاری همی
تا چه از حق در نظر داری همی

چون ترا انکار تا این غایتست
آنچه پزرفتی کدامی آیتست؟

من نه بد گفتم وگر گفتم مرنج!
تو کرا بد گفتهٔ در دل بسنج!

خواجهٔ دنیا و دین را منکری!
زمرهٔ اهل یقین را منکری!

با دل رنجیدهٔ از کینه پاک
منکری را گر بوم منکر چه باک؟

درد دل در نظم گفتن نیست بحث
منکه رندم شیوهٔ من نیست بحث

من سبکروحم گرانجان نیستم
صد نشان پیداست پنهان نیستم

وین که میگوئی توانا کردگار
چون محمدؐ دیگری آرد بکار
با خداوند دو گیتی آفرین
ممتنع نبود ظهوری این چنین

نغز گفتی نغز تر باید شنفت
آنکه پنداری که هست اندر نهفت
گرچه فخر دودهٔ آدم بود
هم بقدر خاتمیت کم بود

صورت آرایش عالم نگر
یک مه و یک مهر و یک خاتم نگر
اینکه میگویم جوابی بیش نیست
مهر و مه زان جلوه تابی بیش نیست

آنکه مهر و ماه و اختر آفرید
میتواند مهر دیگر آفرید
حق دو مهر از سوی خاور آورد
کور باد آن کو نه باور آورد

قدرت حق بیش ازین هم بوده است
هرچه اندیشی کم از کم بوده است
لیک در یک عالم از روی یقین
خود نمی گنجد دو ختم المرسلین

یک جهان تا هست یک خاتم بس ست
قدرت حق را نه یک عالم بس ست
خواهد از هر ذره آرد عالمی
هم بود هر عالمی را خاتمی

هر کجا هنگامهٔ عالم بود
رحمتهً للعالمینی هم بود

کثرت ابداعِ عالم خوبتر
یا بیک عالم دو خاتم خوبتر؟

در یکی عالم دوتا خاتم مجوی!
صد هزاران عالم و خاتم بگوی

غالب! این اندیشه نپزیرم همی
خرده هم بر خویش می گیرم همی

ایکه ختم المرسلینش خواندهٔ!
دائم از روی یقینش خواندهٔ

این "الف لامی" که استغراق راست
حکم ناطق معنی اطلاق راست

منشاء ایجاد هر عالم یکیست
گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

خود همی گوئی که نورش اولست
از همه عالم ظهورش اولست

اولیت را بود شانی تمام
کی بهر فردی پزیرد انقسام

جوهر کل برنتابد تثنیه
در محمدؐ ره نیابد تثنیه

تا نورزی اندر امکان ریو و رنگ
حیّز امکان بود بر مثل تنگ

میم امکان اندر احمدؐ منزویست
چون ز امکان بگزری دانی که چیست؟

صانع عالم چنین کرد اختیار
کش بعالم مثل نبود زینهار

این نه عجزست اختیارست ای فقیه!
خواجه بی همتا بود لاریب فیه

هر کرا با سایه نه پسندد خدا
همچو اوئی نقش کی بندد خدا؟

هم گہر مہر منیرش چون بود؟
سایه چون نبود نظیرش چون بود؟

منفرد اندر کمال ذاتیست
لاجرم مثلش محال ذاتیست

زین عقیدت بر نگردم والسلام
نامه را درسی نوردم والسلام

تہنیت عید شوال

مثنوی هفتم

باز برانم که به دیبای راز
از اثر ناطقه بندم طراز

باز برانم که درین جلوه گاه
غازه نہم بر رخ خورشید و ماه

باز ز انداز رسای سخن
بافته ام دام ہای سخن

باز بآهنگ سخن گستری
ساخته ام خامه ز بال و پری

پای فرو رفته قلم را بگنج
خامه برقصست و نفس نغمه سنج
رند جهان سوز ملامت کشم
خود ز دوگیتی بخیالی خوشم

من نه همین پیکر آب و گلم
راز فراوان بود اندر دلم
یافته ام منصب کار آگہی
خاصه بتوقیع بہادر شہی

جوہر نابم من و شه جوہریست
خوبی آئینه زر و شنگریست
جنبش کلکم بہواے شہست
نازش نطقم به ثنای شہست

کرده قلم از گہر شاهوار
بہر شہنشاه فراهم نثار
نیست دوئی در روش دین من
شاه پرستی بود آئین من

آنکه ز شاهیست نشانمندیش
چون نه پزیرم بخداوندیش
پیشهٔ من جمله ثنا گستریست
کار خداوند رهی پروریست

باشدم از فرّهٔ انوار شاه
فرخی عید بدیدار شاه
خامهٔ من گشته بتقریب عید
قفل در گنج سخن را کلید

نکته طرازی بمن آموخت عید
سینه بنور خرد افروخت عید
تا حرم از هند درازست راه
بسته ام احرام در پادشاه

گر نتوان گشت بگرد سرش
جبهه توان سود بخاک درش
طلعت شاه آیینهٔ حق نماست
حق طلبان پیرو و شه پیشواست

شاه فروزان رخ فرخ گهر
قبلهٔ ارباب نظر بو ظفر
خسرو فرزانهٔ فیروز بخت
هم ز ازل وارث دیہیم و تخت

عالم و این نعمت الوان او
زلهٔ از خوان نیاگان او
تا جوران قافله در قافله
راست چنان دان که درین سلسله

راست بآدم رسد ار بنگری
سروری و شاهی و پیغمبری
آنکه چو شمع خرد افروخته
مشتری از وی ادب آموخته

ور بخدنگ افگنی آورده روی
از قدر انداز قدر برده گوی
قهرش اگر تفرقه افگن شود
امیه غارت گر گلشن شود

حفظش اگر عام کند ایمنی
شمع پزیرد ز هوا روشنی
عزمش اگر بانگ بر اشهب زند
قافلهٔ خور بدل شب زند

لطفش اگر وایه به گلخن دهد
آتش و دودش گل و سوسن دهد
مدح شهنشاه همایون نژاد
نیست نوای که توان ساز داد

زین همه اندیشه که من میکنم
گدیهٔ اقبال سخن میکنم
ور نبود حلقه برین در زدن
گام ز اندازه فراتر زدن

چون بسخن دسترس او بود
بنده همان به که دعا گو بود
خواسته غالب بسخن گستری
تازگی طرز ستایشگری

زاهل سخن هر که طرازد ثنا
خاتمهٔ آن نبود جز دعا
شیوهٔ گفتار بآئین خوشست
حرف دعا از پس تحسین خوشست

نکته سرایان فروهیده فن
جاده شناسان طریق سخن
حرف دعا چون بزبان آورند
شرط جزای بمیان آورند

منکه ندانم سخن آراستن
بس بود اینم ز خدا خواستن
دولت شه دولت جاوید باد!
تا ابدش عید پس از عید باد!

در تهنیت عید بولی عهد
مثنوی هشتم

منکه درین دائرۂ لاجورد
کرده ام از حکم ازل آبخورد
پیکرم از خاک و دل از آتشست
روشنی آب و گل از آتشست
آتشم آنست که دودیش نیست
بر نمط شعله نمودیش نیست
سوخته ام لیک نسوزنده ام
آتش بی دود فروزنده ام
آتشم اما بفروغ و فراغ
روشنی شمعم و نور چراغ
ای که زنی دم زهواخواهیم
شمعم و دانی که سحرگاهیم
دارم ازین زمزمه شرمندگی
پرتو مهرم بدرخشندگی
پرتو خورشید[۱] گر افتد بخاک
هست ز آلودگی خاک پاک

۱- در رسم خط غالب " خورشید " بدون واو می باشد چنانکه در نسخه نول کشور طبع اول چاپ شده است یعنی " خرشید " ــ فاضل

خصم گر این نکته شمارد دروغ
غم مخور اینک من و اینک فروغ

نی نی اگر راست سرایم همی
مهر جهانتاب نشایم همی

ذره ام و دیدهٔ بدخواه کور
ذره ز خورشید پزیرفته نور
خاک ره از روشنی آفتاب
جلوه فروشد که منم خویشتاب

ذره اگر بال اناالشرق زد
هم ز درخشانی آن برق زد
با که توان گفت که این تاب چیست
ذره منم مهر جهانتاب کیست؟

مهر ولی عهد شهنشاه عهد
زیب فزایندهٔ این هفت مهد

روشنی چشم ظفر فتح ملک[1]
فرخ و فرخنده گہر فتح ملک

هم بدهش داور فریاد رس
هم بسخن خسرو مشکین نفس
حسن بہار آینه[2] روی او
نکہت گل توشه کش خوی او

کارگه بارگہش نه سپہر
خاک نشینان رهش ماه و مہر

۱- مرزا فتح الملک بہادر پور بہادر شاه ظفر۔فاضل
۲- مرزا غالب آینه را بدون همزه می نوشت۔فاضل

قیصر و فغفور گدای درش
یافته اوج نظر از منظرش

باد فروش سر راهش بهار
گشته غزلخوان بنوای هزار

گوی فلک در خم چوگان اوست
نازش ایام بدوران اوست

باد گر اورنگ سلیمان برد
چون بود اکنون که نفرمان بود

باد خود از بندگی آزاد نیست
توسن شه چیست اگر باد نیست

دهر به گیتی دگر آئین نهاد
تخت نهاد آن یک و این زین نهاد

در روش کوکبهٔ خسروی
قاعده آنست که در رهروی

زین چو فرا پشت تگاور نهند
غاشیه بر دوش سکندر نهند

گردد اگر دوش سکندر فگار
خضر برد غاشیهٔ شهریار

شکر که سعیم زقلم کام یافت
تهنیت عید سر انجام یافت

پایهٔ سلطان بلند آستان
برتر ازانست که گفتن توان

غالب اگر دم ز ثنا زد مخند
گو نکند دعوی ناسود مند

داد نشانی زثنا خوانیش
لیک نه در خورد جهانبانیش

گرچه به از نظم نظامیست این
مدح خوان خط غلامیست این

گویم و دانم که زگفتار من
تازه شود رونق بازار من

لیک حق مدح نگردد ادا
هیچ نیابد زمن الّا دعا

کار نه از روی ریا میکنم
نیمشب آهنگ دعا میکنم

با تو بگویم که چگویم همی
بهر شه از دهر چه جویم همی

طالع اسکندر و آن فرخی
زندگی خضر بدان فرخی

با نفسم فیض سحریار باد!
سینهٔ من مشرق‌انوار باد!

دیباچه نثر موسوم به بست و هفت افسر تصنیف حضرت فلک رفعت شاه اوده

مثنوی نهم

بنام ایزد زهے مجموعهٔ راز
شگفت آور تر از نیرنگ و اعجاز

نه جادو لیک هوش افزا فسونی
جهان را سوی دانش رهنمونی

تعالی الله! کتابی مستطابی
غلط گفتم فروزان آفتابی

پری پروانه شمعی عالم افروز
سوادش شب ولی روشن تر از روز

زبس خوبی سزد بهر سوادش
سویدای دل مردم مدادش

سوادش زلف مشکینی که با اوست
هزاران نکته کان باریک چون موست

بیاضی کاندران بین السطور است
تو گوئی موجی از دریای نور است

مگر خود: چشمهٔ نور است و از وی
بهر سو موج می خیزد پیا پی

بود هر موج از عنبر نشان مند
که دارد جا بجا با سطر پیوند

ید بیضا خریدار بیاضش
که بادا گرم بازار بیاضش

ستودم لیک وصفش نی زمن پرس
هم از سلطان انجم انجمن پرس

که راز دهر در دفتر نگارد
همایون ,,بست و هفت افسر'' نگارد

شه فرزانه چندین افسرش بین
بهر افسر جهان دیگرش بین

همانا جم حشم سلطان۱ عالم
بهم آمیخته ارکان عالم

طلسمی بسته اندر افرینش
که افزاید فروغ چشم بینش

۱- سلطان عالم ، لقب حضرت واجد علی شاه سلطان اوده است ـ فاضل

بکف ابر و بدل دریاست سلطان
بدانش گوهر یکتاست سلطان

بهلهو ار سلکی از لوهر گسسته
ز دانش نیز نقش چند بسته

اگر یابی ز بازی داستان ها
زدین و دادهم بینی نشانها

نئی کلکش که بزم آراست از حرف
بشاخ گلبنی ماناست از حرف

که نتواند گرانی را تحمل
نگون گردد ز بار غنچه و گل

بدان ظلمت همی ماند دوآتش
که باشد درمیان آب حیاتش

سکندر طالعی ، جم بارگاهی
ثریا منظری ، انجم سپاهی

به دارائی خردمند یگانه
به دانائی شهنشاه زمانه

پر از راز دو عالم سینهٔ او
زهی شاه و زهی گنجینهٔ او

کفش از پنجهٔ خور زرفشان تر
رگ کلکش زکف گوهر فشان تر

اگر مانی همی نازد به ارتنگ
فرو خور خشم و بگزر گوهر و سنگ

نگارستان معنی بین که دانی
که بی معنیٰ است صورتهای مانی

نینگیزد چنین نقش ارچه مانیست
که آن صورت بود وین خود معانیست

چو بینی این نقوش دلنشین را
طراز شاه معنی آفرین را

سزد گر ''نیّر اعظم[۱]'' نهی نام
که از نامش بر آید سال اتمام

وگر باید ازین خوشتر گهر سفت
ریاض ملک معنی میتوان گفت

سپس بهر بقای حامی دین
دعا از غالب و از خلق آمین

شهنشه را حیات جاودان باد
بهارستان جاهش بیخزان باد!

تقریظ ''آئین اکبری'' مصحححہ سید احمد خان صدر الصدور مراد آباد

مثنوی دهم

مژده یاران را که این دیرین کتاب
یافت از اقبال سیّد فتح باب

۱- غالب مادۂ تاریخ از '' نیّر اعظم'' و از ''ریاض ملک معنی'' گرفته که عددش ۱۲۸۱ ھ می شود تا حال معلوم نه شد که ایں مثنوی حضرت واجد علی شاه چاپ شد یا نه - آقای مسعود حسن ادیب می نویسند که شاید ایں کتاب وجود نه داشته باشد مانند کتابیکه امیر مینائی به آں چیزی نوشته - و لیکن بنده می گوید که عدم الوجدان لایدل علی عدم الوجود بسیار کتاب هاست که در لندن و کتاب خانه های دیگر از واجد علی شاه تازه کشف کرده اند که ما خبر نداشتیم - (فاضل)

یده بینا آمد و بازو قوی
کهنگی پوشید تشریف نوی

وینکه در تصحیح ''آیین'' رای اوست
ننگ و عار همت والای اوست

دل بشغلی بست و خود را شاد کرد
خود مبارک بندهٔ آزاد کرد

گوهرش را آنکه نتواند ستود
هم بدین کارش همیداند ستود

برچنین کاری که اُصلش این بود
آن ستاید کش ریا آئین بود

من که آیین ریا را دشمنم
در وفا اندازه‌دان خود منم

گر بدین کارش نگویم آفرین
جای آن دارد که جویم آفرین

با بدآئینان نمانم در سخن
کس نداند انچه دانم در سخن

کس مخر باشد بگیتی این متاع
خواجه را چه بود امید انتفاع

گفته باشد کاین گرامی دفتراست
تا چه بیند کان بدیدن درخور است

گر ز آیین میرود با ما سخن
چشم بکشا واندرین دیر کهن

صاحبان انگلستان را نگر
شیوه و انداز اینان را نگر

تا چه آیینها پدید آورده‌اند
آنچه هرگز کس ندید ، آورده‌اند

زین هنرمندان هنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیان پیشی گرفت

حق این قوم‌ست ''آیین'' داشتن
کس نیارد ملک به زین داشتن

داد و دانش را بهم پیوسته‌اند
هند را صد گونه آیین بسته‌اند

آتشی کز سنگ بیرون آورند
این هنرمندان ز خس چون آورند

تاچه افسون خوانده اند اینان بر آب
دود کشتی را همی راند در اب

گه دخان ، کشتی بجیحون میبرد
گه دخان ، گردون بهامون میبرد

غلتک گردون بگرداند دخان
نره‌گاو و اسپ را ماند دخان

از دخان زورق برفتار آمده
باد و موج ، این هر دو بیکار آمده

نغمه‌ها بی زخمه از ساز آورند
حرف چون طائر بپرواز آورند

هین ، نمی بینی که این دانا گروه
در دو دم آرند حرف از صد گروه

میزنند آتش بباد اندر همی
میدرخشد باد چون اخگر همی

رو بلندن کاندران رخشنده باغ
شهر روشن گشته در شب بیچراغ

کاروبار مردم هشیار بین
در هر آیین صد نو آیین‌کار بین

پیش این آیین که دارد روزگار
گشته آیین دگر تقویم پار

هست ، ای فرزانهٔ بیدار مغز؟
در کتاب اینگونه آیینهای نغز

چون چنین گنج گهر بیند کسی
خوشه زان خرمن چرا چیند کسی

طرز تحریرش اگر گوئی خوشست
نی فزون از هر چه میجوئی خوشست

هر خوشی را خوشتری هم بوده‌است
گر سری هست ، افسری هم بوده‌است

مبدأ فیاض را مشمر بخیل
نور میریزد رطب‌ها زان نخیل

مرده پروردن ، مبارک کار نیست
خود بگو ، کان نیز جز گفتار نیست

غالب آیین خموشی دل‌کشست
گرچه خوش گفتی ، نگفتن هم خوشست

در جهان سیدپرستی دین تست
از ثنا بگزر ، دعا آیین تست

این سراپا فرهٔ و فرهنگ را
سید احمد خان عارف جنگ را

هرچه خواهد از خدا موجود باد !
پیش کارش طالع مسعود باد !

مثنوی ناتمام موسوم به ''ابر گہر بار''

یا اسداللہ الغالب[۱]

مثنوی یازدهمین

سپاسی کزو نامه نامی شود
سخن در گزارش گرامی شود

سپاسی که آغاز گفتار زوست
سخن چون خط از رخ نمودار زوست

سپاسی که تا لب ازو کام یافت
روانها بدان رامش آرام یافت

سپاسی که فرزانهٔ دم‌شناس
بدان خویش را دارد از دیو پاس

سپاسی که فرخ سروشان راز
بر آن زمزم‌آباد گویند باز

سپاسی که شوریدگان الست
دهندش ببانگ قلم دل ز دست

سپاسی بپوزش در آمیخته
ز دل جسته و با دل آویخته

سپاسی ز بسیاری جوش دل
ز اندیشه پیوند غفلت گسل

سپاسی دوئی‌سوز[۲] کثرت‌ربای
سپاس دل‌افروز بینش‌فزای

۱- یہ مثنوی اکمل المطابع دہلی سے ۱۸۶۳ء میں علیحدہ بھی چھپی ہے - ہم نے اس کے حواشی نقل کیے ہیں۔
۲- سپاس دوئی سوز - (مثنوی ابر گہر بار)۔

خدا را سزد کز درون پروری
بدین شیوه بخشد شناساوری

خدائی که زانگونه روزی دهد
که هم روزی و هم دو روزی[۱] دهد

بنامی که گم گشته بردن درو
ز پرّی نه گنجد شمردن درو

کسی را که باشد بر انگشتری
زند گرد او حلقه دیو و پری

متاع اثر بسکه ارزان دهد
مسیحا بدان مرده را جان دهد

رضا داد ، کاید به بردن همی
دهد تن ببند شمردن همی

نباشد اگر بخشش عام او
کرا زهرهٔ بردن نام او

بفرخندگی ، هر که نامش گرفت
هما ، از هوا راه دامش گرفت

بود نام پاکش ز بس دلنشین
تراشند پاکانش از دل نگین

بدل هر که سوزنده داغش نهاد
پری رخ بپیش چراغش نهاد

بود سوز داغش زبس دلپسند
سویدا سزد بر جمالش سپند

۱- دوروزی بمعنی تندرستی ۱۲ - مثنوی ابرگہر بار، طبع دهلی ۱۸۶۳ء

رضا جوی هر دل که درویش هست
هوا خواه هر رخ که گردیش هست

نرنجد ز انبوه خواهندگان
نیاید ستوه از پناهندگان

خرد جنس هستی فروشندگان
دهد مزد بیهوده کوشندگان

رباید دل ، اما ز دلدادگان
کشد ناز ، لیکن ز افتادگان

ز بادی که بر دل وزد در نهفت
زبان را بپیدا در آرد بگفت

نگه را که بیرون نباشد ز چشم
دهد بال پیدائی مهر و خشم

دل دوست باهم دگر دوخته
درین کیسه کردار اندوخته

روان و خرد باهم آمیخته
ازین پرده گفتار انگیخته

نه زین سو گهرها شمردن توان
نه راه اندرین پرده بردن توان

نگاهی بگردنده کاخ بلند
کش اندازه چونست و آثار چند

ز رخشانیء گونهٔ لاژورد
دمد گونه گون رنگش از هر نورد

بهریک نمودش دو صد رنگ در
بهر یک نوردش صد آهنگ در

اگر جلوه روشن ور آواز خوش
خم رنگ خوش پردهٔ ساز خوش
بیندیش کاین چرخ و پروین کراست؟
چنین پردهٔ ساز رنگین کراست؟

نگاهی ببازی گه روزگار
ز بازی گرانش یکی نوبهار
که چون سیمیا در نمود آورد
اثرها ز بالا فرود آورد

کشاید هوا پرنیان بنفش
شود شاخ گل ، کاویانی درفش
شود باغ صحرای محشر ز سرو
پرد نامه هر سو ز بال تدرو

بحالیکه عریان بود پیکرش
دمد چشم نرگس ز فرق سرش
چمن ، خلد و کوثر شود آبگیر
خیابان ، ز جوش سمن جوی شیر

بیندیش کاین روزگار از کجاست
نمود طلسم بهار از کجاست
بنیروی نهُ چرخ برهمزدن
نشاید ز دانست او دم زدن

گروهی ببند گهر یافتن
فروبسته دل در زمین کافتن
یکی را دم تیشه بر کان نخورد
یکی ره بنایاب گوهر نبرد

بدانش ترا دیده‌ور کرده‌اند!
چراغی درین بزم بر کرده‌اند!

خرد کز جهانیست پیشش خبر
نباشد ز عنوان خویشش خبر

نه بیند جز این هیچ بیننده‌ای
که مارا بود آفریننده‌ای

که اندازهٔ آفرینش بدوست
دم دانش و داد بینش بدوست

جهان داور دانش آموزگار
بخور روشنائی‌ده روزگار

کشایندهٔ گوهرآگین پرند
ز پروین بپهنای آن نقشبند

نگارندهٔ پیکر آب و گل
شمارندهٔ گوهر جان و دل

گردش در آرندهٔ نُه سپهر
بگردون بر آرندهٔ ماه و مهر

روان را بدانست سرمایه‌ساز
زبان را بگفتار پیرایه‌ساز

بشاهی نشانندهٔ خسروان
ز رهزن رهانندهٔ رهروان

بدانش به‌اندیش فرزانگان
به مستی نگهدار دیوانگان

شناساگر راز دانان براست
توانا کن ناتوانان بخواست

جگر را ز خونابه آشام ده
نفس را ببیتابی آرام ده

بهر دم ز آواز پیوندبخش
بهر پیکر از دل جگربندبخش

هم از سرخوشی شور در می فگن
هم از ناله جان در تن نی فگن

روان را بدانش گهرزای دار
جهان را بدستور بر پای دار!

شناسندگان را بخود رهنمای
هراسندگان را غم از دل ربای

نفسها بسودای او ناله‌خیز
جگرها بصحرای او ریز ریز

رگ ابر را اشکباری ازوست
دم برق را بیقراری ازوست

زبانهای خاموش گویای او
نهانهای اندیشه پیدای او

بگویائی از وی زبان فصیح
خورد زلهٔ زاچ سور[1] مسیح

بجنبش ازو نال کلک دبیر
نماید بمردم رگ جان تیر[2]

خرد را که جوید شناسائیش
نگه خیره در برق پیدائیش

۱- زاچ سور: چهٹی کی شادی -۲۱ (ابر گهر بار)
۲- تیر: اسم عطارد -۲۱ (ابر گهر بار)

دوئی بی کفن مردهای در رهش
خودی دادگر شحنهٔ درگهش

گر از جان سپاران نازش کسیست
ور از پرده داران رازش کسیست

مرآن را پلارگ[1] رگ گردنی
مراین را روان مجرد تنی

ز گرمی که باشد بهنگامهاش
ز تیزی که دارد قط خامهاش

زبانهای افسردگان ، آتشین
منشهای سنگیندلان ، نازنین

زهی هستی محض و عین وجود
که نازد بیکتائیش هست و بود

ز شاخابه[2] کز قلزمی سر دهد
بهر تشنه آشام دیگر دهد

بیک باده بخشد ز پیمانهای
بهر ذره رقص جداگانهای

جهانی ز طوفان بغرقاب در
هنوزش همان چین بگرداب در

گروهی ز مستی بغوغا درون
هنوزش همان می بمینا درون

۱- پلارگ : بمعنی شمشیر - ۱۲ (ابر گہر بار)
۲- شاخابه : اس نہر کو کہتے ہیں جو کسی دریا میں سے کاٹ کر جاری کریں (ابر گہر ابر)

اسیرش ز بندی که بر پای اوست
سگالد که بر تخت چین جای اوست

شهیدش بخویش از طرب بهره مند
بجز چشم زخمش نباشد گزند

ز بانگی که خیزد ز خون در دلش
بدان تار ماند رگ بسملش

که چون خواهدش رغبت‌انگیز تر
مغنّی کند زخمه را تیزتر

شبستانیانش ز می غازه‌جوی
بیابانیانش ز خور تازه‌روی

گرانمایگان غرق کوثر ازو
خسان خستهٔ موج ساغر ازو

مناجاتیان پیش وی در نماز
خراباتیان را بدو چشم باز

اگر کافرانند زنهاریش[1]
وگر مومنان در پرستاریش

"هوالحق" سرایان او، غیب‌جوی
"اناالحق" نوایان او، تلخ گوی

رهش را ز جانها غباری بلند
غمش را ز خال عروسان سپند

نه تنها خوشی ناز پرورد اوست
که غم نیز دل را ره‌آورد[2] اوست

۱- زنهاری : بمعنی مستامن - ۱۲ (غالب)
۲- ره‌آورد : بمعنی سوغات - ۱۲ - (ابر گهر بار)

اگر شادکامی شکر میخورد
وگر نامرادی جگر میخورد
نه آنرا نشاطی بپیوند اوست
که اینهم بهستی نشان‌مند اوست

ز آیین‌نگاران ، بهنگامه در
رقم گشته نامش بهر نامه در
لغت ، زان شود تازی و پهلوی
که بالد سخن ، چون پزیرد نوی

سخن ، گر بصد پرده دمساز گشت
چنان کامد ازوی بوی باز گشت
بهر لب که جوئی ، نوائی ازوست
بهر سر که بینی ، هوائی ازوست
اگر دیوساریست ، بیهوش و هنگ[1]
که همواره پیکر تراشد ز سنگ
ببت سجده زان رو روا داشته
که بت را خداوند پنداشته

وگر خیره چشمیست نیّر پرست
بدرد می از جام اندیشه مست
بمهرش ازان راه جنبیده مهر
کزین روزنش ، دوست بنموده چهر
ز تاری[2] درونان اهریمنی
گروهی بود کز خرددشمنی

۱- هنگ : مخفف فرهنگ ـ (غالب)
۲- تاری : مخفف تاریک : (ابر گهر بار)

ز بس داد ناآشنائی دهند
به آتش نشان خدائی دهند

به تن ها بآدر گرایش کنان
به‌دل‌ها خدارا نیایش کنان

گروهی سراسیمه در دشت و کوی
خداوند جوی و خداوند گوی

ز رسمی که خود را بران بسته‌اند
بیزدان پرستی میان بسته‌اند

ز مهری که بیخواست در دل بود
پرستند حق ، گر بباطل بود

نظرگاه جمع پریشان ، یکیست
پرستنده انبوه و یزدان یکیست

کدامی کشش کاں ازان سوی نیست
بد و نیک را جز بوی روی نیست

جهان چیست ؟ آیینهٔ آگهی
فضای نظرگاه وجه‌اللّهی

نه هر سو که رو آوری سوی اوست
خود آن رو که آورده‌ای روی اوست

ز هر ذره کاری به تنهائیش
نشان باز یابی ز یکتائیش

چو این جمله را گفته‌ای عالم اوست
بگفت آنچه هرگز نیاید هم اوست

چو اینجا رسیدم همایون سروش
بمن بانگ برزد که "غالب خموش"!

بپاشید در لرزه بندم ز بند
تپان همچو بر روی آتش سپند

چو از وی پزیرای راز آمدم
مناجات را پرده ساز آمدم

بساز نیایش شدم زخمه‌ریز
بدان تا بدینسان کنم زخمه[1] تیز

مناجات[2]

خدایا! زبانی که بخشیده‌ای
بنیروی جانی که بخشیده‌ای

دمادم بجنبش گراید همی
ز راز تو حرفی سراید همی

ندانم که پیوند حرف از کجاست
درین پرده لحنی شگرف از کجاست

گر از دل شناسم جنون بیش نیست
که آن نیز یک قطره خون بیش نیست

خرد را سگالم که نیرو دهد
خود او را زمن حیرتی رو دهد

نه آخر سخن را کشایش ز تست
بنابود چندین نمایش ز تست

چو پیدا تو باشی ، نهان هم توئی
اگر پرده‌ای باشد آنهم توئی

۱- زخمه : بمعنی مضراب - ۱۲ (غالب)
۲- ابر گہر بار میں "آغاز مناجات" ہے -

بهر پرده دمساز کس جز تو نیست
شناسندهٔ راز کس جز تو نیست

چه باشد چنین پرده‌ها ساختن
شگافی بهر پرده انداختن

بدین روی روشن نقاب از چه رو؟
چو کس جز تو نبود حجاب از چه رو؟

همانا ازانجا که توقیع ذات
بود فرد فهرست حسن صفات

تقاضای فرمانروائی دروست
ظهور شیون خدائی دروست

ز فرمان‌دهی خاست فرمانبری
شناساوری شد شناساگری

ترا با خود اندر پرند خیال
بود نقطه‌ای از صفات کمال

کزان نقطه خیزد سیاه و سپید
و زان پرده بالد هراس و امید

بدان تازه گردد مشام از شمیم
بدان بشگفد گل بباغ از نسیم

ازانجا نگه روشنائی برد
وزانجا نفس نغمه‌زائی برد

ازان جنبش آید بشوخی برون
اگر موج رنگست، ور موج خون

اگر سود گوهر بدامن برد
زیان گر خود اخگر بخرمن برد

ز آلائش کفر و پرداز دین
ز داغ گمان و فروغ یقین

بهر گونه پردازش هست و بود
جمال و جلال تو گیرد نمود

بگردون ز مهر و باختر ز تاب
بدریا ز موج و بگوهر ز آب

بانسان ز نطق و بمرغ از خروش
بنادان ز وهم و بدانا ز هوش

بچشم از نگاه و به آهو ز رم
بچنگ از نوای و بمطرب ز دم

بباغ از بهار و بشاه از نگین
بگیسو ز پیچ و بابرو ز چین

عیار وجود آشکارا کنی
نشانهای جود آشکارا کنی

جمال تو ذوق تو از روی تو
جلال تو تاب تو از خوی تو

جمال ترا ، ذره از آفتاب
جلال ترا ، یوسف اندر نقاب

چه باشد چنین عالم‌آرائیی
همانا خیالی و تنهائیی

توئی آنکه چون پا گزاری براه
نیابی بجز خویشتن جلوه‌گاه

چو رو در تماشای خویش آوری
هم از خویش آیینه پیش آوری

نه چندان کنی جلوه بر خویشتن
که کس جز تو گنجد درین انجمن
بفرمان خواهش که آن شان تست
هم از خویش برخویش فرمان تست

کنی ساز هنگامه اندر ضمیر
چو نم در یم و رشته اندر حریر
ظهور صفات تو جز در تو نیست
نشانهای ذات تو جز در تو نیست

ز خواهش بکوریٔ چشم دوئی
بآرایش دهر کانهم توئی
کشائی نورد[۱] هنر رنگ رنگ
کشی پرده بر روی هم تنگ تنگ

ز هر پرده پیدا نواسازیی
بهر جلوه پنهان نظربازیی
پدید آوری برگ و سازی فراخ
چو نخلی بانبوهی برگ و شاخ

درین گونه گون آرزو خواستن
بود چون ببائست آراستن
زهر پرده رنگی که گیرد کشاد
چنان دل کش افتد که بی آن مباد

قلم در کف و تاج بر سر رسد
بهر جا رسد هر چه ازدر[۲] رسد

۱- نورد: ملفوف و پیچ و تاب -
۲- ازدر: بمعنی لائق - (غالب)

بنه چرخ والائی و برتری
بچار آخشیج[۱] آدمی پیکری

بیزدانیان ، فرّهٔ ایزدی
بیونانیان ، بهرهٔ بخردی

بکشورکشایان ، دم گیرودار
بمسکین گدایان غم پود و تار

بناهیدیان ، بادهٔ بیغمی
بکیوانیان ، گونهٔ ماتمی

بمستان نشید و بعشاق آه
بآهن کلید و بزر نام شاه

ببیرنگ[۲] نقش و بپرکار سیر
بطامات لعن و بطاعات خیر

بابر از پی خاک آب حیات
بخاک ، از نم ابر جوش نبات

بمی در فروغی که چون بردمد
ز سیمای میخواره نیرّ دمد

بنی در نوائی که چون برکشند
بآواز آن ناله ساغر کشند

بساقی خرامی که از دلبری
ز شاهد برد دل بساقی گری

بشاهد ادائی که از سرخوشی
بساقی دهد داروی بیهشی

۱- چار آخشیج : چار عنصر - (فاضل)
۲- بیرنگ : خاکا - (فاضل)

بآزاده دستی که ساغر زند
بافتاده سنگی که بر سر زند
هر آینه مارا که تر دامنیم
ز دیوانگی با خرد دشمنیم

ز آلودگیها گرانی بود
همه سختی و سخت‌جانی بود
ز هر شیوه ناسازگاری رسد
ز هر گوشه صد گونه خواری رسد

ببزم ارچه در خوردن باده‌ایم
ولیکن بدان گوشه افتاده‌ایم
که چون سوی ما ساق آرد پسیچ
نیابیم جز گردش از جام هیچ

بکفر آنچنان کرده کوشش که خویش
نباشیم تاری ز زنّار بیش
ز لب جز بناگفتنی کار نه
ز خود جز بنفرین سزاوار نه

نه سودای عشق و نه راه صواب
نه در سینه آتش، نه در دیده آب
نه دستور دان و نه خسرو شناس
نه از شحنهٔ شرع در دل هراس

نیاسوده از ما بکنج و کمین
کسی جز وقائع‌نگار یمین
گناه آن قدرها برون از شمار
که رنجد یسار سروش یسار

چو از پردهٔ پرس و جو بگزرند
روانهای مارا بدوزخ برند
هر آیینه از ما بتردامنی
فرو میرد[1] آتش بدان روشنی

بدان تا چو این گرد خیزد ز راه
بسوزند مارا بشرم گناه
ولی با چنین آتشی خانه‌سوز
تر و خشک و آباد و ویرانه سوز

نه این بسکه سوزان بداغ تو ایم
ز پروانگان چراغ تو ایم
بهر گونه کالا روائی ز تست
بما بهرهٔ ناروائی ز تست

ز ابری که بارد بگلزار بر
بروید گیاهی بدیوار بر
بدان نابرومندی آن ناتوان
ز سرسبزی باغ بخشد نشان

اگر خوار ور ناروائیم ما
بباغ تو برگ گیائیم ما
بخویش از ظهور جلالت خوشیم
فروزینهٔ ایزدی آتشیم
تراب جگر خستگی را نمیست
که گلهای باغ ترا شبنمیست

۱- طبع دوم نول کشور ''فرو میزد'' ۔ صحیح ''فرومیرد'' ہے جیسا کہ ابر گھر بار اور کلیات طبع اول میں ہے ۔

ز رہ ناشناسان کژرو بگشت
دمد جادهٔ دیگر از روی دشت

فزاید بغوغای یوسف دو بہر
ترنج و کف خُردہ گیران شہر

اگر[۱] کاسهٔ قیس مسکین شکست
صدائی ز لیلی دران کاسه هست

حکایت

شنیدم که شاهی درین دیر تنگ
ز پهلو[۲] برون راند لشکر بجنگ

گزین شہسواران ، عنان بر عنان
مہین نیزه‌داران ، سنان بر سنان

بپیچش، ز چرمین عنانهای سخت
زحل را بدلو اندرون پاره رخت

بجنبش ز رخشان سنانهای تیز
بروی هوا ، نور خور ریز ریز

دلیرانه با لشکر نامجوی
باقلیم بیگانه آورد روی

ز بس چست خود را بپیکار برد
بدشمن شبیخون بایوار[۳] برد

بدان دم که در رهروی بر گرفت
ز بدخواه اورنگ و افسر گرفت

۱- غالب کا ایک اردو شعر ہے :
من اے غارت گر جنس وفا ، سن شکست شیشهٔ دل کی صدا کیا
۲- پہلو: خراسان قدیم ، شہر (برہان قاطع)
۳- ایوار: بمعنی سفر روز - (غالب ، ابر گہر بار)

ز کالای تاراج دامن فشاند
بلشکر زر و مال دشمن فشاند
ازان گنج کز لعل و گوهر شمرد
سر خصم پامزد خود بر شمرد

هنوز از غباری که برجسته بود
بسا ذره بر خاک ننشسته بود
که در جنبش از چرخ آرام یافت
ز دادار پیروزگر کام یافت

نیازش ز فرخندگی ناز گشت
سوی[1] کشور خویشتن بازگشت
خود آهسته‌رو بود در ره زپیش
فرستاد فرمان بدستور خویش

که فرمان دهد تا بهر گونه بهر
ببندند آئین شادی بشهر
نمطها بآراستن نو کنند
پرستاری بخت خسرو کنند

بدین دل‌کشا مژده کز شه رسید
بهار طرب را سحرگه رسید
بروزی که بایستی از شاهراه
بایوان خرامد خداوند گاه

هم از شام مشعل بر افروختند
امینان بکوشش نفس سوختند

۱- کلیات طبع اول و دوم نول کشور "سو کشور" بغیر "ی" ابرگهربار با "ی" - (فاضل)

بمهتاب شستند سیمای خاک
فشاندند پروین بدیبای خاک

ببازارها ، سو بسو صف بصف
بپیرایه‌بندی کشودند کف

ز هر پرده نقشی بر انگیختند
بهر گوشه چینی در آویختند

بدان گونه آیینه‌ها ساختند
که بینندگان چشم و دل باختند

سحرگاه چون داد بار آفتاب
ز هر گوشه سر زد هزار آفتاب

زمین را ز گرمی بجوشید مغز
برون داد از کان گهرهای نغز

بآرایش جادهٔ رهگزار
صدف ریخت از بحر در بر کنار
تو گوئی ز تاب گهرها بروز
که نگسسته پیرایهٔ شب هنوز

چو هرکس به اندازهٔ دسترس
بشادی زد از خودنمائی نفس
گروهی ز بیمایه زندانیان
علی‌الرغم نوکیسه سامانیان

بآئین ببستند از خویشتن
سیه پرده‌ای بر رخ انجمن
که هر تار زان پرده زنجیر بود
نوا ناله ، گر بم وگر زیر بود

بمرغوله[1] کاندر نوا داشتند
همان دود دل بر هوا داشتند
بر اجزای تن جا بجا بند سخت
بهر بند لختی ز تن لخت لخت
نفس گرم شغل چراغان ز آه
ز گرمی خس و خار سوزان براه
چو گیتی کشا موکب خسروی
قدم سنج اندازهٔ رهروی
بشهر اندر آورد از راه روی
رسیدند گوهر کشان پوی پوی
بدان جاده گوهر فرو ریختند
بمغز زمین رنگ و بو ریختند
ز آیین که در شهر بربسته بود
دو صد نقش بر یکدگر بسته بود
بدان تا رود خطوهٔ چند پیش
بجنبید هر نقش بر جائی خویش
جگرگون نگاهان خونین‌نوا
گرفتند چون داغ بر سینه جا
ز اشک فروخورده مشتی گهر
ملک را فشاندند بر رهگزر
ز خون گشته پنهان هوسهای خویش
کشیدند خوانهای یاقوت پیش
شه دیده‌ور را دل از جای رفت
بخاموشیش بر زبان ''های'' رفت

۱- مرغوله: گٹکری:

خموشی بدلجوئی آواز شد
ترحم بگفتار دمساز شد

لب از جوش دل چشمهٔ نوش ریخت
نوید رهائی بسرجوش ریخت

ده و دوده و گنجدانها ز پی
گدایان روان ، کاروانها ز پی

عزیزی که یارای گفتار داشت
بهر پرده اندازهٔ بار داشت

ز بیداد ذوق شناساوری
فغان بر کشید اندران داوری

که الماس در زر نشانندگان
نسنجیده گوهر فشانندگان

بیایند و داغ بیائی روند
جگر تشنهٔ مرحبائی روند

تهی کیسگان تا دمی بر کشند
بگردون زر و لعل و گوهر کشند

بحرفی کزو لب گهرخیز شد
جهانبان چنین پاسخ انگیز شد

که اینان جگرخستگان منند
بآهن فروبستگان منند

بجز موی و ناخن که بینی دراز
زبان کوته از دعوئی برگ و ساز

لباس از گلیم و زر از آهنست
گر آهن زمن ور گلیم از منست

نیاورده‌اند آنچه آورده‌اند
ز من برده‌اند آنچه آورده‌اند

بآیین ، در آیینهٔ انجمن
مرا کرده‌اند آشکارا بمن

ازان رو که در تب ز تاب منند
همان ذرهٔ آفتاب منند

تو نیز ایکه هر چیز و هر کس ز تست
بهار و خزان و گل و خس ز تست

بروزی که مردم شوند انجمن
شود تازه پیوند جانها بتن

روان را بنیکی نوازندگان
بسرمایهٔ خویش نازندگان

گهرهای شهوار پیش آورند
فروهیده[1] کردار پیش آورند

ز نوری که ریزند و خرمن کنند
جهان را بخود چشم روشن کنند

بهنگامه با این جگر گوشگان
در آیند مشتی جگر توشگان

ز حسرت بدل برده دندان فرو
ز خجلت سر اندر گریبان فرو

دران حلقه من باشم و سینه‌ای
ز غمهای ایام گنجینه ای

۱- فروهیده : بمعنی خوب ، نیک - ۱۲

در آب و در آتش بسر برده‌ای
ز دشواری زیستن مرده‌ای

تن از سایهٔ خود ببیم اندرون
دل از غم بپهلو دونیم اندرون

ز ناسازی و ناتوانی بهم
دم اندر کشاکش ز پیوند دم
ز بس تیرگیهای روز سیاه
نگه خورده آسیب دوش از نگاه

ببخشای ، بر ناکسیهای من
تهیدست و درمانده‌ام وای من
بدوش ترازو منه بار من
نسنجیده بگزار کردار من

بکردار سنجی میفزای رنج
گرانباری درد عمرم بسنج
که من با خود از هرچه سنجد خیال
ندارم بغیر از نشان جلال

اگر دیگران را بود گفت و کرد
مرا مایهٔ عمر رنجست و درد
چه پرسی چو آن رنج و درد از تو بود
غمی تازه در هر نورد از تو بود

فرو هل که حسرت خمیر منست
دم سرد من زمهریر منست
مبادا بگیتی چو من هیچکس
جحیمی دل زمهریری نفس

بپرسش مرا درهم افشرده گیر
پر کاه را صرصری برده گیر

پس آنگه بدوزخ فرستاده دان
در آتش خس از باد افتاده دان

ز دودی که بر خیزد از سوز من
شود بیش تاریکی روز من

دران تیرگی نبود آب حیات
که بر وی خضر را نویسی برات

ز دود و شراری که من در دهم
نه گردون فرازم ، نه اختر دهم

فتد برتنم چون ازان شعله داغ
نسوزد بخاک شهیدان چراغ

اگر نالم از غم ، ز غوغای من
نپیچد بفردوس آوای من

که زهاد مینونشین زان صدا
بافشاندن دست ، کوبند پا

وگر همچنین است فرجام کار
که میباید از کرده راندن شمار

مرا نیز یارای گفتار ده
چو گویم برآن گفته زنهار ده

درین خستگی پوزش از من مجوی
بود بندهٔ خسته گستاخ گوی

دل از غصه خون شد نهفتن چه سود
چو ناگفته دانی بگفتن[1] چه سود

زبان گرچه من دارم ، اما ز تست
بتست ارچه گفتارم ، اما ز تست

همانا تو دانی که کافر نیم
پرستار خرشید و آدر نیم

نکشتم کسے را باهریمنی
نبردم ز کس مایه در رهزنی

مگر می که آتش بگورم ازوست
بهنگامه پرواز مورم ازوست

من اندوه گین و می اندهربای
چه میکردم[2] ای بندهپرور خدای

حساب می و رامش و رنگ و بوی
ز جمشید و بهرام و پرویز جوی

که از باده تا چهره افروختند
دل دشمن و چشم بد سوختند

نه از من که از تاب می گاه گاه
بدریوزه رخ کرده باشم سیاه

۱- ابر گہر بار طبع دهلی ، کلیات طبع اول لکھنؤ وغیرہ میں ''نه گفتن چه سود'' ہے مگر غلط نامۂ ابر گہر بار میں اسے ''به گفتن چه سود'' کیا ہے اور یہی صحیح ہے -

۲- غلط نامۂ ابر گہر بار میں ''می گردم'' کو ''می کردم'' بتایا ہے ' نول کشوری نسخوں میں ''می گردم'' ہی ہے -

نه بستانسرائی ، نه میخانه‌ای
نه دستانسرائی ، نه جانانه‌ای

نه رقص پری‌پیکران بر بساط
نه غوغای رامشگران در رباط

شبانگه ، بمی رهنمونم شدی
سحرگه ، طلب‌گار خونم شدی

تمنای معشوقهٔ باده‌نوش
تقاضای بیهودهٔ میفروش

چه گویم ، چه هنگام گفتن گزشت
ز عمر گرانمایه بر من گزشت

بسا روزگاران ، بدل‌دادگی
بسا نوبهاران ، ببی‌بادگی

بسا روز باران و شبهای ماه
که بودست بی می بچشمم سیاه

افقها پر از ابر بهمن مهی
سفالینه جام من از می تهی

بهاران و من درغم برگ و ساز
در خانه از بینوائی فراز

جهان از گل و لاله پربوی و رنگ
من و حجره و دامنی زیر سنگ

دم عیش جز رقص بسمل نبود
باندازهٔ خواهش دل نبود

اگر تافتم رشته گوهر شکست
وگر یافتم باده ساغر شکست

چه خواهی ز دلق می‌آلود من
ببین جسم خمیازه فرسود من
ز پائیز گویم ، بہارم گزشت
ز می بگزرم ، روزگارم گزشت
بناسازگاری ز همسائگان
بسرمایه جوئی ز بیہائگان
سر از منت ناکسان ، زیر خاک
لب از خاک‌بوس خسان، چاک‌چاک
بگیتی درم بینوا داشتی
دلم را اسیر هوا داشتی
نه بخشنده شاهی که بارم دهد
بہر بار زر پیل‌بارم دهد
که چون پیل زانجا بر انگیزمی
زرش بر گدایان فرو ریزمی
نه نازک نگاری که نازش کشم
بہر بوسه زلف درازش کشم
چو زان غمزه ، نیشی بدل بر خورد
رگ جان ، غم نوک نشتر خورد
بدان عمر ناخوش که من داشتم
ز جان خار در پیرهن داشتم
چو دل زین هوسها بجوش آمدی[1]
ز دل بانگ خونم بگوش آمدی[1]

۱- کلیات طبع نول کشور اور 'ابر گہر بار' طبع دھلی "بجوش آیدی"— "بگوش آیدی" لیکن غلط نامہ ابر گہر بار "آمدی"- ہم نے اس کے مطابق متن کی تصحیح کی ہے -

هنوزم ، همان دل بجوش اندرست
ز دل، بانگ خونم بگوش اندرست
چو آن نامرادی بیاد آیدم
بفردوس هم دل نیاسایدم

دلی را که کمتر شکیبد بباغ
درآتش چه سوزی بسوزنده داغ
صبوحی خورم ، گر شراب طهور
کجا زهرهٔ صبح و جام بلور

دم شبرویهای مستانه کو
بهنگامه غوغای مستانه کو
دران پاک میخانهٔ بیخروش
چه گنجایی شورش نای و نوش

سیه‌مستی ابر و باران کجا
خزان چون نباشد ، بهاران کجا
اگر حور در دل خیالش که چه
غم هجر و ذوق وصالش که چه

چه منت نهد ناشناسا نگار
چه لذت دهد وصل بی انتظار
گریزد دم بوسه اینش کجا
فریبد بسوگند دینش کجا

برد حکم و نبود لبش تلخ گوی
دهد کام و نبود دلش کامجوی
نظربازی و ذوق دیدار کو
بفردوس ، روزن بدیوار کو

نه چشم آرزومند دلاله‌ای
نه دل تشنهٔ ماه‌پرکالهٔ

ازینها که پیوسته میخواست دل
هنوزم همان حسرت آلاست دل

چو پرسش رگی را بکاود ز دل
دو صد دجله خونم تراود ز دل

بهر جرم کز روی دفتر رسد
ز من حسرتی در برابر رسد

بفرمای کاین داوری چون بود
که از جرم من حسرت افزون بود

هر آیینه، همچون منی را ببند
تلافی فراخور بود، نی گزند

بدین مویه در روز امید و بیم
بگریم بدانسان که عرش عظیم

شود از تو سیلاب را چاره جوی
تو بخشی بدان گریه‌ام آبروی

وگر خون حسرت هدر کرده‌ای
ز پاداش قطع نظر کرده‌ای

گزشتم ز حسرت، امیدیم هست
سپید آب روی سپیدیم هست

که البته این رند ناپارسا
کج اندیشه گبر مسلمان نما

پرستار فرخنده منشور تست
هوادار فرزانه وخشور تست

ببند امید استواری فرست
بغالب خط رستگاری فرست

نعت

بنا میزد ، ای کلک قدسی صریر
به هر جنبش از غیب نیرو پذیر
ز مهرم بدل همچو آه اندر آی
ز دل تا بر آرم بگردون بر آی
چو بر سلسبیلت ره افتد بخم
خیابان خیابان بمینو بچم
بدم در کش آب گهرسای را
نمودار کن گوهر لای را
فرورو بدان لای و دیگر بروی
ز سر سبز گرد و فروسو بپوی
شگافی ازان در بخویش اندر آر
بهشتی نسیمی بپیش اندر آر
بدان نم که اندر سرشت آوری
بدان باد خوش کز بهشت آوری
دلاویزتر جنبشی ساز کن
بجنبش رقم‌سنجی آغاز کن
درودی بعنوان دفتر نویس
بدیباجه نعت پیمبر نویس
محمد کز آئینهٔ روی دوست
جزینش ندانست دانا که اوست
زهی ، روشن آیینهٔ ایزدی
که در وی نگنجیده زنگ خودی

ز راز نہان پردہ‌ای بر زده
ز ذات خدا معجزی سر زده

تمنای دیرینهٔ کردگار
بوی ایزد از خویش امیدوار

تن از نور پالوده سرچشمه‌ای
ولی همچو مهتاب در چشمه‌ای

بہر جام ازو تشنه‌ای جرعه‌خواه
بہر گام ازو معجزی سر براه

کلامش ، بدل در فرود آمدن
ز دم جسته پیشی ، بزود آمدن

خراشش بسنگ از قدم نقش بند
برنگی که نادیده پایش گزند

بدستش کشاد قلم نارسا
بکلکش سواد رقم نارسا

دل امیدجای زیان دیدگان
نظر قبله‌گاه جہان دیدگان

برفتار صحرا گلستان کنی
بگفتار کافر مسلمان کنی

بدنیا ، ز دین روشنائی دهی
بعقبیٰ ، ز آتش رہائی دهی

بخوی خوش ، اندوه‌گاه[1] همه
بآمرزش ، امیدگاه همه

۱- کلیات طبع نول کشور ۱۹۲۵ء ''اندوه گه همه'' غلط ہے -

لب نازنینش ، گزارش پزیر
جہان آفرینش ، سپارش پزیر

زمین ، دل ز کف‌دادۂ پای او
خود از نقش پایش سویدای او

پی آنکه او را ببوسد قدم
لب آورده یثرب ز زمزم بہم

ز بس محرم پردۂ راز بود
بنزدیکی حق سرافراز بود

ز رازی که باوی سرودی سروش
صدائیش بودی ز اول بگوش

خہی قبلۂ آدمی زادگان
نظرگاہ پیشین فرستادگان

کسائی[1] دہ نسل آدم بخویش
روائی دہ نقد عالم بخویش

بلندی دہ کعبہ ، بالای او
گرامی کن سجدہ ، سیہای او

یمن روشن از پرتو روی او
ختن بستۂ چین گیسوی او

بکیش فریور[2] ، جہان رہنمای
ز بیراہہ پویان خراشش ربای

ز بت‌بندگی ، مردم آزادکن
جہانی ، بیک خانہ آبادکن

۱- کسائی: بمعنی شخصیت - ۱۲ (ابر گہر بار)
۲- فریور: صاحب دبدبہ - ۱۲ (ابر گہر بار)

بمحراب مسجد رخ‌آرای دیر
به‌اندیش خویش و دعاگوی غیر

تو گوئی ز بس دل ز دشمن رباست
که سنگ درش سنگ آهن رباست

ز خونیکه در کربلا شد سبیل
ادا کرد وام زمان خلیل

گزین بنده کز بندگی سر نتافت
ز والا بسیجی عوض برنتافت

کنش را بدان گونه شیرازه بست
بدین صفحه نقشی چنان تازه بست

که تا گردش چرخ نیلوفری
بود سبز[1] جایش بپیغمبری

دل‌افسرده مالک ز خوش‌خوئیش
کمربسته رضوان بدل جوئیش

ز کوثر ببینند تا درگهش
ز طوبیٰ همان تا بلشکرگهش

کدوی گدا و شراب طهور
کف پای درویش و رخسار حور

ز بادی که از دم بر افلاک زد
ز نقشی که از مهر بر خاک زد

فرا زین جهانش ز خود بیش دید
فرودین گروهش هم از خویش دید

۱- سبز بودن جای: بمعنی خالی بودن جای - ۱۲ (غالب ، ابر گهر بار)

مگس‌ران خوانش ، پر جبرئیل
بخوان گستری ، پیشکارش خلیل

جمالش ، دل‌افروز روحانیان
خیالش ، نظرسوز یونانیان

بدم ، حرز بازوی افلاکیان
بپیوند ، پیرایهٔ خاکیان

بمعراج رایت بگردون بری
بدین شبروان بر شبیخون بری

سخن تا دم از ذکر معراج زد
بمن چشمک خواهش تاج زد

همانا تهیدستم انگاشته
که خواری بمن بر روا داشته

چو نبود مرا زین تمنا گزیر
هر آیینه گردم تمنا پزیر

ز مه پایه تا کابهٔ مشتری
بروبم[1] فلک را بجولانگری

نفس ریزه‌های فروزنده هور
جگر پاره‌های کواکب ز نور

که افتاده بینم بدان ره‌گزار
گدایانه برچینم از ره نثار

نثار شبی کش ستایشگرم
بچیدن ز بالا فرود آورم

کنم تاج طرح از گهر ریزه‌ها
ز گوهر بتاج اندر آویزه‌ها

۱- مثنوی 'ابر گہر بار' طبع جداگانہ دهلی میں "برویم" ہے -

بسائل دهم تا رسانم سرش
بجائی کزانجا رسید افسرش

بیان معراج

همانا در اندیشهٔ روزگار
شبی بود سر جوش لیل و نهار

شبی دیده روشن کن دل‌فروز
ز اجزای خود سرمهٔ چشم روز

شبی فرد فهرست آثار عید
بیاضش ز جوش رقم ناپدید

ز ایام فیض سحر یافته
بشبگیر خرشید در یافته

بروشندلی مایه اندوز بود
چنین شب مگر بهر یک روز بود

دران روز فرخنده آن شب نخست
همه روز خود را بخرشید شست

فرو رفت چون روز لیلای شب
بر آراست محمل برسم عرب

رخی جلوه گر در پرند سیاه[1]
چو از مردمک جوش نور نگاه

براهش ز بس نور می بیختند
بهر ذره خرشید می ریختند

۱- 'ابرگهربار' میں ''در پرند لگاہ'' ہے اور غلط نامے میں اس کی تصحیح موجود نہیں - [illegible]

چه بود از درخشندگی کان نداشت
نیازی بخرشید تابان نداشت
نگویم شبی ماه وش دلبری
خور از زیور پیکرش گوهری
گر از زیوری گوهری کم شود
چه از تابش پیکری کم شود
بزیر زمین کرده خفاش روی
پی امن گردید خرشید جوی
چنان گشته سر تا سر اجزای خاک
فروغانی و روشن و تابناک
که گوئی، مگر مهر زیر زمین
فروزان فوه[۱] بود و پشت نگین
و یا خاک با جوهر آفتاب
بیامیخت چون درد می با شراب
سحر با خود از خود بریده امید
که چون پیش این شب توان شد سپید
بفرض ار دران شب ز بی رهروی
زدی مهر تابان دم از شبروی
بدان گونه بودی بچشم خیال
که شاهد نهد بر رخ از مشک خال
شده چشم اعمی دران جوش نور
تماشا گر حال اهل قبور
دریغا نبودم، اگر بودمی
وزان روشنی بینش افزودمی

۱- فوه: بمعنی ڈاک، جو نگ کے تلے رکھتے ھیں - ۱۲ (ابر گهر بار)

بخندیدمی بر دبیر یسار
چو او را ز خود دیدمی شرمسار

خرد گر بگوششں نفس سوختی
برون زین نمط مایه نندوختی

که بر قیست امشب که رم نیستشں
ز جا جستن دمبدم نیستشں

چگویم چسان گیتی‌افروز بود
شبی بود کز روشنی روز بود

ازان روز تشبیه عارض بشب
اگر رسم گشتی ، نبودی عجب

دران شب زبس بوده رخشان سرشت
فرو خواند مردم خط سرنوشت

نگه را بهنگامه بی سعی و رنج
نمایان ز دل راز و از خاک گنج

زبس ریزشں نور بالای نور
بگیتی روان بود دریای نور

که ناگه ورود سروشان سروش
دران بیکران قلزم افگند جوش

ز بادیکه از بال جبریل خاست
تنومند موجی ازان نیل خاست

صدائی رسید از پر بهمنی
که خود گوش چشمی شد از روشنی

مهین پرده‌دار در کبریا
کشایندهٔ پرده بر انبیا

همایون همای پیام‌آوری
بآوردن نامه نام‌آوری

روان و خرد را روانی بدو
نبی را دم رازدانی بدو

امینی "نخستین خرد" نام او
ز سرجوش نور حق آشام او

فروزان بفرّ فروغ یقین
چنان کز محمد ؐ دل، از وی جبین

سرایندهٔ راز، بعد از درود
بدین پرده راز نهانی سرود

که ای چشم هستی بروی تو باز
نیاز تو هنگامه‌آرای ناز

خداوند گیتی خریدار تست
شبست این ولی روز بازار تست

چنین لنگر ناز سنگین چرا
نه‌ای طور اظهار تمکین چرا

کسان، جلوه بر طور گر دیده‌اند
ز راه تو آن سنگ برچیده‌اند

نه بینی براه اندرون سنگلاخ
کران تا کرانست راهی فراخ

بلی از گدایان دیدار خواه
نبیند کسی جز بره روی شاه

عزیزی که فرمان شاهش بود
گزین پایه دربار گاهش بود

بدور تو شد لن‌ترانی کہن
فصاحت مکرر نسنجد سخن

ترا خواستارست یزدان پاک
هر آیینه از لن‌ترانی چه باک

توئی کانچه موسیٰ باو گفته‌است
خداوند یکتا بتو گفته‌است

توئی آنکه تا مر ترا خوانده‌اند
درین رهگزر گرد بنشانده‌اند

ز ایمن چگوئی که راه ایمنست
بشبگیر بر شو که شب روشنست،

بنه در ره از پرتو روی خویش
چراغی فراطاق ابروی خویش

نگویم که یزدان ترا عاشقست
ولی زان طرف جذبهٔ صادقست

جهان‌آفرین را خور و خواب نیست
تو فارغ ببستر چه خسپی، بایست

بیارای شمشاد بیسایه را
بپیمای اورنگ نه پایه را

چو خاطر بگفتار خویشش کشید
هما سایه رخشی بپیشش کشید

بروحانیان پرورش یافته
ز ریحان مینو خورش یافته

هیونی که تا دم ز مستی زند
ز بالا قدم سوی پستی زند

ز گنبد بغلطانی ار گردگان
نیفتد که آید فرو زاسمان

شتابش برفتار زان حد گزشت
که تا گوی ، آید، ز آمد گزشت

به هم چشمیٔ ''هور'' ساغر سُمی
به هم دوشیٔ ''حور'' گیسو دمی

سبکخیزیش ، خندہ‌زن بر نسیم
که در جنبش انگیزد از گل شمیم

هم از باد صبحی ، سبک خیز تر
هم از نکہت گل ، دل آویز تر

ز ساق و سمش گر ببزم مدام
کنی ساز تشبیه مینا و جام

نباشد شگفت ، ار بدیدن رسد
که آن باده پیش از رسیدن رسد

ز تیزی بگلبرگ گر بگزرد
ز گلبرگ رنگ آنچنان بسترد

که دیگر بدان دیدهٔ راست‌بین
کدیور نداند گل از یاسمین

دو صد ره ز چشم ار بدل در رود
درین ره ، بجستن سراسر رود

نه اجزای بینش ز هم بگسلد
نه پیوند هنجار دم بگسلد

پیمبر بدین مژدهٔ دل نواز
که بودش در اندیشه از دیر باز

ز بس ذوق ناسوده بریال دست
بران باره یکبارگی برنشست

مثل زد برین ماجرا بلبلی
که ''باد آمد و برد بوی گلی"

خرامی ز مقراض ''لا" تیزتر
جمالی ز ''الّا" دل‌آویز تر

چو بود آتش آن پویهٔ آتشین
برافروختش باد دامان زین

براق از قدم خار در راه سوخت
پیمبر بدم ''ماسوی الله" سوخت

فرس چون سواری سرافراز یافت
دمی تازه در خویشتن باز یافت

بجنبش درآمد عنان ناگهش
فضای زمین گشت جولانگهش

به سم گنج قارون نمایان کنان
به دم عقد پروین پریشان کنان

چنین تا ز بیت المقدس گزشت
ازین کهنه کاخ مقرنس گزشت

هوا تا زند بوسه بر پای او
براه اندر آویخت درپای او

ولی توسن از بسکه سرکش گزشت
هوا تا دهد بوسه زاتش گزشت

قدم تا بر اورنگ ماهش رسید
باکایل کیوان کلاهش رسید

ببالید چندان ز بیشی قدر
که بی منت مهر گردید بدر
شد از پر دلی هم به تحت الشعاع
مقابل بخرشید در اجتماع
ز مه گر کند مهر پهلوتهی
چه غم چون ز خویشش بود فربهی
چو فرمان چنان بودش از شهریار
که گردد دران راه منزل شمار
بهنگام عرض نشانهای راه
بران پیک دانا ببخشود شاه

بفّر قبول خودش خاص کرد
بداغش نشانمند اخلاص کرد
بسیمای مه داغ چون بر نهاد
دوم پایه را پایه برتر نهاد
صفای کشاد خدنگ نگاه
بدان حد که شد تیرش آماجگاه
بشمعی که بینش بشبگیر سوخت
شه دیده ور تیر بر تیر دوخت
عطارد به آهنگ مدحت گری
زبان جست بهر زبان آوری
به‌دستوری خواهش روزگار
نهان خود از پرده کرد آشکار
در اندیشه پیوند قالب گرفت
بخود در شد و شکل غالب گرفت

بدل گرمئی شوق جرأت فزاي
شد از دست و گردید دستان سرای

درین صفحه مدحی که من میکنم
خود از گفتهٔ خود سخن میکنم

که ای ذرّهٔ گرد راه تو من
ز خود رفتهٔ جلوه‌گاه تو من

نظر محو حسن خداداد تو
ستم کشتهٔ غمزهٔ داد تو

برفتار، رخش تو اخترفشان
بگفتار، لعل تو گوهرفشان

قبول غمت حرز بازوی شاه
غریب رهت جنت آرام‌گاه

خراج تو بر گنج گلشائیان
نثار تو پارنج مشّائیان

جهان‌آفرین را گرایش بتو
گنه بخشیش را نمایش بتو

سر من که بر خط فرمان تست
نجاتش ز دوران بدرمان تست

درین ره ستایش نگارتو ام
به‌بخشایش امیدوار تو ام

ازان پس که گشت اندران مرحله
عطارد فروزان بنور صله

سپهر سوم گشت جولان گهش
جبین سود ناهید اندر رهش

بط و بربط از پیش برچیدنش
نشان می و نغمه پوشیدنش

بدان گرمی از جا بر انگیخت گرم
که خونش ز اعضا فروریخت گرم

نه تنها برخساره رنگش شکست
که از لرزه در دست چنگش شکست

بناخن شکستنش ازان زخمه نی
که دلهای شوریده خستی بوی

ز بیم از کف چنگی دل‌نواز
بغیر از دف مه فروریخت ساز

چو در حلقهٔ شرع شد چنبری
بدان دف در آمد بخنیاگری

مه و زهره با هم دگر خوش بود
چو ساقی که از نغمه سرخوش بود

بدان دم که زاور[۱] برامش گرفت
چو شه سوی بالا خرامش گرفت

ردائی ز نورش بانعام داد
که در جلوه بر سر کشد بامداد

رباط سوم چون نوردیده شد
فرازش رباط دگر دیده شد

زر اندوده کاخی گزین منزلی
زبس روشنی دل نشین منزلی

۱- زاور: زهره ، توانائی - (فرهنگ آموزگار) -

ز هوشنگ هوشان کاؤس کوس
بسی بر در خانه در خاکبوس

بباﻻ و پائین ز ششں راهرو
نظرها بدان حلقه‌ای در گرو

بدان در بدریوزه روی همه
وزان قلزم آبی بجوی همه

دران کاخ جا کرده نام آوری
شهنشه نگویم شهنشه گری

جهانگیریٔ شهریاران بدو
گل افشانیٔ نوبهاران بدو

اگر نور گوئی نمودش ازو
وگر سایه جوئی وجودش ازو

به بیخواهشی با نظرهای پاک
زلعل و زر اکسیری سنگ و خاک

بسرهنگی شرع هنگامه ساز
بدو بسته گر روزه ور خود نماز

ز شادی سر از پای نشناخته
پذیره شده را برون تاخته

روان پیش پیششں مسیحا و بس
روانهای شاهان پیشین ز پس

قدمبوس پیغمبر ، آهنگ کرد
ز بس بوسه جا بر قدم تنگ کرد

ز مهرش بجنبش درآمد لبی
بهر بوسه رست از فلک کوکبی

بدینسان که گردون پُر از کوکبست
همانا ز گل بازیٔ آن شبست

رسیدش بدان خسروانی مناص[1]
به تعمیم اوقات، در وقت خاص

زنیرٌ نیاز و زشاهان سجود
ز عیسیٰ سلام و ز یزدان درود

خرامنده کبک بلندی گرای
بران زمره گسترد ظل همای

توانا ره انجام گردون خرام
فرا تر زد از چارمین چرخ گام

ز فرّ سوار و خرام ستور
به پنجم نشیمن در افتاد شور

سپهری سپهبد[2] به پر کلاه
گهر ریزها رُفت از شاهراه

ولی بود چون بر کمر دامنش[3]
توانگر نکرد آن گهر چیدنش

اگر خود همان یک کله‌وار برد
نه آخر گهرهای شهوار برد

بگو تا بدان گوهرین افسری
بخرشید تابان کند همسری

ازین پیش، کس چون توانگر شود
که سرهنگ باشه برابر شود

۱- مناص: مقام، قیام گاہ -
۲- سپہری سپہبد: مریخ- (فاضل)
۳- مثنوی ابر گہر بار طبع دہلی ۱۲۸۰ھ میں اس کے بعد سے ۳۴ شعر کم ہیں (فاضل) -

ازان دم که خونش برگ گرم شد
به منت پذیری دلش نرم شد

رگ گردنش از وفا پیشگی
ثمر سجده آورد در ریشگی

صف آرا گروهی ز بهرامیان[۱]
چو پیرامن کعبه ، احرامیان

نیاکان من تا جهانبان پشنگ
قدم بر قدم اندران حلقه تنگ

به آسیب بازو به بازو زدن
زهم جسته پیشی بزانو زدن

روانهای ترکان خنجر گزار
پرافشان دران بزم پروانه وار

شهنشاه چون عرض لشکر گرفت
فراز ششم چرخ ره بر گرفت

به پیش آمدش دلکشا معبدی
چنان چون بره ناگهان گنبدی

سروشان فرخنده امشا سپند[۲]
زده بر در صومعه دست‌بند

درو بام کاشانه خرشید زای
نکو محضری را بکاشانه جای

که منشور خوبی به تمغای اوست
ظهور سعادت به امضای اوست

۱- بهرامیان : ساکنین مریخ - (فاضل)
۲- امشا سپند : فرشتهٔ رحمت - (فاضل)

کنشش را ببایست نیرو دهی
منشش را بفرزانگی خو دهی

به تلخی گوارا چو قهر طبیب
به تندی ملائم ، چو خشم ادیب

جوان بخت پیری ، همایون صفات
ز دل زندگی بر مزاج حیات

خداوند از پاکی گوهرش
بیفشرد از مهر اندر برش

خداوند دریا و برجیس میل
ازین سو کششش بود و زان سوی میل

بدان جذب و میلی که انگیخت نور
چو شیر و شکر باهم آمیخت نور

خورد آب در راه ، رهرو اگر
پیمبر بره خورد شیر و شکر

بجوشید سرچشمهٔ نور ازو
خوشا راهرو چشم بددور ازو

بدان جرعه کز چشمهٔ نوش زد
بدان ذوق کاندر دلش جوش زد

به لطفش دم از آب حیوان گزشت
بموجش سر از کاخ کیوان گزشت

به‌چشم اثر بین فرزانه در
در آمد چراغی بدان خانه در

که گر خود توان گوهر جان شناخت
فروغ وی از داغ نتوان شناخت

بدل تنگی از بس فرو خورده دود
شده شعله را روی روشن کبود

دران پرده هندوی واژون بسیچ
بزنار تابی کفش خورده پیچ

سراسیمه از بس به تعظیم جست
نخ از دست رفت و بهم سود دست

بران رفته مسکین تاسف کنان
ز خجلت برفتن توقف کنان

زدش بسکه در هر قدم برملا
ادب ''دور باش'' و عنایت ''صلا''

فروماند حیران بدان کاردر
گران گشت پایش برفتار در

پیمبر که پوینده ٔ راه بود
به دادار جوینده ٔ راه بود

چو زینگونه زین هفت در بند ژرف
پدید آمدش فتح یابی شگرف

سپهر[1] ثوابت به پیش آمدش
گهرها ز اندازه بیش آمدش

گهر پیکران از یمین و یسار
نمودند برشه گهرها نثار

همانا سپهر اندران مرحله
ز هجرش دلی داشت پر آبله

ویا خود نگاهش دران شهر بند
ز تیزی بدیوار روزن فگند

۱- سپهر ثوابت : فلک هشتم ـ (فاضل)

که از جذبهٔ شوق و ذوق ظهور
ز روزن شد آن پرده غربال نور
زهی شوق[1] گستاخ دیدار خواه
زهی حسن مستور، عاشق نگاه
بدان شوق نازم که بے خویشتن
دود حسن سویش چنیں قطره زن
مگر قدسیان را خود از دیر باز
براه نبی چشمها بود باز
ویا رحمت حق بجولان گهش
ز سرجوش نور آب زد در رهش
خرامنده اندر گذرگاه ناز
خرامش همی کرد با برگ و ساز

بنظّاره هفت آشنا از پیش
روانهای کرّوبیان برخیش[2]
صور گونه گون از جنوب و شمال
کشودند بند نقاب خیال

حمل سر به نرمی فراپیش داشت
سپاهی ازان لابه بر خویش داشت
نه بینی که حیوان بیگانه خوی
بپوزش ز منعم بود طعمه جوی
چو اورا ست چوپانی آن رمه
هر آیینه تازند سویش همه

۱- مثنوی ''ابر گہر بار'' میں ''زهی شوخ'' چھپا ہے مگر غلط نامے میں اصلاح ہے -

۲- برخی : به فتحتین بمعنی صدقه و قربان - ۱۲ (غالب)

دود گاؤ تا سوی او بیدرنگ
سرون خودش زد بدل گاوشنگ[۱]
نبودی اگر شیر در عرض راه
چریدی بچالاکی از خوشه گاه
تو گوئی براه خداوند دور
سپهر از نمود ثرّیا و ثور
گدائیست هندی که سر تا بپا
به خرمهره آراسته گاو را
بدریوزه گستاخ پوید همی
ز رهرو بره وایه جوید همی
برینی سرو شان فرّخ لقا
ازاں هر دو کاشانهٔ دل کشا
ز پیوند خوشحالی مهر و ماه
ببستند حرزی به‌بازوی شاه
که چون باز گردد به بنگاه خاک
نباشد ز چشم بد اندیشه ناک
دو پیکر که گوئی وراتوامان
برهرو پذیری درآمد جهان
پیٔ هستیٔ شه بدست نیاز
ره آوردی از روزهای دراز
ز بس بود جوزا دراں رهروی
کمربستهٔ خدمت خسروی
بداں تا رود نیمه از نیمه بیش
ز تیزی ببرّید پیوند خویش

۱- گاوشنگ : بمعنی چوبیکه بداں گاؤ رانند - ۱۲ (غالب)

چو همسایه بکشود درهای نور
بغلطید سرطان بدریای نور
بکاشانهٔ مه ازان فتحیاب
به بستند پیرایهٔ ماهتاب

چنان دلکش افتاد از هر طرف
که برجیس را گشت بیت‌الشرف
بشاهانه کاخی کاسد نام داشت
در از نقطهٔ اوج بہرام داشت

کشودند در تابدان اصطکاک[1]
شود دشمنان را جگر چاک چاک
نشد گرچه چون گاؤ قربان او
ولی شیر شد گربهٔ خوان او

نچندان به محنت کشی خو گرفت
که برگاؤ بتواند آهو گرفت
نه در پنجه زور و نه در سینه دم
فروماند بےحس چو شیر علم[2]

شود تا خداوند را سجده بر
بر آورد از خوشه صد دانه سر
دران راه گر توشهٔ داشت چرخ
هم از خرمنش خوشهٔ داشت چرخ

ازین ره بخود بسکه بالید تیر
هم از خانهٔ خود شرف دید تیر

۱- اصطکاک: بمعنی آواز کشودن در - ۱۲ (ابرگہر بار) - بہم وا کوفتن (منتخب)

۲- ''ابر گہر بار'' میں 'ی' کے نقطے رہ گئے ہیں اور ''شر علم'' لکھا ہے۔

کشایش در گنج تا باز کرد
به میزان گهرسنجی آغاز کرد
ازانجا که در مطرح روزگار
ترازو پیٔ سختن[۱] آمد بکار
سپہر از شرف تا خیالی به پخت
زحل را بخاک ره خواجه سخت
هم آن پله را چرخ فرسای دید
هم این پله را بر زمین جای دید
به عقرب خداوند آن جلوه گاه
بران شد که تازد بسویش ز راه
ولی چون نگہبانی راه داشت
سر بازگشت شہنشاه داشت
نگہداشت خود را ازان بیرهی
که از حکم شه سر نه پیچد رهی
به قوس اندرآورد چون خواجه روی
سعادت ببرجیس شد ، مژده گوی
کمان گشت زین فخر قربان خویش
زهی طالع غالب عجزکیش
بدین خوشدلی بایدم شاد زیست
که در طالع من قدمبوس کیست
پزیرفت خواهم ز گردون سپاس
که باشد مرا طالع روشناس
کمان چون بدینسان نمایش گرفت
خدنگ خبر زو کشایش گرفت

۱- سختن : بمعنی وزن کردن - ۱۲ (ابر گہر بار)

چنان جست تیر از کمان دلپسند
که ننشست جز در دل گوسپند

گرفتش دوان سعد ذابح براه
که نخچیر گیرد جلودار شاه

چو شد ذابح ازتشنگی تاب کش
بدولاب شد فرع دلو آب کش

عزیزان بهم کار دین می کنند
بلی ، خواجه تاشان چنین می کنند

زهی شوکت خواجهٔ ره سپار
که باشندش اختر بره پیشکار

سپهری رفیقان بسیار فن
گسستند از دلو گردون رسن

به غمخوارگی تافتندش بدست
که گیرد مگر خواجه ماهی بشست

زحق هرکه فرمان شاهی گرفت
تواند ز مه تا به‌ماهی گرفت

ازان پس که این راه کوتاه شد
حمل تا به حوتش قدمگاه شد

بدان پویه پیمود این هشت چرخ
که صد بارگرد سرش گشت چرخ

نهم پایه کانرا توان خواند عرش
بره زاطلس خویش گسترد فرش

زهی نامور پایهٔ سرفراز
سراپردۂ خلوتستان راز

سررشتهٔ نازش چون و چند
به پیوند هستی بدان پایه بند

بود گرچه برتر ز افلاکیان
ولی لرزد از نالهٔ خاکیان

دل بینوائی گرآید به درد
نشیند بدان پایهٔ پاک گرد

صدای شکست کمرگاه مور
درینجاست هیچ و دران پرده شور

نه از مهر نام و نه زانجم نشان
نه دریا نمایان نه ریگ روان

دوگیتی نمایش ز صبحش دمی
خود آن صبح را هر فلک شبنمی

ز ایزد پرستان بهر سرزمین
بود سجده آنجا چو سر بر زمین

بساطی هم از خویشتن تابناک
ز آلایش کلفت رنگ پاک

ز بس پای نغز خیال از صفا
رسیدن به پهنای آن نارسا

درآمد گرانمایه مهمان حق
برخ ماهتاب شبستان حق

قدم‌زد براهی که رفتن نداشت
نگهبان و همراه و رهزن نداشت

درآنجا که از روی فرهنگ و رای
بجا باشد[1] ار خود نگویند جای
جهت را دم خودنمائی نماند
زمان و مکان را روائی نماند

غبار نظر شد ز ره ناپدید
سراپای بیننده شد جمله دید
در آورد بی کلفت سمت و سوی
به نور السموات والارض روی

تماشا هلاک جمال بسیط
فروغ نظر موجهٔ زان محیط
شنیدن شهید کلامی شگرف
منزه ز آمیزش صوت و حرف

کلامی به بیرنگیٔ ذات علم
شنیدن به عقل اندر اثبات علم
نخستین در از ''لا'' کشودآن رواق
ز ''الّا'' بصد اندرش پیشطاق

بر ''الّا'' رسید و ز ''لا'' درگزشت
رسیدن ز پیوند جا در گزشت
دران خلوت آباد راز و نیاز
بروی دوئی بود چون در فراز

نماند اندر احمد زمیمش اثر
که آن حلقهٔ بود بیرون در

۱- کلیات طبع اول نول کشور، ابر گہر بار طبع دھلی میں ''از خود لگویند'' ھے، لیکن غلط نامهٔ ابرگہر بار مین اسے ''ار خود'' بنایا گیا ھے۔

احد جلوه گر با شیون و صفات
نبی محو حق چون صفت عین ذات

فروغی به مهر جهانتاب در
بهر ذره تابی ازان تاب در

ز خرشید ناگشته پرتو جدا
محیط ضیا خود ، محیط ضیا

رقمهای اندازهٔ هر شمار
همان از شگاف قلم آشکار

دو عالم خروش نواهای راز
ولیکن همان در خم بند ساز

ورق در ورق نکتهٔ دلپذیر
ولیکن همان در خیال دبیر

زگفتن شنیدن جدائی نداشت
نمودن ز دیدن جدائی نداشت

چو اندازهٔ هر نمایش گرفت
ز وحدت بکثرت گرایش گرفت

بحکم تقاضای حبّ ظهور
تنزّل در اندیشه آورد زور

احد کسوت احمدی یافته
دم دولت سرمدی یافته

بکوشش ز طبع وفا کوش او
همان میم او حلقهٔ گوش او

بهر گونه بخشش سرافراز گشت
هم از حضرت حق بحق باز گشت

بیامد بدین خاکدان بیدرنگ
چو در جوی آب و چو بر روی رنگ
نرفته برون پای از نقش پای
که کرده قدم بر قدمگاه جای

شراری که از سنگ آن آستان
بدرجست از نعل برق جهان
هنوزش قدم در ره اوج بود
که آمد ز بالا به پستی فرود

بجنبش درش حلقهٔ در همان
زدی گرم بالین و بستر همان
سری را که رحمت نهد در کنار
در آورد محبوب پروردگار

بخوابی که بیداریٔ بخت او
زتار نظر بافتی رخت او
سحرگه که وقت سجودش رسید
ز همنام یزدان درودش رسید

بشادی در آمد علی از درش
وصال علی شادیٔ دیگرش
شب از بادهٔ قدس ساغر گرفت
صبوحی ز دیدار حیدر گرفت

جمال علی چشمهٔ نوش بود
صبوحی هم از بادهٔ دوش بود
دو همراز با همدگر راز گوی
نشانهای بینش بهم باز گوی

دو چشمست و هر چشم را بینشیست
ولی آنچه بینند هر دو یکیست
نگنجد دوی در نبی و امام
علیه الصلوة علیه السلام

منقبت

هزار آفرین بر من و دین من
که منعم پرستیست آئین من
چراغی که روشن کند خانه ام
تو گوئی منش نیز پروانه ام
حریفی که نوشم می از ساغرش
بهر جرعه گردم بگرد سرش
بر آنم ، که دادار یکتاستی
فروغ حقائق ، ز اسماستی
بهر گوشه از عرصهٔ این طلسم
دهد روشنائی جداگانه اسم
بر آن شی که هستی ضرورش بود
باسمی ز اسما ظهورش بود
کزان اسم روشن شود نام او
بدان باشد آغاز و انجام او
بود هر چه بینی ، به سودای دوست
پرستار اسمی ز اسمای دوست
هر آیینه در کارگاه خیال
کز آنجاست انگیزش حال و قال
لبم در شمار ولی اللهیست
دلم راز دار علی اللهیست

چو مربوب این اسم سامیستم
نشانمند این نام نامیستم
بلندم بدانش نه پستم همی
بدین نام یزدان پرستم همی

نیاساید اندیشه ، جز باعلی
ز اسما نیندیشم ، الاّ ''علی''
ببزم طرب همنوایم علیست
به کنج غم انده ربایم علیست

به تنهائیم ، راز گوئی باوست
بهنگامه ام ، پایه جوئی باوست
در آیینهٔ خاطرم رو دهد
باندیشه پیوسته نیرو دهد

مرا ماه و مهر و شب و روز اوست
دل و دیده را محفل افروز اوست
بصحرا بدریا براتم ازوست
بدریا ز طوفان نجاتم ازوست

خدا گوهری را که جان خوانمش
ازان داد تا بروی افشانمش
مرا مایه گر دل و گر جان بود
ازو دانم ار[1] خود ز یزدان بود
کنم از نبی روی در بوتراب
به مه بنگرم جلوهٔ آفتاب

۱- تمام مآخذ میں ''از'' ہے۔ مثنوی ''ابر گہر بار'' طبع دہلی کے صحیح نامہ میں درست کر دیا گیا ہے۔

ز یزدان نشاطم به حیدر بود
ز قلزم بجو آب خوشتر بود

نبی را پذیرم به پیمان او
خدا را پرستم به ایمان او

خدایش روانیست هر چند گفت
علی را توانم خداوند گفت

پس از شاه کس غیر دستور نیست
خداوند من از خدا دور نیست

نبی را اگر سایه صورت نداشت
تردد ندارد ضرورت نداشت

دوپیکر دو جا در نمود آمده
اثرها بیک جا فرود آمده

دو فرخنده یار گران سایه بین
دو قالب ز یک نور ویک سایه بین

بدان اتحادی که صافی بود
دو تن رایکی سایه کافی بود

ازان سایه یکجا گرایش کند
که احمد ز حیدر نمایش کند

بهر سایه کافتد ز بالای او
بود از نبی سایه هم پای او

زهی قبلهٔ اهل ایمان علی
بتن گشته همسایهٔ جان علی

پدیدار در خاندان نبی
به گیتی در از وی نشان نبی

بیک سلک روشن ده و یک[۱] گہر
نبی را جگر پارہ ، او را جگر

جگر پارہ ھا چون برابر نہند
بگفتن جگر نام آن برنہند

علی راست بعد از نبی جای او
ہمان حکم کل دارد اجزای او

ہمانا پس از خاتم المرسلینؐ
بود تا بہ مہدی علی جانشین

نژاد علی با محمدؐ یکیست
محمدؐ ہمان ، تا محمدؐ یکیست

در احمد الف نام ایزد بود
ز میم آشکارا ، محمدؐ بود

الف میم را چون شوی خواستار
نماند ز "احمد" بجز ھشت و چار

ازین نغمہ کاینک رہ ھوش زد
بدل ذوق مدح علی جوش زد

ز کویش بہ گلشن سخن می کنم
ستم بر گل و نسترن می کنم

ز نطقش ، بگفتار خوان می نہم
سخن را شکر در دہان می نہم

ز لطفش بہ ھستی خبر می دھم
بریگ روان دجلہ سر می دھم

علی آن ز دوش نبی رفرفش
علی آن "ید اللہ" را کف ، کفش

۱- گیارہ موتی ، گیارہ امام -

خدا را گزین بندهٔ رازدار
خدا بندگان را خداوندگار

به تن بینش افروز آفاقیان
بدم دانش آموز اشراقیان

به کثرت ز توحید پیوند بخش
به بی برگ بخل برومند نخش

بسائل ز خواهش فزون تر سپار
بلب تشنهٔ جرعه کوثر سپار

نوید ظفر گردی از لشکرش
حساب نظر فردی از دفترش

گداز غمش ، کیمیای سرشت
غبار رهش ، سیمیای بهشت

نگه کوثر آشامد ، از روی او
روان تازه رو گردد ، از بوی او

نیازرده گوشش ز آواز وحی
ضمیرش سراپردهٔ راز وحی

براه حق اندر نشانها ازو
بهر نکته در داستانها ازو

به پیوند او ربط هر سلسله
خود او را رهی[1] خضر هر مرحله

گذشته به معشوق از همسری
بدوش نبی پایش ، از برتری

زمین و فلک در گذرگاه او
غبار سحر خیزئی آه او

۱- رهی : بمعنی غلام - ۱۲ (ابر گهر بار)

اگر پارۂ گشته پستی گرا
بود پارۂ همچنان بر هوا
بیاد حق از خواهش نفس دور
ز شادی ملول و بانده صبور
بچشمی که گرید به بزم اندرون
دل آسوده خسپد برزم اندرون

بدرویشیش فرّ شاهنشهی
زهی خاکساری و ظل اللّهی

هوا و هوس گشته فرمان پذیر
بفرمان روائی حصیرش سریر
خرد زله خوارش بفرزانگی
قضا پیشکارش بمردانگی

نهانش بیاد آوری دلکشاست
عیانش بری نام ''مشکل کشا'' ست

براهیم خوئی ، سلیمان فری
مسیحا دمی ، مصطفیٰ[ص] گوهری

لباس وفا را طراز عمل
جهان کرم را صباح ازل

نهادش به خلق خدا مهر خیز
جبینش بدرگاه حق سجده ریز

نوید نجات اسیران غم
نظرگاه احرامیان حرم
ز شش سو بسویش نگاه همه
ولادت گہش قبله گاه همه

روان و خرد گردی از راه او
نه ایزد ، ولی کعبه درگاه او

حدوثش نمود حدوث جهان
بگردندگی درگهش آسمان

اگر خاکبازان دشت نجف
بخرشید سازی ، کشایند کف

چو انجم بشب مہر گیتی فروز
نیارند مردم شمردن بروز

نبی ص را جگر تشنهٔ روی او
خدا را بخواهش نظر سوی او

کسانی که اندازه پیش آورند
سخنہا ز آئین و کیش آورند

بنادانی از شور گفتار من
سگالند زانگونه هنجار من

که آرایش گفتگو کرده ام
بهحیدر ستائی غلو کرده ام

مرا خود دل از غصه بیتاب باد
ز شرم تنک مایگی آب باد

چه باشد ؟ ازین پیش شرمندگی
که خور[1] را ستایم برخشندگی

به بحر از روانی سرایم سرود
بهخلد از ریاحین فرستم درود

۱- کلیات لول کشور اول و دوم "که خود را ستایم" مثنوی ابرگہو بار "که خور را ستایم" مطابق متن-
خور : سورج ، آفتاب - (فاضل) -

بگلشن برم برگی از نسترن
به پیچاک سنبل فروشم شکن
ستایم کسی را که در داستان
شوم باسخن آفرین هم زبان

به رد و قبول کسانم چه‌کار؟
علی بایدم ، باجهانم چه‌کار؟
در اندیشه پنهان و پیدا علی است
سخن کز علی میکنم با علی است

دلم در سخن گفتن افسرده نیست
همانا خداوند من مرده نیست
چو خواهم حدیثی سرودن ازو
بود گفتن از من ، شنودن ازو

گر از بنده های خدا چون منی
که در خرمن ارزد به نیم ارزنی
علی را پرستد به کیش خیال
چه کم گردد از دستگاه جلال؟

گلستان که هر سو هزارش گلست
همه سبزه و لاله و سنبلست
اگر رفت برگ خزانی ازان
چمن را نباشد زیانی ازان

نه‌دارد غم و غصه یزدان پاک
علی را اگر بنده باشم ، چه باک
تو غافل ز ذوق ثنا گوئیم
سزا گویم و ناسزا گوئیم

مرا ناسزا گفتن آئین مباد
لب من رگ ساز نفرین مباد

بود گرچه با هر کسم سینه صاف
من و ایزد ، البته نبود گزاف

که تا کینه از مهر بشناختم
بکس غیر حیدر نپرداختم

جوانی برین در بسر کرده ام
شبی در خیالش سحر کرده ام

کنونم که وقت گزشتن رسید
زمان[1] بحق بازگشتن رسید

دمادم بجنبش درای دلست
شنیدن رهین صدای دلست

که برخیز و آهنگ ره ساز ده
به جمّازهٔ خفته آواز ده

بشبگیر زین تیره مسکن برآ
بجنبان درای و برفتن درآ

نجف ، کان نظرگاه امید تست
طرب خانهٔ عیش جاوید تست

نه دورست چندان که فرسخ شمار
برنجاند اندر شمردن یسار

دلیرانه راهی بریدن توان
به آرام گاهی رسیدن توان

۱- تمام نسخوں میں یوں هی هے - شاید صحیح هے- " زمانی بحق باز" ای زمانی رسید که بحق باز گشتم - (فاضل)

بر آنست دل ، بلکه من نیزهم
که چون جان خود انجاست تن نیزهم

بود گرچه ثابت که چون جان دهم
علی گویم و جان به یزدان دهم

بهند و عراق و به گلزار و دشت
بسوی علی باشدم بازگشت

ولیکن چو آن ناحیه دلکشست
اگر در نجف مرده باشم خوشست

خوشا[۱] عرفی و گوهر افشاندنش
به انداز دعوی پرافشاندنش

که ناگه کار خود از پیش برد
بدشت نجف لاشهٔ خویش برد

تن مرده چون ره به مژگان رود
اگر زنده خواهد خود آسان رود

چو عرفی سرو برگ نازم کجا؟
بدعوی زبان درازم کجا

چو عرفی بدرگاهم آن روی کو
چنان دادرس جذبه زانسوی کو

نگویم غلط باخودم خشم نیست
زمژگان خویشم خود این چشم نیست

مزن طعنه چون پایهٔ خاص هست
نباشد اگر جذبه اخلاص هست

۱- عرفی کا شعر ہے :
به کاوش مژه از هند تا نجف بروم اگر به هند هلاکم کنی وگر به تتار
غالب نے گیارہ شعروں میں اس مضمون سے بڑے نکتے پیدا کیے ہیں ۔ (فاضل)

چو اینست و از خواجه آن بایدم
زغم چشم قلزم فشان بایدم
ز دل گریه اندوه رشکم برد
بمژگان مگر سیل اشکم برد

من این کار بر خود گرفتم بچشم
بمژگان گر او رفت رفتم بچشم
بگریم ز غم بو که شادم کنند
گهر سنج گنج مرادم کنند

بگریم که سیلم ز سر بگزرد
نه از سر ز دیوار و در بگزرد
سرشکی که از دیدهٔ من چکد
دگر باره از چشم روزن چکد

طلب پیشگان را بدعوی چه کار
زبخشنده یزدانم امیدوار
که جان بر در بوترابم دهد
دران خاک فرمان خوابم دهد

چه کاهد ز نیروی گردان سپهر
چه کم گردد از خوبی ماه و مهر
که دلخستهٔ دهلوی مسکنی
ز خاک نجف باشدش مدفنی

خدایا! بدین آرزویم رسان
ز اشک من ، آبی بجویم رسان
نفس در کشم ، جای گفتار نیست
تو دانی و این از تو دشوار نیست

کزین بعد در عرصهٔ روزگار
بروی زمین یا بکنج مزار
ز غالب نشان جز بران در مباد
چنین باد فرجام و دیگر مباد

مغنی نامه

مغنی! دگر زخمه بر تار زن
گل از نغمهٔ تر بدستار زن
به پردازش آن گل افشان نوای
نگویم غم از دل، دل از من ربای
دل از خویش بردار و بر ساز نه
هم از خویش گوشی بر آواز نه
ز گنجینهٔ ساز بردار بند
درین پرده نقشی بهنجار بند
برامش بزاور هم آواز شو
به آهنگ دانش نوا ساز شو
که دانم ز دستان سرائی چنین
دلآویز باشد نوائی چنین
ز کام و زبان هرسه جان را درود
ز جان جاودانی روان را درود
گهر جوی را مژده کز تیره خاک
درخشد همی گوهر تابناک
که هر گوهری را که دارند پاس
بدان گیرد اندازه گوهر شناس
دمی کاندر آئین ز من میرود
تو دانی سخن در سخن میرود

سخن گر چه گنجینهٔ گوهر ست
خرد را ولی تابشی دیگر ست

همانا بشبهای چون پرّ زاغ
نه بینی گهر جز بروشن چراغ

به پیرایش این کهن کارگاه
بدانش توان داشت آئین نگاه

بود بستگی را کشاد از خرد
سر مرد خالی مباد از خرد

خرد چشمهٔ زندگانی بود
خرد را به‌پیری جوانی بود

فروغ سحرگاه روحانیان
چراغ شبستان یونانیان

پگاهی که پوشیده رویان راز
به خمیازه جستند از خواب ناز

چه خمیازه عنوان نام آوری
خمار مئ خواهش دلبری

ازان پیش کاین پرده بالا زنند
نگه را صلای تماشا زنند

ردای فلک گوهر آما شود
بساط زمین عنبر اندا شود

نوردی ازان پرده بر جای خویش
برون داد نوری ز سیمای خویش

ز بالی که رخشانی برق زد
سراپرده جوش اناالشرق زد

نخستین نمودار هستی گرای
''خرد'' بود کامد سیاهی زدای

به پیمانه های[1] نظر نور پاک
نمودند قسمت بر اجزای خاک

ز هر ذره کان آفتابی شود
نگه سرخوش کامیابی شود

هنوزم در آیینهٔ زنگ بست
خیالی ازان عالم نور هست

که بینی به تاریکیٔ روز من
فروزان سواد دل افروز من

کف خاک من زان ضیا گستریست
که چون ریگ رخشان بانجم گریست

کسی، کو دم از روشنائی زند
بخود فال دانش ستائی زند

درین پرده خود را ستائشگرست
که دانند مردم که دانشورست

خرد جویم[2] ار خود بود مرگ من
به هستی خرد بس بود برگ من

سخن گرچه پیغام راز آورد
سرود ارچه در اهتزاز آورد

۱- غلط نامهٔ ابر گہر بار میں ''پیمانه ها'' اور متن کلیات و مثنوی میں ''پیمانها'' ہے۔
۲- کلیات کے تمام زیر نظر نسخوں میں ''خرد جویم از خود'' ابر گہر بار میں ''خرد جویم ار خود'' ہے۔

خرد داند این گوهربن در کشاد
ز مغز سخن گنج گوهر کشاد

خرد داند آن پرده بر ساز بست
برامش طلسمی ز آواز بست

بدانش توان پاس دم داشتن
شمار خرام قلم داشتن

ازین باده هرکس که سرمست تر
به افشاندن گنج تر دست تر

بمستی خرد رهنمای خود ست
رود گر ز خود هم بجای خود ست

بکام دل می پرستان شبی
بساقی گری خاست نوشین لبی

تبسم کنان باده در جام ریخت
پی نقل از پسته بادام ریخت

ز لب بوسهٔ بر لب جام زد
بخود کرد پیمانه را نامزد

لبش را می از بسکه افشرده تنگ
بیامیخت با اب چو با لعل رنگ

همیخواست باتشنگان دست برد
خودش بادهٔ خویش از دست برد

بدان می که خود خورد و از دست شد
نه یک تن دو تن ، کانجمن مست شد

کجا درخور آن شرابیم ما
ز میخواره ساقی خرابیم ما

چو ساقی ره خود نمائی گرفت
به مستی خرد زو روائی گرفت

سیه مست تر هر که هشیار تر
سبک دوش تر چون گرانبار تر

جگر گون نوائی که نامش دلست
ز ته جرعه خواران این محفلست

نشیدی که مستان این می کشند
صریر از قلم ، ناله از نی کشند

سرودی سخن روشناس همست
که هر یک ز وابستگان دمست

بود در شمار شناساوری
خرد را بگفتار هم گوهری

زهی کیمیائی معانی سخن
بخود زندهٔ جاودانی سخن

سخن را ازان دوست دارم که دوست
به تصدیق از ما طلب‌گار اوست

سخن گرچه خود گوهرین افسر ست
سخن در سخن لعل با گوهر ست

سخن باده اندیشه مینای او
زبان بی سخن لای پالای او

به‌پیمودن باده پیمانه گوش
خرد ساقی و خود خرد جرعه نوش

حریفان درین بزم همواره مست
به بوئی ز می جمله یکباره مست

پلنگینه پوشان درین انجمن
چو گردون برقص اندرون چرخ زن

خرد کرده در خود ظهوری دگر
دل از دیده پزرفته نوری دگر

ز گنجی که بینش به‌ویرانه ریخت
در آفاق طرح پری‌خانه ریخت

زدودن ز آیینه زنگار برد
ز دانش نگه ذوق دیدار برد

درین حلقه اوباش دیدار جوی
بدریوزهٔ رنگ آورده روی

خرد کرده عنوان بینش درست
رقم سنجیٔ آفرینش درست

فروغ خرد فرّهٔ ایزدیست
خدا ناشناسی ز نابخردیست

نظر آشنا روی دانائیش
عمل روشناس توانائیش

زاندیشه دم زد، نظر نام یافت
بکردار رفت، از اثر کام یافت

بخشم سبک سر ازو گوش تاب
گرانپای خواهش ازو در حساب

چنان سطوتش را زبون خشم و آز
که فرمان او برده گرگ و گراز

غضب را نشاط شجاعت دهد
ز خواهش به عفت قناعت دهد

باندازه زور آزمائی کنند
خورد باده و پارسائی کنند

بدین جنبش از مرگ بخشد نجات
براندیشه پیماید آب حیات

منش های شائسته عادت شود
نظر کیمیای سعادت شود

ز دانش پدید آید آئین داد
رسی چون بدین پایه نعم المعاد

برند از تو گر خود سرایندگی
ندارد زیانی به پایندگی

جگر خون کن و از دل آزاد زی
بدین جاودانی روان شاد زی

چنان دان که مردی بر اسپی سوار
بدشتی رخ آورده بهر شکار

جگر خواره یوزیست[۱] همراه او
جگر خوارئ یوز دل خواه او

کند گر باندیشه رفتار ها
نگهدار اندازهٔ کارها

نگیرد سمندش ره توسنی
بود رام یوزش بصید افگنی

به نیروی مردی و غمخوارگی
همش یوز آسوده هم بارگی

چنین کس بدینگونه رخش و پلنگ
تواند که صیدی در آرد بچنگ

۱- یوز : چیتا - (ابر گهر بار)

وگر دشت‌پیما هنرپیشه نیست
شناسای فرجام اندیشه نیست

ره‌انجام[۱]، بیراهه پوئی کند
دد[۲] اندر روش زشت خوئی کند

چرد در چراگاه تا برگ و شاخ
رود درپی صید در سنگلاخ

بجوشد بسرمغز رخش از تموز
به خارا شود سفته چنگال یوز

بمستی یکی گشته پولاد پای
ز تندی یکی رفته پولاد خای

مراین را ز پری شکم بادناک
مرآن را ز گرمی زبان چاک چاک

سوار اندرین هرزه گردی نژند
نه‌رویش براه و نه‌صیدش به‌بند

سواری که رخشش نه فرمان برد
ندانم که بیچاره چون جان برد

من بےخبر کاین قدم میزنم
سپندار کز داد دم میزنم

بدین دم که درنامه رانم همی
بدان خاک ناچیز مانم همی

کزان خاک ریحان و سنبل دمد
دگر گونه‌گون لاله و گل دمد

۱- ره انجام: مرکب (سواری) (ابر گهر بار)
۲- جانور، شیطان، درنده - (فاضل)

تماشائیان را بود سرو و تاک
بود همچنان جوهر خاک خاک
ز دردی که دل را بهم می‌زند
ز جوشی که خاطر بغم می‌زند
بود در گزرگاه آواز من
شناور بخون گوش دمساز من
بدانش غم آموزگار منست
خزان عزیزان بهار منست
غمی کز ازل در سرشت منست
بود دوزخ امّا بهشت منست
بغم خوشدلم غمگسارم غمست
به بیدانشی پرده‌دارم غمست
زمن جوی در بد، نکو زیستن
جگر خوردن و تازه‌رو زیستن
درشتی به‌نرمی زبون داشتن
رسد گر ستم، غمزه پنداشتن
بعجز از درون سو جگر سوختن
بناز از برون سو رخ افروختن
بهنگامه نیرنگ ساز آمدن
ز خود رفتن و زود باز آمدن
ز دل خار خار غم انگیختن
خسک در گزار نفس ریختن
سمن چیدن و در ره انداختن
دل افشردن و در چه انداختن

بدریوزه گنجینه اندوختن
ببازیچه دانائی آموختن

طرب را به میخانه گردن زدن
طرب خانه را قفل آهن زدن

روان کردن از چشم همواره خون
بشورابه شستن ز رخساره خون

برفتن سر از پای نشناختن
بماندن تن از جای نشناختن

شگفتن ز داغی که بر دل بود
نهفتن شراری که در دل بود

بدین جاده کاندیشه پیموده است
غمم خضر راه سخن بوده است

نظامی نیم ، کز خضر در خیال
بیاموزم آئین سحر حلال

زلالی نیم ، کز نظامی بخواب
بگازار دانش برم جوی آب

نظامی کشد ناز ، تابم کجا
زلالی بود خفته ، خوابم کجا

مرا بسکه در سن اثر کرده غم
بمرگ طرب مویه گر کرده غم

نظامی بحرف از سروش آمده
زلالی ازو در خروش آمده

من از خویشتن با دل دردمند
نوای غزل برکشیده بلند

غزل را چو از من نوائی رسید
ز والا بسیچی بجائی رسید
که نشگفت کاین خسروانی سرود
شود وحی و هم بر من آید فرود
نباشم گر از گنجه ، گنجم بس ست
بغم گر چنین پرده سنجم بس ست
کنونم بسر شور گفتار نیست
بساز غزل زخمه بر تار نیست
بشعر ارچه کمتر شکیبم همی
بدین پرده خود را فریبم همی
کسی کش بجائی بود دل به‌بند
به‌افسانه لختی گسارد گزند
کسی را که باغم شماری بود
روا باشد ار غمگساری بود
که درخستگی چاره‌جوئی کند
بغم خواری افسانه گوئی کند
چو میرد بر آن مرده نالد هم او
سر انجام کارش سگالد هم او
مرا بین که چو شکل افتاده است
چه خونهاست کاندر دل افتاده است
خود از درد بیتاب و خود چاره جوی
خود آشفته مغز و خود افسانه گوی
به تنهائی از همدمان خودم
بدل مردگی نوحه خوان خودم

کسم در سخن کار فرمای نیست
به بخشندگی همت افزای نیست

چه گوید زبان‌آور بی نوا
چه آید ز هیلاج بی کدخدا

شبی کاین ورق را کشودم نورد
به پرکار اندیشهٔ تیز گرد

شب از تیرگی اهرمن روی بود
ز سودا جهان اهرمن خوی بود

به‌خلوت ز تاریکیم دم گرفت
نشاط سخن صورت غم گرفت

دران گنج تار و شب هولناک
چراغی طلب کردم از جان پاک

چراغی که باشد ز پروانه دور
چراغی که بادا ز هر خانه دور

نه بینی نشانی ز روغن درو
کند شعله بر خویش شیون درو

چراغی که بی روغن افروختم
دلی بود کز تاب غم سوختم

ز یزدان غم آمد دل افروز من
چراغ شب و اختر روز من

نشاید که من شکوه سنجم ز غم
خرد رنجد از من چو رنجم ز غم

غم دل ز من مرحبا جوی باد
دلم زار و لب مرحبا گوی باد

دلم همچو غالب بغم شاد باد
بدین گنج ویرانه آباد باد

ساقی نامه

بیا ساقی ! آئین جم تازه کن
طراز بساط کرم تازه کن

به‌پرویز از می درودی فرست
به بهرام از نی سرودی فرست

به دور پیاپی به پیمای می
بشور دمادم بفرسای نی

قدح را به پیمودن می گمار
نفس را بفرسودن نی گمار

نکیسا دهان را برامش در آر
سهی سرو را در خرامش در آر

بخشم ار بلائی ز یاران بگرد
به کارم دل شاد خواران بگرد

مبادا نظامی ز راهت برد
بدستان سوی خانقاهت برد

فریبش مخور چون می آشام نیست
ستم‌دیدهٔ گردش جام نیست

خود او راست از پارسا گوهری
سپهری سروشی بساق گری

ورع پیشه مسکین چه داند ترا
به آرایش نامه خواند ترا

رضاجوی من شو که ساغر کشم
گرم نیل و جیحون دهی، در کشم

ز پیمودن می بجام سفال
خورد دجله در ساغرم خاکمال

اگر زود مستم پریشان نیم
وگر دیر مستم گران جان نیم

پزیرد ز می گوهرم آب و رنگ
بمستی فزون گرد دم هوش و هنگ

ز اندازه سنجی بر آنم که تو
گرانمایه‌ای لیک دانم که تو

به ساقی گری رند و آزاده ای
خوری باده ، اما تنک باده ای

هر آینه چون یک دو ساغر کشی
ز مستی خرد را بجون در کشی

بلغزد ترا پا برفتار در
سراسیمه گردی بهرکار در

بجائی رسد کار کز تاب می
گلوی صراحی ندانی ز نی

ازان پیش کاین رفتگی رو دهد
گل جلوهٔ بیخودی بو دهد

بیندیش جای و بیارای بزم
بنه باده و گل به پهنای بزم

فروهشتهٔ از دو سو بر عذار
شکن در شکن طرهٔ مشکبار

به می دادن ، ای سرو سوسن قبای
به زلف درازت مپیچاد پای

همانا تو دانستهٔ کز دو سال
ننوشم می الّا به بزم خیال

ز لب تشنگی چون به می درخورم
تو کمتر خور امروز تا بر خورم
توآن چشمه ای کز تو خضر آب خورد
سکندر ز لب تشنگی تاب خورد

نه خضری که در آب باشی بخیل
تو آبی ولی کوثر و سلسبیل
هر آئینه چون اعتقاد این بود
منوش و بنوشان که داد این بود

ز خود رفته‌تر کیست هندوی تو؟
عجب نبود از خوبیٔ خوی تو
که جوئی رضای ز خود رفتهٔ
دهی می به ترک جگر تفتهٔ

تو ای آنکه پهلو نشین منی
به پیغاره اندر کمین منی
ندانی پس از روزگاری دراز
بمی کرده ام دست باری دراز

در اندیشه محو تلاشم هنوز
قدح ساز و ساقی تراشم هنوز
درین داستان نیز گر وارسی
بخویشست گفتارم از بیکسی

می خویش و جام سفال خودم
نه ساقی که من هم خیال خودم
چه ساقی ؟ یکی پیکر سیمیا
مس آرزوی مرا کیمیا

مرا دستگاه می و شیشه کو؟
نشاطی چنین جز در اندیشه کو؟

می و شیشه بگزار و بگزر ز من
همانا نه من بلکه این انجمن

گل و بلبل و گلستان نیز هم
مه و انجم و آسمان نیز هم

نمودیست کانرا بود ''بود'' هیچ
زیان هیچ و سرمایه وسود هیچ

بعرض شناسائی هرچه هست
به وهم ست پیدائی هرچه هست

نه هرگه که تنها نشینی بجای
بخاطر کنی طرح بستانسرای

به آرائش باغ رو آوری
دران باغ از دجله جو آوری

دمانی گل و نرگس از روی خاک
نشانی بطرف چمن سرو و تاک

نوا گر کنی مرغ بر شاخسار
بموج آوری آب در جویبار

بخویش ارچه داری گمانی ز باغ
برون از تو نبود نشانی ز باغ

در اندیشه پنهان و پیدا توئی
گل و بلبل و گلشن آرا توئی

نمود دوگیتی به گیتی خدای
چنینست ، دیگر ندانیم رای

من و تو که بدنام پیدائیم
رقم های منشور یکتائیم

و لیکن چو این ایزدی سیمیاست
بدانست حسی چنین دیرپاست

نمودی که حق راست نبود چرا؟
زمان چون ازانجا ست نبود چرا؟

دوگیتی ازان جو نمی بیش نیست
ازل تا ابد خود دمی بیش نیست

زمان و مکان را ورق در نورد
خیالی برون ریز از هر نورد

نه از من ز سعدی شنو تا چه گفت
سخن گفت در پرده اما چه گفت

''ره عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عارفان جز خدا هیچ نیست''

دگر رهروی گوید از زیر دلق
که حقست محسوس و معقول خلق

خیالی در اندیشه دارد نمود
همان غیب غیبست بزم شهود

نشانهای راز خیال خودیم
نواهای ساز خیال خودیم

خوشت باد غالب بساز آمدن
نواسنج قانون راز آمدن

به گیتی مگر حرف دیگر نماند
و یا خود ترا هوش در سر نماند

که چون سینه کمتر دهد بانگ خون
به نشتر کشائی رگ ارغنون

چه زان راز پنهان نوا بر کشی
که چون باز پرسند، دم در کشی

بگفتار اندیشه برهم مزن
در اندیشه دل خون کن و دم مزن

ندانی ؟ که دانش بگفتار نیست
درین پرده آواز را بار نیست

ندانی که مینا شکستن بسنگ
نه بخشد بدل ذوق گلبانگ چنگ

تصوف نزیبد سخن پیشه را
سخن پیشه رند کژ اندیشه را

نشان مند این روشنائی نه‌ای
غزل خوان و میخور، سنائی نه‌ای

غزل گر نباشد نوائی دگر
سر دل سلامت هوائی دگر

اگر مجلس آرای را عود نیست
بر آتش فگندن نمک سود نیست

غزل گر ملال آرد افسانه گوی
کهن داستان هاے شاهانه گوی

من آن خواهم ای لاابالی[1] خرام
کزین پویه خوشتر سگالی خرام

ز شاهان سخن گر گهر سفتنست
سخن گفتن از حق جگر سفتنست

۱- طبع دوم نول کشور میں ''لاوبالی'' ہے -

ننالی ز غم گر جگر سفته شد
سخنهای حق بین که چون گفته شد

خود این نامه فهرست راز حقست
درون و برونش طراز حقست

ز انگیز معنی و پرداز حرف
بهنگامه بستی طلسمی شگرف

سخن چو ز همدم به پیغاره نیست
مرا از پزیرفتنش چاره نیست

بزهدم ثنا گوی نابوده کس
بوالائیٔ جاه نستوده کس

نه زر گفت کانم ته خاک نیست
سخن در سخن میرود باک نیست

سخن را خود آنگونه دانم سرود
کزین نیز خوشتر توانم سرود

ولی تاب در خود نیابم کنون
صریر قلم بر نتابم کنون

دریغا که در ورزش گفتگوی
به پیری خودآرائی آورد روی

ببرنائیم روی پیری سیاه
ز مو بود بر فرق مشکین کلاه

کنون نیست ظل همایم بسر
به پیری فتاد این هوایم بسر

سیاهی ز موی سرم زود رفت
مگر کاتش افسرد کاین دود رفت

شبابم که تاب و تبی بوده است
ز شبهای جوزا شبی بوده است

بدا[1] ، من ؟ که دارم شهاری دراز
شبی کوته و روزگاری دراز

نبود ارچه لبهای خندان مرا
ولی در دهن بود دندان مرا

که هرگه بهنگامه غم خوردمی
ز مردم نهان در دل افشردمی

چه گریم که لبهای خندان کجا
جگر خایم از غصه دندان کجا

به بی‌برگیم ، گلفشان بودنست
بدم سردی آتش زبان بودنست

دریغ از ترقیٔ معکوس من
که باشد سر من ، به پابوس من

فلک بسکه ناچیز خواهد مرا
ببالاند اما بکاهد مرا

ز سر باد پندار بیرون شده
سهی سرو من بید مجنون شده

بود قد خم گشته چوگان من
سرم گوی و اندیشه میدان من

چه غم گر فلک رنگم از روی برد
توانم ز خود در سخن گوی برد

ننالم ز پیری جوانم برای
هنوزم بود طبع ، زور آزمای

۱- بدا : بمعنی بسیار بد - ۱۲ (ابر گہر بار)

سخن سنج معنی ترازم هنوز
بشیوائی شیوه نازم هنوز

هنوزم جگر موج خون میزند
ز دل نیش غم سر برون میزند

ز چشمم همان خون بداماں چکد
به تن نبود اما ز مژگان چکد

ز حرفی که اندر ضمیر آیدم
هنوز از دهن بوی شیر آیدم

بهر بزله کز لب فشانم چو قند
خضر "درٌ من قال" گوید بلند

بدستان زنی خامه منقار من
هدر خون مرغ گل از خار من

توانم که در کارگاه هنر
به نیروی یزدان پیروز گر

ز هم بگسلم باستانی تراز
سخن را دهم جاودانی تراز

سریری ترازم که در سایه اش
بود بالش قدسیان پایه اش

نهالی نشانم که در پای او
مه و زهره ریزد ز بالای او

رهی پیش گیرم کز اقبال من
دود خضر بیخود به دنبال من

نفس را کنم با دعائی گرو
که باشد مر آن را اثر پیش رو

مثالی نویسم که پیغمبران
نویسند ''لاریب فیه'' بران

زبان تازه سازم به نیروی بخت
به ذکر شهنشاه بی‌تاج و تخت

گزشت آنکه دستانسرای کهن
ز کیخسرو و رستم آرد سخن

منم کم بود در تراز کلام
شهنشه پیمبر سپهبد امام

ز فردوسیم نکته انگیزتر
ز مرغ سحر خوان، سحرخیز تر

فرو مردن شمع ساسانیان
بود صبح اقبال ایمانیان

رقم سنج منشور یزدانیم
ز ایمانیان گویم ایمانیم

کسی را که نازد به بیگانگان
خرد ور شمارد ز دیوانگان

به اقبال ایمان و نیروی دین
سخن رانم از سیدالمرسلین

درین ره بسیچ سفرها بسیست
بود راست لیکن خطرها بسیست

ز پا لغزها کاندرین ره بود
بود ره دراز، ارچه[1] کوته بود

بمستی توان نغز گفتار بود
مرا باید از خویش هشیار بود

۱- نول کشور کے نسخوں میں غلطی سے ''ازچه'' لکھا گیا ہے۔

سخن گفتن و پاس ره داشتن
سخن را ز سستی نگهداشتن
یکی در شبستان بشبهای دی
هم آتش نهد پیش و هم مرغ و می

یکی را بعشرتگه شهریار
ز می بوی مشک آید اندر بهار
مرا بین که دی ماه و اردی بهشت
نیاید بجز دانهٔ سبحه کشت

به بزمی که در وی بود اجتناب
ز رود و سرود و شراب و کباب
سخنور چه گفتار پیش آورد
کزان رنگ بر روی خویش آورد

نماند بشاهان دیهیم جوی
شهار شهنشاه درویش خوی
درین بزم اوباش را بار نیست
می و ساغر و زخمه و تار نیست

نه من بلکه این جا برامشگری
اگر زهره آید شود مشتری
اگر جای دستانسرائی بدی
ره و رسم و جادو نوائی بدی

زبان را برامش گرو کردمی
دمی جنبش زخمه نو کردمی
همم زخمه از دیگران تیز تر
همم ساز دانش نواخیز تر

به آزادگی خسروی می‌کنم
بدین پشت دولت قوی می‌کنم

نباشد اگر پای دین درمیان
نهم هفت خوان بلکه هفتاد خوان

پرم از تو برتر ببال گزاف
تو سیمرغ آری و من کوه قاف

تو سوسن فرستی به خنیاگری
مرا جنبش کلک رقص پری

تو کان باده‌های گوارا زنی
دم از نقل و می آشکارا زنی

من و جام بی‌باده در خون زدن
به‌لب تشنگی جوش جیحون زدن

ترا زانکه این طرز و هنجار نیست
مرا با تو دعوی بگفتار نیست

ببین تاچه نازان به‌خویش از منست
کسی کان پس از تست وپیش از منست

بنامش گر از صاف می قرعه ایست
مرا نیز فرمان ته جرعه ایست

یکی صاف آب طربناک خورد
یکی خود به ته جرعگی پاک خورد

ز سرجوش نوشان چه گوئی خموش
به تهه جرعه خوران رها کن خروش

بنوشیدن ارصاف می خوشترست
ولی دُرد را مستیٔ دیگر ست

دگر غالب ای عہد و رای تو سست
به پیمان دانش وفای تو سست
حدیث می و شیشه و جام چیست؟
چه گوئی و این شیوه را نام چیست؟
نه گفتی که بیزار گشتم ز می؟
بریدم ز بزم و گزشتم ز می؟
ز دیوانگی تا کی؟ ای شور بخت!
منہ در گزرگاه سیلاب رخت!
به رفتار ناخوش مشو تیز گرد
درین ره بشوخی مینگیز گرد!
به‌مستی درین راه دستان[1] مزن!
میاشوب و هوی چو مستان مزن!
ادب ورز، دین جوی و آئین گزین
به فن سخن شیوهٔ دین گزین!
به راهی کنی پویه کز پای تو
درخشد چو خرشید سیمای تو
به کاری زدی دست کز ساز تو
دم جبرئیل ست همراز تو
چو کشتی نشینان دریا نورد
به سیر از رهت بر مخیزاد گرد
ترا بخت درکار یاری دهاد!
به پیوند دین استواری دهاد![2]

۱- دستان: بدال مفتوح بمعنی آواز خوش - ۱۲ (ابر گہر بار)
۲- دیوان طبع دهلی اور کلیات طبع اول میں "فواتح" کا آغاز ہے- ہم چند مثنویوں کا اضافہ کر رہے ہیں- پھر فواتح لکھیں گے-

۳

مثنوی کلمات طیبات[1]

هله هانؑ اے دقیقه اندیشان
حق پرستان و معدلت کیشان

تر زبانان وصف جہد و جہاد
راز دانان دین و دانش و داد

شاهی ما بدهر حادث نیست
نو بر نخلهٔ حوادث نیست

یافت هر کس که جست عنوانش
منتہی تا بہ یافث آغلانش

زان نشانگاه تا صفی الله
بود هر دیده ور نبی الله

شد به نیروی این دلیل درست
که نیاگان ما ز روز نخست

یا گرامی پیمبران بودند
یا گرانمایه سروران بودند

زان سپس روزگار های دراز
در سراپرده های عزت و ناز

بود هر کس بکشور آرائی
تا بچنگیز خان مسیحائی

۱- مرزا غالب کی یه مثنوی در حقیقت بہادر شاہ ظفر کی طرف سے ہے۔ دیکھیے میرا مضمون ''مرزا غالب کی مثنوی بے نام کا نام'' طبع نگار رام پور فروری ۱۹۶۳ء -
دیوان کی طرح کلیات ، سبد چین ، باغ دودر تینوں میں اسے شریک اشاعت نہیں کیا گیا ، متفرقات غالب میں جناب مسعود حسن نے شریک کیا تھا۔ ہم اصل مآخذ اور متفرقات کے مقابلہ و تصحیح سے چھاپ رہے ہیں -

چون قراچار دم زد از اسلام
بنگه قوم یافت ساه تمام
بعد ازان تا بما که بوظفریم
همه فرمان دهان داد گریم

هیچ کس دم ز اعتزال نه زد
گام بر مسلک خیال نه زد
دشمن جوهر نگاه نه ایم
منکر رویت الله نه ایم
رسم ما نیست ناسزا گفتن
کار ما نیست جز ثنا گفتن
خانه‌زاد رسول ص و آل ویم
دشمن خصم بد سگال ویم
خانه زاد نبی و آل نبی
نکند باصحابه بی ادبی
زانکه اینان امین و داد گراند
با نبی هم نشین و هم‌سفراند
کیش بیگانگی رها کرده
بر نبی مال و جان فدا کرده
بولای نبی و عترت او
یافته ملک دین بدولت او
بدسگال صحابه بی دین است
در خور صد هزار نفرین است
کار اصحاب بین و بد مشمر
حال ایشان چه حال خود مشمر

گر ترا صرفهٔ نکو کاریست
حبّ ایشان طراز دینداریست

فکر بغض صحابه سودائیست
خاطر کفر را سویدائیست

رفض ماخولیای خام آرد
صید دیوانگی بدام آرد

با تو گویم اگر یقین داری
کاں بزرگاں ز روی دینداری

خیر خواه رسول و آل ویند
عاشق جلوهٔ جمال ویند

دوستان را شمردهٔ دشمن ؟
در خور سرزنش توی یا من[۱]؟

انچه اندیشهٔ نهانیٔ تست
همه از روی بدگمانیٔ تست

کار دیں مشکل است ، آسان نیست
بدگمانی طریق ایمان نیست

پیش ازین آنچنانکه ما گفتیم
حرفی از راز برملا گفتیم

تاج و تیغ و نگین خود از ما بود
دولت ملک و دیں خود از ما بود

آں نیرزد بغصه گر ایں ماند
ملک اگر رفت گو برو دین ماند

۱- اصل مثنوی ''شیعیان علی در رد مثنوی جعلی'' دہلی ص ۱۶ ''با من'' ہے لیکن صحیح ''یا من'' ہے جیسا کہ متفرقات غالب میں درج ہے۔

اندریں روزگار گر شب و روز
ما نداریم طالع فیروز

حاصل ماست باهمه خم و پیچ
گوشه و توشه و دیگر هیچ

بے شکوهی[1] و ظلمت الدینی[2]
بست بر من غلط بد آئینی

کان غلط بسکه بر زبانها رفت
تا اوده زاں غلط نشانها رفت

دیده باشد که شهریار نیم
کار فرمای بند و دار نیم

شاهی من بجز ریاست نیست
بهر من پایهٔ سیاست نیست

لاجرم رفت و هرچه خواست سرود
ناروا گفت خود ، نه راست سرود

بر چنین کس هزار نفرین باد!
لعنت از حق ، ز خلق آمین باد!

اینکه توقیع من نوشت بجعل
خاطرم راست اندر آتش نعل

حاش لله که پنجهٔ سیمین
سترد نقش داد و دانش و دین

پنجهٔ را که ساخت خود به ستیز
چوں تواند شمرد دست آویز

۱- مرزا حیدر شکوه قضیهٔ علم کے ذمه دار -

۲- مرزا نورالدین ، حیدر شکوه کے ساتھ اس هنگامے کے نشانهٔ اول مراد هیں -

راه حق را بحرف نتوان بست
خود ز وا گویه طرف نتوان بست

آں یکی گر خدا نداشت خبر
مر نبی را شمرد جادوگر

چون نگردد رها رسول خدا
من لسان[۱] الوری فکیف انا

گرچه بر من بزور نتوان بست
تهمتی را که مرد نادان بست

لیک بدنام کرد و داد اینست
که ز خون ریختن زیاد اینست

نخورم خون دل ز خشم چرا
که رود بر من این دروغ و مرا

نیست یارا دریں گذرگه تنگ
که بگویم من و رود سرهنگ

تا زبان از قفا برون کشدش
چون بمیرد بخاک و خون کشدش

یا بگیرند و خوار و زار کنند
واژگون بر خرش سوار کنند

روسیه گرد شهر گردانند
گر نگردد بقهر گردانند

۱- جب دنیا والوں کی زبان درازی سے آنحضرت محفوظ نہ رہ سکے تو میرا شمار کس میں ہے۔

ور تو گوئی مجال و یارا نیست
حاکمان راست گرچه مارا نیست

دهر را حاکمان دادگرند
که ز هرکس به داد بیشترند

هر که بد کرد کیفر آن بد هست
قتل گر نیست بند و زندان هست

لاجرم من که بادشاه هستم
پیش دادار داد خواه هستم

علت جعل کم گناهی نیست
بهر مجرم گریز گاهی نیست

جعل سازی و فتنه پردازی
جرم دانی و نشمری بازی

رای حکام دهر تا چه بود
این چنین جرم را سزا چه بود

گر جفا پیشه را نیازردم
به امینان ملک بسپردم

بو ظفر! ملک و دین خدا داد است
داد خواهیم و کار با داد است

نامه را ختم کن که پایان یافت
مدعا صورت نمایان یافت

علما را ز خود دعا بفرست
وین نمودار جا بجا بفرست

ترجمہ[1] مثنوی

دعاے صباح

ای خدا ! ای داورا ! کو بر کشاد
از درخشیدن زبان بامداد

بارهای تار شب را آفرید
پرده‌های تار ظلمت در کشید

کرد صنع چرخ گردان استوار
در مقادیر تزین آشکار

ای خداوندی! که تاب آفتاب
کرد یکجا بافروغ التهاب

چهرۀ مهر درخشان بر فروخت
با همه تابش در آتش رخت سوخت

در جهان هستیش هم جنس کیست؟
هیچ مخلوقی بدو هم جنس نیست؟

ای که ذاتش را به ذاتش رهبری
گشت از هم جنسی عالم بری

برتر از کیفیت آمد گوهرش
کیفیتها نیستی گیرد برش

۱- یہ منظوم ترجمہ مرزا عباس بیگ کی فرمائش سے مرزا غالب نے لکھا اور ۱۸۶۷ء کے قریب نول کشور پریس سے مع متن و ترجمہ فارسی چھپا - اس کا ایک نسخہ حقیر کی ملکیت ہے - اس کے بعد یہ ترجمہ اصل دعا کے ساتھ لکھنئو سے متعدد مرتبہ چھپا لیکن ابھی تک کسی مجموعۂ غالب میں شریک اشاعت نہیں ہو سکا تھا -

ایکه نزدیکی بخطرات ظنون
دور تر هستی ز دیدار عیون
یعنی از دیده شدن ذاتش بری ست
هرکرانه از جهات پیکری ست

گوهر او از پس و پیش ست بیش
کرد هستی را محاط علم خویش
هرچه در عالم به هستی رو نمود
پیش از هستی بعلم او کشود

ای که در گهوارهٔ امن و امان
خواب را در چشم من کردی نهان
باز چشم من به بیداری کشاد
سوی احسان و عطای کو بداد

دست او بربست دست هر زیان
قدرت او از بدی دادم امان
بر فرست ای داور هستی درود
بر کسی کو سوی تو راهم نمود

در شب تاریک تر شد رهنما
سوی درگاه تو ای گیتی خدا !
از سبب های تو ای رب الامین!
از شرف گیرندهٔ حبل الوتین

آن فروزان گوهری نیره نژاد
آنکه بر دوش بلندی پا نهاد
آنکه آمد در نخستین روزگار
پای او بر جای لغزان استوار

نیز بر آلش که از بس طاهراند
پاک دین و برگزیده ظاهراند

نیک کرداران و یزدان برگزین
برگزیده گوهران پاک دین

ای خدا! بکشا مصاریع الصباح
از برای ما بمفتاح الفلاح

یعنی ای دادار گیتی ، دادگر
بر کشا بر ما تو درهای سحر

از کاید لطف در ها باز کن
بهر ما سامان رحمت ساز کن

بهترین پیرایهٔ رشد و سداد
در برم پوشان تو ای رب العباد

بر نشان در من ینابیع الخشوع
از روانم کن روان عین الخضوع

پیشگاه عظمتم ای بی‌نیاز
کن روان از چشم من آب نیاز

دایم از بیم خودت ، ای کردگار !
اشکها از گوشهٔ چشمم بیار

سبکی نادانیم تادیب کن
از شکیبای مرا تهذیب کن

گر نباشد از تو آغاز کرم
ور نه توفیق تو باشد رهبرم

کس نیارد بردن من سوی تو
در کشاده تر رهی در کوی تو

گر مرا حلم تو بسپارد به آز
برکشد زنجیرهٔ حرصم دراز

کس نیامرزد گناهم ، ای خدا!
سرنگون افتادن من در هوا

نصرت تو گر مرا ناید معین
گاه جنگ نفس و شیطان لعین

آن چنین خذلان بحرمانم کشد
در همه رنج و تعب جانم کشد

خود ترا می‌بینم ای هستی خدا
کامدم سویت بامید و رجا

دست پیوستم باطراف الحبال
چون گنه افگند دورم از وصال

چون بدوری در شدم از بارگاه
زانکه چیره شد بمن دست گناه

زشت مرکوبی که نفس من بران
از هوا و حرص شد دایم روان

واه از تسویل نفس ذوفنون
کان بود از آرزوهای و ظنون

آه ، زان خواهش کز و برخاسته
آرزوها آردش آراسته

هر زمان گامی بهر سویش برد
فرش خواهش‌ها بهر سو گسترد

بر درازیها کشد طول امل
تا به دوری افتد از حسن عمل

نیست نادان نفس فرمان ناپذیر
کو بود پیش خداوندش دلیر

جرأت و گستاخی و عصیان کند
سرکشی از طاعت یزدان کند

ای خداوندا ! من از دست رجا
کوفتم دروازۀ رحم ترا

سوی تو بگر یختم با اضطرار
از وفور خواهش نا استوار

در رسن های تو ای گیتی خدا
باز پیوستم سر انگشت ولا

در گذار از من تو ای رب الوریٰ
هرچه کردم از گناه و از خطا

لغزشی کز من بیاید آشکار
در گزار از من تو ای پروردگار!

عفو کن ، افتادن من در بلا
باز و از هرچه زاید زان عنا

زین که هستی سرور و معبود من
غایت هر خواهش و مقصود من

در زمان هر کجا گردیدنم
نیز در هنگام آرامیدنم

خود چسان میرانی ای پروردگار
بی نوائی ، کامدت با اضطرار

یعنی آن مسکین که آوردست رو
با همه صد ناشکیبی سوی تو

از گناه خود گریزان آمده
در خطای خود پشیمان آمده

ره پژوهی را که خواهد راه تو
قصد او باشد همه درگاه تو

سوی درگاه تو باشد تیزگام
میکنی دورش چرا از راه کام

تشنهٔ را باز می‌داری چرا؟
آنکه سوی حوض تو شد ره‌گرا

آب جویان آمده بر چشمه‌سار
تا لب‌خود تر کند زان آبشار

زینهار! این حوض تو از پر ملال
پر بود هنگام قحط و خشک سال

باب تو مفتوح باشد جاودان
بر رخ خواننده و ناخواندگان

طالبان و هم طفیلی آشکار
بر در بکشاده ات یابند یار

هر که میخوانیش می‌آید بزود
وانکه ناخوانیش نیز آید فرود

این درت بر روی کس بربسته نیست
خوانده و ناخوانده بود اینجا یکیست

از کمال جود تست این فتح باب
تا همه گردند از تو بهره یاب

بخشش خود را تو زنجیر دراز
بر کشیدی ای خدای بی‌نیاز!

خود نمی بندی درت بر روی ، بس
جز به رحمت می نه بینی سوی کس

لطف تو عامست هرگز نیست خاص
دور تر رفته ازین در اختصاص

بسته نبود بر رخ کس باب تو
هر کسی رخشان بود از تاب تو

ابر تو ریزد بهر دامن گهر
هر کسی را فیض تو آید ز در

ممسکی و بخل در تو یافت نیست
آنکه در هستی بود ، بے بهره کیست

غایت مامول و مسئولم توئی
آخر مقصود و مامولم توئی

این زمام نفس خود رای خدا
کردہام بربستهٔ بند رضا

مرکب نفسم که ازبس سرکش است
هرزمان سر بر فلک چون آتش است

بارضایت کرده ام فرمان پذیر
تا بود در مجلس فرمان اسیر

هرچه ریزندش همه گیرد بسر
سر نه تابد از قضا و از قدر

هرچه پیش آیدش گیرنده شود (کذا)
هرچه بدهندش پزیرنده شود

گر همه تلخی پزیرندش بکام
در کشد یکسر چنان کز شهد جام

خواهش خود را نماید بی‌نشان
خواهش تو پیش گیرد جاودان
از گناهم بود بس بار گران
رافت و رحم تو کردش بے نشان

بے نشانش کردم از الطاف تو
ساختم معدومش از اعطاف تو
وین هوای نفس من گمراه کن
از طریق راستی بی‌راه کن

سوی لطف و رافتت بسپردمش
سوی غفاری و عفوت بردمش
ای خدا ! برمن بیار این بامداد
با فروغ راستگاری و رشاد

وین سحر را کن تو ای پروردگار
از برای دین و دنیا پاسدار
کن تو این شام مرا برمن سپر
از مکائدهای اعدا پر شرر

ده نجاتم از هوای نفس بد
زانکه هستی قادری بر نیک و بد
هرچه خواهی می کنی تو هر زمان
ای توانا تر ، خدای مهربان !

هر کرا خواهی تو ملکی میدهی
تاج شاهی برسرش هم می نهی
می ستانی باز ملک و مال را
انچه خواهی میکنی اموال را

هر کرا خواهی تو عزت میدهی
هر کرا خواهی تو ذلت میدهی

ای خدا ! از دست خیر خود توئی
قادری بر جمله اشیا بس توئی

روز را در شب تو پنهان میکنی
هم توئی شب را بروزی آوری

زنده از مرده هویدا میکنی
مرده را از زنده پیدا میکنی

هر کرا خواهی تو روزی میدهی
بیش از اندازه مقدارش دهی

هرچه خواهد عفو تو خود آن کند
چارهٔ آن جرم وان عصیان کند

بر زداید هرچه کردم از گناه
بر کرانم آرد از کار تباه

لطف تو نگذاردم در بند آز
تا نمانم بستهٔ بند نیاز

جز تو معبودی نشد هستی گرا
بهر تو آریم تسبیح و ثنا

مر ترا دایم ستایش گستریم
در ستایش ها نیایش آوریم

کیست آن ، کو داندت حکم و توان
بس نیابد بیم تو او را بجان

کیست آن ،کو انچه هستی داندت
پس ز تو ناترسد و ناخواندت

از توان تست تالیف‌الفرق
باشد از رحم تو یفلق الفلق

فرقه های مختلف یکجا کنی
صبح را از تار شب پیدا کنی

تار شب را ساختی رخشنده رخت
آب را کردی روان از سنگ سخت

آب را کردی دوگونه آشکار
یک بود شور و دگر شیرین گوار

از فشارنده که آن باشد سحاب
خود فرود آوردهٔ ریزنده آب

ساختی خورشید و مه را آشکار
در جهان مثل چراغ نور بار

بی ازان کز احتمال رنج و درد
ماندگی آید ترا از کار کرد

ای یگانه باهمه عز و بقا!
بندگان را پست کردی از فنا

ای خدای پاک و ای رب ودود!
از فرازین بر فرود آور درود

بر محمد مصطفیٰ ص و آل او
آن گزیده گوهران پاک خو

بشنو آوازم، پزیرا کن دعا
دشمنانم را گزین بهر فنا

از کرم امید من کن استوار
ایکه خوانندت پی کشف ضرار

ای بعسر و یسر ماسول همه
وی ز تو انجاح مسئول همه

حاجت خود پیش تو آورده ام
ناگزیری بر تو عرضه کرده ام

پس بناکامی نگردانم ز جود
از گزیده بخشش خود ای ودود !

ای دهشور ! ای دهشور ! مہربان
مہربان تر از همه رحمت کنان

ترجمه دعای امام زین العابدین جو حضرت بعد اس دعا کے پڑھتے تھے

یا الٰہی! قلب من محجوب و تنگ
عقل من مغلوب و نفس من بتنگ

حرص من بودست بر من چیره دست
کثرت عصیان و طاعت اندک ست

معترف آمد زبانم در ذنوب
چیست تدبیر من علام الغیوب

ای گنه آمرز و ستار العیوب!
عفو کن از من ببخشایم ذنوب

ای بهنگام عقوبت سخت گیر!
وی بحلم و مغفرت پوزش پزیر

حاجت من بهر قرآن کن روا
وز برائے حضرت خیرالوریٰ

ای خدا ! از آسمان آور فرود
بر نبی و آل اطهارش درود[1]

۳

مثنوی مسند نشینی نواب محمد علی خان

درین سال نوّاب عالی جناب
بروی زمین غیرت آفتاب
محمد علی خان فرخنده خوی
که هم نامدار است و هم نام جوی
چو بنشست بر مسند سروری
ازو سروری یافت آن برتری
که از سروری یافت شاهی رواج
کلاه مهی گشت همسر به تاج
زهی شهرت این همایون جلوس
که آوازه آفتاد در روم و روس
ز غالب که از روزگار[2] دراز
برین عتبه ساید جبین نیاز
به نظارهٔ حسن اقبال جشن
سخن رفت دربارهٔ سال جشن

۱- نسخهٔ اول بہت خوشخط جلی قلم سے لکھا ہوا ہے - پہلے متن ایک ایک سطر عربی پھر ترجمہ فارسی نثر ، اس کے بعد غالب کا منظومہ ہے -
۲- سبد چین میں ہے " روزگاری دراز " باغ دودر" مطابق متن -

پس از شکر دادار جان آفرین
چنین گفت پیر[۱] قناعت گزین
که چون اختر نیک آمد به فال
هم از اختر نیک پیداست سال

۱۲۸۱ھ

۱- سبد چین" پیر قناعت " باغ دودر "پیری قناعت -"
یہ مثنوی سبد چین اور باغ دودر میں ھے - میں نے سبد چین کو اصل قرار دیا ھے -

فاتحه ۱

بہر ترویح ۲ جناب والی یوم الحساب
ضامن تعمیر شار ستان دلہای خراب

جرم ۳ بخشای که گر جوشد بہار رحمتش
برفنائی خویش لرزد ، چون دل مجرم عذاب

رافتش اعدائے اورا ، در شمار سال عمر
نعل وازون بندد از ناخن بر انگشت حساب

نوح ع عمری ماند طوفانی به بحر سطوتش
تا سرو زانو به سوحی باخت مانند حباب

۱- دیوان فارسی طبع اول دهلی کے صفحه ۹۴ کی سطر ۶ سے یه قطعه شروع هوتا هے ، کلیات فارسی طبع اول لکھنو مین بلا اختلاف ۵۴ شعر هیں ، لیکن بھوپال سے شائع شده اردو دیوان کے صفحه ۲۸۹ پر " قصائد " کے ذیل مین اس "فاتحهٔ فارسی " کے ساٹھ شعر هیں جن میں پندره شعر نئے اور باقی شعر مطبوعه کلیات سے اهم اختلاف رکھتے هیں -

نسخهٔ حمیدیه ۱۲۳۷ھ کا مخطوط هے اس لیے فارسی کا یه قطعه غالب کے قدیم ترین فارسی کلام کا نمونه سمجھنا چاهئیے -

میں نے متن کو دیوان طبع اول دهلی کے مطابق قرار دےکر، حاشیے میں اختلافات نقل کر دیے هیں -

۲- نسخهٔ حمدیه مطبوعه میں ترویح ، کو ترویج لکھا گیا هے ، جو غلط هے ، دوسرے مصرع میں " تعمیر شارستان " کے بجائے "تعمیر قصرستان " هے -

۳- نسخهٔ حمیدیه اور دیوان طبع دهلی کے " جرم بخشائی " کو کلیات طبع اول لکھنو میں "جرم امرزی " بنا دیا گیا هے اور اس نے رواج پایا -

سایه اش جز در حریم قدس نتوان یافتن
کز شکست رنگ امکان عصمتش دارد نقاب

نغمه چون خون در رگ ابریشم ساز افسرد
هیبت نهیش اگر ریزد۱ نهیب احتساب

بارگاهش را خورشید است خشت آستان
شمع بزمش را است گلگیر از دولخت ماهتاب۲

بهر ترویج جنابی ، کز نهیب۳ عصمتش
صیقل آئینه بر نور نظر ریزد حجاب

آستانش بر نشان گاه جلالی کز ادب
حلقهٔ بیرون در گردیده چشم آفتاب۴

بهر ترویج امام۵ رهنمای انس و جان
عابد الله ، و معبود و خلائق ، بو تراب

۱- نسخهٔ حمیدیه — "اگر جوشد نهیب"

۲- نسخهٔ حمیدیه میں ایک شعر زائد ہے :
هم چمن زار ازل را قدرتش رنگ آفرین
هم گلستان ابد را خوئی جان بخشش سحاب

۳- نسخهٔ حمیدیه : "جنابی اقدسی کز حکم او"

۴- نسخهٔ حمیدیه میں اس کے بعد یه شعر بھی ہے :
در پناه عفتش حوران جنت را هنوز
پنبهٔ روزن بود چشم سفید ماهتاب

۵- نسخهٔ حمیدیه کا مصرعه یوں ہے :
"بهر ترویج خدای از دو عالم رستگان"

دلدل برق آفرینش را رمی کا ندر خیال
می جهد همچون نگاه از حلقهٔ ۱ چشم رکاب
ذوالفقارش ۲ شاهدی کا ندر تماشا گاه قتل
می کشد در شوق او از موج الف بر سینه آب
در خیال صدمهء جاندادگان ضربتش
می جهد از دیدهٔ عیسی چراغ آفتاب
بهر ترویج ۳ حسنء فرمان ده اقلیم دین
خسرو عرش آستان ، شاهنشه جنت مآب
توسن قدرش که سطح عرش ۴ جولانگاه اوست
از خم زانوی جبریل امین دارد رکاب

---

۱ - نسخهٔ حمیدیه میں ایک شعر یه بهی ہے-
بسکه شد ویران شوخی خانهٔ نظاره اش
عینک پیر فلک گردیده ماه و آفتاب

۲ - نسخهٔ حمیدیه کی ترتیب میں ''بهر ترویج خدای از دو عالم رستگان،، اور ذوالفقارش،، کے درمیان تین شعر یه هیں :
مهربان پیری که بهر دیدن ماه صیام
در کف مستان تیغی است از موج شراب
باده خمخانهٔ او پرتو نور جمال
پنبهٔ مینای او چشم سفید ماهتاب
شهسوار قدرتی کز فرط تعظیم جلال
سرمه در چشم رکابش می کشد گرد کتاب

۳ - نسخهٔ حمیدیه— ''قدرت مآب،،— تین شعر دیوان فارسی میں شریک اشاعت نہیں هیں :
ناظم حسن آفرینی ، کز برائے خدمتش
از شفق بندد حنا ، بر شام دست آفتاب
جلوه ریز آید اگر لطفش بهنگام غضب
دود آتش می شود باران رحمت را سحاب
بشکنند شان تغافل گربه دلداری ناز
لذت قند محبت جوشد از زهر عتاب

۴ - نسخه میدیه— ''که عرش و خلد جولانگاه اوست،،—

بہر ترویح شفیع یک جہان عاصی ، حسینؑ
آنکه[1] مینو راست از گرد قدم گاهش سحاب

در گہش را مخمل خواب زلیخا فرش راه
خیمه هایش را نگاه ماه کنعانی طناب

عاشق[2] الله و معشوق وفادار رسولؐ
قبلۂ عشق و پناه حسن و جان بوترابؑ

بہر ترویح امام ابن امام ابن امام
آدم[3] آل عبا ، شاهنشه عالی جناب

لاله را همرنگی چشم بخون آلوده اش
می زند بر فرق از داغ غلامی انتخاب

---

۱ - نسخۂ حمیدیه میں اس مصرع کی صورت یه تھی :
آنکه جنت راست از اشک عزا داریش آب
دو مزید شعر یه هیں :
بادشاهی ' صابری ' دریا دلی ' تشنه لبی
کز غمش ' از لعل خون بارست چشم آفتاب
شاه غیرت آفرینی کز پئے تعلیم صبر
بخیۂ نقش قدم زد بر لب موج سراب
۲ - نسخه حمیدیه میں "در گہش" بعد میں اور "عاشق الله" پہلے ھے -
۳ - جناب امام زین العابدین ' حضرت علی بن حسین علیه السلام مراد هیں - نسخه حمیدیه میں اس کے بعد ھے :
آستانش عالی و منزل گه قدرش رفیع
بارگاهش عرش سامان و جنابش مستطاب

بهر ترویج محیط فیض ، باقر[ع] ، کز شرف
در هوای آستان بوسیش می بالد ثواب

بهر ترویج علی جعفر صادق[ع] که اوست
وارث علم رسول و خازن سر کتاب

تکیه[۲] جز بر قول او کردن ، خطا باشد خطا
راه جز برجاده اش رفتن ، عذاب آمد عذاب

بهر ترویج[۱] شه کاظم[ع] که در هر عالم ست
چون قضا حکمش روان و چون قدر رایش صواب

بهر[۳] ترویج رضا[ع] ، کز بهر تعمیر جهان
گشته معمار کرم را جادهٔ راهش طناب

بهر ترویج تقی[ع] کاندر تماشا گاه اوست
طاق ایوان آسمان ، مرآت روش آفتاب

بهر ترویج نقی[ع] ، کز بهر تقریب نیاز
هدیه آور دست نرگس دان ببزمش ماهتاب

---

۱ - امام پنجم حضرت امام محمد باقر علیہ‌السلام کے بعد حضرت امام ششم کا نام لینا تھا - نسخۂ حمیدیہ میں ''بہر ترویج محمد جعفر صدق آفرین'' اور فارسی مطبوعہ دیوان و کلیات میں ''علی جعفر'' ہے لیکن حضرت کا اسم گرامی ''جعفرع بن محمدع'' ہے۔

۲ - نسخہ حمیدیہ ندارد -

۳ - نسخہ حمیدیہ میں ہے -

بہر ترویج رضاع ، شاہ خراسان کز کرم
بہر تعمیر جہان ، از کہکشان دارد طناب

۴ - نسخۂ حمیدیہ : ''آئینۂ او آفتاب''—

بہر ترویج حسنؑ[۱] آن آفرینش را پناہ
کز ترفع آستانش عرش را باشد جواب

زین[۲] سپس بہر ظہور مہدیؑ صاحب زمان
ظلمتستان شب کفر و حسد را آفتاب

قول[۳] و فعلش بے سخن، کردار و گفتار نبیؐ
رسم و راہش بے تکلف رسم و راہ بوتراب

جُندا[۴]، معمار گیتی کز پئے تعمیر دین
در کف از سر رشتۂ شرع نبی دارد طناب

تابجوید خویش را زائینۂ رخسار او
شاہد دین نبیؐ از چہرہ بر د ارد نقاب

ابر لطفش زآتش دوزخ ببالاید بہشت
برق قہرش ابر رحمت را کند دود کباب

---

۱ - امام حسن عسکری علیہ‌السلام کے لیے پہلے شعر یوں کہا تھا :
بہر ترویج حسنؑ پشت و پناہ خافقین
شاہ کیوان بارگاہ و خسرو جنت مآب

۲ - نسخہ حمیدیہ :
بعد ازین بہر ظہور مہدیؑ صاحب زماں
ظلمت آباد شب کفر و حسد را آفتاب

۳ - نسخۂ حمیدیہ میں یہ شعر نہیں ہے -

۴ - نسخۂ حمیدیہ—''جندا معمار خلقی''—نیز :
می کند از ہم جدا صراف حکم قدرتش
در سیاست گاہ نصفت مس زسیم ماھتاب

بعد ازین بہر شہید انیکه خوش جان داده اند
در شہادت گاه شاه کربلا را در رکاب

سپہا از بہر ترویج علمدار حسین ؑ
پیشوای لشکر شبیر و ابن بوتراب

حضرت[۱] عباس ؑ ، عالی رتبه کز ذوق حضور
زخم بر اجزائی تن پیمود و بر دل فتح باب

یا علی ؑ! دانی که رویم سوی تست از هر نورد
هر چه آغازم مخاطب دانمت در هر خطاب

موی آتش دیده را مانم که بہر خویشتن
حلقهٔ دام فنا گردیده ام از پیچ و تاب

غافل[۱] از رفتار عمر و فارغ از تکمیل عشق
رفته از غفلت در آغوش و داغ دل بخواب

۱- نسخهٔ حمیدیه :
حضرت عباس عالی رتبه کز چوگان او
می رود مانند گوی بی سروپا آفتاب
بعد ازیں تاثیر دل جوی دعای زمره ایست
کز قلق دارند، در دل آتش و در چشم آب
بادشاهان، مومنان، جنت نصیبان، عاشقان
بید لال ، یعنی عزاداراں آل بوتراب
راقم بیچارهٔ پز مرده دل ، یعنی اسد
کز فسرد نہای دل گردیده پابند خلاب
بر زبان مہر خموشی وبه دل جوش جنون
در هوس آباد نادانی اسیر پیچ و تاب

۱- نسخهٔ حمیدیه میں یه شعر ''نقد آگاهی'' کے بعد ہے اور اس طرح :
غافل از رفتار عمر و فارغ از تکمیل عشق
کرده آغوش و داغ دل نشیمنگه خواب

نقد آگاهی ، بوهم فرصتی در باخته
دست خالی برسر و دل[1] در نورد اضطراب
خود تو می دانی که گم گردیدهٔ دشت امید
تشنه تر می گردو از بی آبی موج سراب
دل[2] زکار افتاد و پا از رو و دست از هم شکست
جاده نا پیدا و منزل دور و در رفتن شتاب
فاش نتوان گفت ، یعنی شاهد مقصود من
جز بخلوتگاه اسرار تو نکشاید نقاب
شعلهٔ شوق هوس دارم زکانون خیال
کاتش افسرده را بخشد نوید التهاب
دین و دنیا را بلا گردان نازت کرده ام
جلوهٔ رنگین تر از جنت که باشم کامیاب

۱- نسخهٔ حمیدیه : ''دل پامال اضطراب''
بسکه در صحرای وحشت عقل و دین در باخته
لذت قند محبت جوید از زهر عتاب
۲- نسخهٔ حمیدیه:
دل ز کار افتاد و پاوا ماند و دست از هم شکست
قطع منزل کی تو ان کردن باین حال خراب
مدعا را بر زبان آور دن از بیگانگیست
جز نگاهت شاهد مارا کفن بادا نقاب
ذوق مطلب از تو و من از تو و مطلب زتو
خود توئی بخشی و می فهمی زبان اضطراب
شعلهٔ شوق هوس دارم ز سودائے جنون
کاتش افسرده را بخشد بهار التهاب
دین و دنیا را بلا گردان نازت کرده ام
جلوهٔ رنگین تر از صد گلشن خلد انتخاب
حرمت جان محمد ص، یک نظر کن سوی من
یاعلیع! یا مرتضیع ! یا بوالحسن ! یا بو ترابع!

فاتحه[۱]

بهر ترویج نبی حاکم ادیان و ملل
کار فرمای نبوت ابداً هم ز ازل

بهر ترویج گل روضهٔ عصمت زهرا
آن به تقدیس چو ذات صمدی عزوجل

بهر ترویج علی آن که بنزد جمهور
قبلهٔ آل رسول است و امام اول

بهر ترویج حسن ، چشم و چراغ آفاق
که خیالش دهد آئینهٔ جان را صیقل

بهر ترویج حسین آنکه دو چشم جبریل
از پی سرمهٔ خاک درش آمد مکحل

بهر ترویج امام ابن امام ابن امام
آدم آل عبا ز آدم و عالم افضل

بهر ترویج گل باغ محمد باقر
آن که جان داده مخالف ز نهیبش چو جعل

بهر ترویج بحق ناطق امام صادق
آن که دانای علوم است و توانای عمل

بهر ترویج شه موسیٔ کاظم که بود
جلوهٔ طور به آرایش بزمش مشعل

بهر ترویج رضا ضامن غربت زدگان
خضر را ناصیه بر خاک درش مستعمل

بهر ترویج تقی وز پیٔ ترویج نقی
هر دو در دفتر ایجاد دو فرد اکمل

۱- نول کشور ''قطعه ۶۱ فاتحه'' -

بہر ترویج حسنؑ ، عسکر دین را سالار
قبۂ بارگہش گنبد گردون بمثل
بعد ازین بہر طلوع مہ اوج عرفان
مظہر عدل حقیقی و امام اعدل
حضرت مہدیؑ ہادی کہ وجودش باشد
شان ماضی و گرانمایگی مستقبل
بہر ترویج شہیدان گرامی پایہ
با دل و جان رسولؐ عربی ہم مقتل
سپا ازپی ترویج علمدار حسینؑ
آنکہ در لشکر اسلام بود میر اجل
بہر جمعیت آنانکہ درین انجمن اند
بایقینی بری از ریب و مبرا زخلل
درحق غالب بیچارہ دعای کہ دگر
نکشد درد سر تاب و تب طول امل
شاد شادان بہ نجف بال کشاید کہ شود
گرد آن بادیہ از بہر صداعش صندل
بر رود زین تن خاکی بہ فضای ارواح
فارغ از کشمکش سطوت مریخ و زحل

فاتحہ[۱]

ای فلک! شرم از ستم بر خاندان مصطفیؐ
داشتی زین پیش سر برآستان مصطفیؐ
ای بمہر و ماہ نازان ہیچ میدانی چہ رفت ؟
از تو بر چشم و چراغ دودمان مصطفیؐ

۱- طبع نول کشور ''قطعہ ٦٢ نوحہ'' اور دیوان طبع دہلی ''فاتحہ''۔ صحیح
یہی ہے کہ یہ نوحہ ہے ۔

سایه از سرو روان مصطفیٰ نفتد بخاک
هان ، چه بر خاک افگنی سرور وان مصطفیٰ[ص]

گرمی بازار امکان خود طفیل مصطفیٰ[ص] است
هین ، چه آتش میزنی اندر دکان مصطفیٰ[ص]

کینه خواهی بین که با اولاد امجادش کنی
آنچه بامه کرده ، اعجاز بنان مصطفیٰ[ص]

نیک نبود گر تو بر فرزند دلبندش رود
آنچه رفت از مرتضیٰ[ع] بر دشمنان مصطفیٰ[ص]

یا تو دانی مصطفیٰ[ص] را فارغ از رنج حسین[ع] ؟
یا تو خواهی زین مصیبت امتحان مصطفیٰ[ص]

یا مگر گاهی ندیدی مصطفیٰ[ص] را با حسین[ع]
یا مگر هرگز نه بودی ، در زمان مصطفیٰ[ص]

آن حسین[ع] است این که سودی مصطفیٰ[ص] چشمش برخ
بوسه چون باقی نماندی در دهان مصطفیٰ[ص]

آن حسین[ع] است این که گفتی مصطفیٰ[ص] ''روحی فداک''
چون گزشتی نام پاکش بر زبان مصطفیٰ[ص]

قدسیان را نطق من آورده غالب در سماع
گشته ام در نوحه خوانی مدح خوان مصطفیٰ[ص]

نوحه[۱]

ای کج اندیشه فلک ! حرمت دین بایستی
علم شاه نگون شد ، نه چنین بایستی!

تاچه افتاد که بر نیزه سرش گردانند
عزت شاه شهیدان به ازین بایستی!

۱- طبع نول کشور '' قطعه ۶۳ نوحه ۔''

حیف باشد که فتد خسته ز توسن بر خاک
آنکه جولانگه او عرش برین بایستی!
حیف باشد که ز اعدا دم آبی طلبد
آنکه سائل به درش روح امین بایستی!
تازیان را بهجگر گوشهٔ احمد ؐ، چه نزاع
وطن اصلی این قوم ز چین بایستی!
ایها القوم! تنزل بود ار خود گویم
میهمان بیخطر از خنجر کین بایستی
سخن این است که در راه حسین ابن علی
پویه از روی عقیدت بجبین بایستی
چشم بدور، بهنگام تماشای رخش
رونما سلطنت روی زمین بایستی
داشت ناخواسته در شکر قدومش دادن
اگرش ملک وگر تاج و نگین بایستی
چون بفرمان خود آرای و خودبینی و بغض
آن نگردید که از صدق و یقین بایستی
به[1] اسیران ستمدیده پس از قتل حسین
دل نرم و منش مهر گزین بایستی
چه ستیزم بقضا، ورنه بگویم غالب
علم شاه نگون شد، نه چنین بایستی!

نوحه[2]

وقتست که در پیچ و خم نوحه سرائی
سوزد نفس نوحه گر از تلخ نوائی

۱- طبع نول کشور طبع اول ''بااسیران -''
۲- طبع نول کشور ''قطعه ۶۳ نوحه -''

وقتست که در سینه زنی آل عبا را
سر پنجه حنائی شود و رنگ هوائی
وقتست که جبریل ز بیپایگیٔ درد
غم را ز دل فاطمہؑ خواهد بگدائی

وقتست که آن پردگیان کز ره تعظیم
بر درگه شان کرده فلک ناصیه‌سائی

از خیمهٔ آتش زده عریان بدر آیند
چون شعله دخان بر سر شان کرده روائی
جانها همه فرسودهٔ تشویش اسیری
دلها همه خون گشتهٔ اندوه رهائی
ای چرخ! چو آن شد، دگر از بهر چه کردی
ای خاک! چو این شد، دگر آسوده چرائی

خون گرد و فرو ریز اگر صاحب مهری
برخیز و بخون غلت گر از اهل وفائی
تنهاست حسین ابن علی در صف اعدا
اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی
توقیع شفاعت که پیمبر ز خدا داشت
از خون حسین ابن علی یافت روائی
فریاد! ازان حامل منشور امامت
فریاد! ازان نسخهٔ اسرار خدائی

فریاد! ازان زاری و خونابه فشانی
فریاد! ازان خواری و بی‌برگ و نوائی
فریاد! ز بےچارگی و خسته درونی
فریاد! ز آوارگی و بی سر و پائی

غالب ! جگری خون کن و از دیده فروبار
گر روی شناس غم شاه شهدائی

نوحه[۱]

سرو چمن سروری افتاد ز پا ، های!
شد غرقه بخون پیکر شاه شهدا ، های!

بر خاک ره افتاده تنی هست ، سرش کو؟
آن روی فروزنده و آن زلف دوتا ، های!

عباس دلاور که دران راهروی داشت
شمشیر بیکدست و بیکدست لوا ، های!

آن قاسم گلگون کفن عرصهٔ محشر
وان اکبر خونین تن میدان وغا ، های!

آن اصغر دلخستهٔ پیکان جگر دوز
وان عابد غمدیدهٔ بی‌برگ و نوا ، های!

ای قوت بازوی جگر گوشهٔ زهرا
دست تو بشمشیر شد از شانه جدا ، های!

ای شهره بدامادی و شادی که نداری
کافور و کفن ، بگزرم از عطر و قبا ، های!

ای مظهر انوار که بود اهل نظر را
دیدار تو دیدار شه هر دو سرا ، های!

ای گلبن نورستهٔ گلزار سیادت
نایافته در باغ جهان نشو و نما ، های!

ای منبع آن هشت که آرایش خلد اند
داغم که رسن شد بگلوی تو ردا ، های!

۱- طبع نول کشور ’’قطعه ٦٥ نوحہ۔‘‘

بالغ نظران روش دین نبی حیف!
قدسی گہران حرم شیر خدا ، ہای !
ماتمکدہ آن خیمۂ غارت زدگان ، حیف!
غارت زدہ آن قافلۂ آل عبا ، ہای!
آن تابش خرشید دران گرم روی ، حیف!
وان طعنۂ کفار ، دران شور عزا ، ہای!
غالب! بہ ملائک نتوان گشت ہم آواز
اندازۂ آن کو کہ شوم نوحہ اسرا ، ہای !

۲

نوحہ[۲]

شد صبح بدان شور کہ آفاق بہم زد
مانا کہ ز خون ریز بنی فاطمہ دم زد
تا تلخ شود خواب سحر ریزش شبنم
شورابۂ اشکی بہ رخ اہل حرم زد
چون ست کہ دستش نزند آبلہ کز قہر
گل زاتش سوزان بہ سر طرف خیم زد
حاشا کہ چنین خیمہ توان سوخت مگر دہر
بر کند ازین وادی و در دشت عدم زد
گوئی پیٔ این خنجر بیداد فسان بود
آن سنگ کہ کافر بہ شہنشاہ امم زد
عباس علمدار کجا رفت کہ شبیر
دستی بہ پلارک زد و دستی بہ‌علم زد

۱- طبع نول کشور میں اس کے بعد ایک نوحہ اور ایک مخمس زائد ہے-
۲- کلیات نول کشور طبع اول ''قطعہ ۶۶ نوحہ'' دیوان طبع دہلی ندارد-

زین خون که دود بر رخ شبیر توان یافت
کاندر ره دین شاه چه مردانه قدم زد

نشگفت که بالا بخود از ناز شہادت
کش خامۂ تقدیر بنام که رقم زد؟

ہی ، کاتب تقدیر که در زمرۂ احیا
چون نام حسین بن علی رفت ، قلم زد

زین حیف که بر آل نبیٔ عربی رفت
آمد اجل و دست به دامان ستم زد

این روز جہان سوز کدامست که غالب
شد صبح بدان شور که آفاق بہم زد

۲

مخمس [۱]

در مہد دستبرد به اژدر کند علی
رفع نزاع باز و کبوتر کند علی

از جور چرخ پرسش من گر کند علی
زور آزمائیٔ که به خیبر کند علی

دانم ہمان به گنبد بی در کند علی

رسمیست خسروانه که شاہان به روز بار
گیرند کار خویش ز دستور و پیشکار

دستور شه ، نبی و خداوند دستیار
می گویم و ہر آئینه گویم ہزار بار

کار خدا به عرصۂ محشر کند علی

۱- کلیات طبع نول کشور میں ہے ، دیوان طبع دہلی میں نہیں ہے -

گر کار تست هرزه برو کو بکو به گرد
چون سوقیان به عربده درچار سو به گرد
سلطان دین علیست ، بیا ، گرد او به گرد
جان رونما پزیر و درین جستجو به گرد
کز غرفهٔ خیال تو سر ، بر کند علی

ایمان و بغض خواجه چراغیست و تند باد
یارب ! کسی اسیر هوا و هوس مباد!
باوی نیارم از ستم روزگار یاد
دین بر خورد ز دانش و دانش رسد به داد
تا کار دین بجای پیمبر کند علی

روی نکوی خواجه نه بینند گر بخواب
اصحاب کهف را نبود زینهار تاب
شد کام بخش هر که ز شاهست کامیاب
دریوزهٔ فروغ کند از وی آفتاب
گر ماه را به مایه توانگر کند علی

یزدان که مست کرد روان را ببوی او
آویخت هشت خلد بیک تار موی او
چشمم مباد گر نگرم جز به سوی او
جرم هزار رند به بخشم به روی او
گر خود مرا به محکمه داور کند علی

گفتم ، بود فروغ جمالش نظر فروز
گفتم ، بود نگاه عتابش نظاره سوز
گویم که نطق تشنهٔ گفتن بود هنوز
پیش وی آفتاب نماید چراغ روز
در چاشتگه چراغ اگر بر کند علی

اینک شیوع فتنهٔ روز قیامتست
پیدا ز هر نورد هزاران علامتست
اسلام را دگر چه امید سلامتست
بر دست آن که خاتم قوس امامتست
آرایش جهان مگر از سر کند علی

هر چند چرخ قاعده گردان عالمست
بعد از نبی امام نگهبان عالمست
اندر کف امام ، رگ جان عالمست
دل داغ ره نوردیٔ سلطان عالمست
بازش بجای خویش مقرر کند علی

بر آستان سرور عالم نشسته ام
اندوهناک رفته و بی غم نشسته ام
جنگم چرا به خلق چو من هم نشسته ام
از خواجه تاش خویش مقدم نشسته ام
رحمی به حال غالب و قنبر کند علی

۳

خمسه بر غزل مولانا قدسی[۱]

کیستم تا بخروش آوردم بی ادبی
قدسیان پیش تو در موقف حاجت طلبی
رفته از خویش بدین زمزمهٔ زیر لبی
"مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت که عجب خوش لقبی"

ایکه ! روی تو دهد روشنی ایمانم
کافرم کافر ، اگر مهر منیرش خوانم

۱- باغ دودر اور بعض دوسرے مآخذ میں ہے-

صورت خویش کشیدست مصور دانم
''من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
الله الله! چه جمال ست بدین بلعجبی''
ای گل تازه! که زیب چمنی آدم را
باعث رابطهٔ جان و تنی آدم را
کرده دریوزهٔ فیض تو غنی آدم را
''نسبتی نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم، تو چه عالی نسبی''
ای لبت را بسوی خلق ز خالق پیغام
روح را لطف کلام تو کند شیرین کام
ابر فیضی که بود از اثر رحمت عام
''نخل بستان مدینه ز تو سرسبز مدام
زان شده شهرهٔ آفاق بشیرین رطبی''
خواست چون ایزد دانا که بساطی از نور
گسترد در همه آفاق چه نزدیک چه دور
حکم اصدار تو در ارض و سما یافت صدور
''ذات پاک تو درین ملک عرب کرد ظهور
زان سبب آمده قرآن بزبان عربی''
وصف رخش تو اگر در دل ادراک گذشت
نه همین است که از دایرهٔ خاک گذشت
همچوآن شعله که گرم از خس وخاشاک گذشت
''شب معراج عروج تو ز افلاک گذشت
بمقامیکه رسیدی نرسد هیچ نبی''
چه کنم چاره که پیوند خجالت گسلم
من که جز چشمهٔ حیوان نبود آب و گلم

من که چون مهر درخشان بدمد[1] نور دلم
''نسبت خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکه نسبت بسگ کوی تو شد بی‌ادبی''
دل ز غم مرده و غم برده ز ما صبر و ثبات
غم گساری کن و بنمای بما راه نجات
داد سوز جگر ما چه دهد نیل و فرات
''ما همه تشنه لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما که ز حد می گذرد تشنه لبی''
غالب غمزده را نیست درین غمزدگی
جز به امید ولای تو تمنای بہی
از تب و تاب دل سوخته غافل نشوی
''سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمده سوی تو قدسی پی درمان طلبی''

۱

ترکیب[2] بند در منقبت حضرت علی مرتضیٰ علیه السلام

آن سحر خیزم که مه را در شبستان دیده ام
شب نشینان را درین گردنده ایوان دیده ام
اینت خلوتخانهٔ روحانیان کانجا ز دور
زهره را اندر ردای نور عریان دیده ام
هر یکی فارغ زغیر و هر یکی نازان بخویش
لولیٔ را در دو عشرتگه دو مهمان دیده ام

۱- در اصل : ندهد -
۲- فقط دیوان طبع دهلی میں یه عنوان ہے، کلیات طبع نول کشور میں ہے ''ترکیب بند''۔

هرگز ای نادان به رسوای نه بندی دل که من
ماه را در ثور و کیوان را به میزان دیده ام
رفته ام زان پس به سیر باغ و مرغان را بباغ
سر به شرم خواب زیر بال پنهان دیده ام
کلک موج نکهت گل ، دم زگردش ناز ده
نامهٔ فیض سحر نانوشته عنوان دیده ام
شانهٔ باد سحرگاهی به جنبش مانده
طرهٔ سنبل به بالین بر پریشان دیده ام
باد سرمستانه می جنبد و شبنم می چکد
غنچه را در رخت خواب آلوده داماں دیده ام
صبح اول گو بروی[1] کس نیاورد از حیا
صبح ثانی را برین هنگامه خندان دیده ام
محرم راز نهان روزگارم کرده‌اند
تا بحرفم گوش ننهد خلق خوارم کرده اند
چشمم از انجم بدیدار عزیزان روشن است
شام پندارم جواهر سرمهٔ چشم من است
تاچه بنمایند هان باید نظر بر پرده دوخت
ظلمت شام است جلباب و هر اختر روزن است
رامیان چرخ را آماجگه جز خاک نیست
جان پاک از اختران بیند اثر تا در تن است
ای که گفتی هفت کوکب در شمار آورده ام
زانمیان بهرام شورانگیز و کیوان پُر فن است
دشمنی دارم برون زین هفت کز غارتگری
هم بشب دزد متاع و هم بروزم رهزن است

۱- کلیات نول کشور ''صبح اول گوهروی -''

اهل معنی را نگه دارد بسختی آسمان
سفله را بر گنج زر بینی که بند آهن است

لطف طبع از مبدء فیاض دارم نی ز غیر
دشت را خود رو بود گرسرخ گل ور سوسن است

کار چون نازک بود علت نگنجد درمیان
غنچه در تنگی قبایش بے نیاز از سوزن است

از عطارد نبودم فیض سخن کان تنگ چشم
خود بحکم هم فنی از رشک بامن دشمن است

من که با ساقی ز والائی فرو ناید سرم
آفتاب آسا ، به زور خویش گردد ساغرم

روشناس چرخ در جمع اسیرانش منم
نور چشم روزن دیوار زندانش منم

ثابت و سیّار گردون را رصد بستم به علم
رشتهٔ تسبیح گوهرهای غلتانش منم

نی ز دانش کامیاب و نی بسختی تنگدل
شرمسار کوشش برجیس و کیوانش منم

در لئیمی شهرهٔ دهر از تهیدستی است چرخ
رفته مسکین را ز یاد و گنج پنهانش منم

تیر تازد گر به ادریسی بخاک اندزامش
زهره نازد گر به بلقیسی سلیمانش منم

کعبه بامن از مروت عذر خواه پای ریش
وز ادب شرمندهٔ خار مغیلانش منم

در غریبی خویش را از غصه در دل می خلم
خورده ام از شست غم تیری که پیکانش منم

نوش چون راه لبم گیرد ادا فهمش نیم
نیش چون مغز دلم کاود زباندانش منم

مانده ام تنها به گنج از دور باش پاس وضع
خانهٔ دارم که پندارند دربانش منم

پایهٔ من جز بچشم من نیاید در نظر
از بلندئ اخترم روشن نیاید در نظر

خون گرستم گریه گلبانگ تماشا زد بمن
چشم آن دارم که غم خود زین سپس سازد بمن

شاهد من پایهٔ من در وفا داند که چیست
میکشد عمداً بناز آنگاه می‌نازد بمن

بامن اندر همنشینان روی گرداند ز من
بی من اندر نازنینان گردن افرازد بمن

ریخت خونم بر سر ره تا حنا بندد بپای
کرد خاک راه خویشم تا فرس تازد بمن

چون بغیراز عمرکان مفت ست هیچم مایه نیست
نبودم بیم زیان گر چرخ کج بازد بمن

بر منش دستی تواند بود زان بالاترم
دل نبازم شیر گردون ، پنجه گر بازد بمن

هرکرا گردون بلند آوازه تر خواهد بدهر
نوبت شاهی دهد وانگاه بنوازد بمن

بادشاهان را ثنا گفتن نه کار هر کس است
دیده ورشاهی که کار گفتن اندازد بمن

ور تو گوئی باشه را مایه نبود بیم نیست
خود بشاهان مایه بخشم گر بپردازد بمن

آن که چون در ملک هستی سکهٔ شاهی زند
سکهٔ شاهی بطغرائی ید اللهی زند

نو بهار آمد که رقصد بر سر دیوار گل
سر[1] کشد چون شعله شمع از درون خار گل

عاشقان با عندلیبان دشمن و من در شگفت
کز چه ماند گرچه خوش باشد بروی یار گل

هم بدشت از کوه تا بنگاه دهقان لاله زار
هم بشهر از باغ شه تا خانهٔ خمار گل

قاتل ما چون سبکدست است ما هم سر خوشیم
سر ز دوش افتاده و نفتاده از دستار گل

او پر از لیلای و لیلای نازک و غم جانگداز
بر سر آشفتهٔ مجنون مزن زنهار گل

بستر خارم نسازد رنجه زان ترسم که دوست
داندم در شب ببالین دیدهٔ خونبار گل

آسمان سرگشته بود آسودگی جستم ز خاک
باغبان بیگانه بود آوردم از بازار گل

جنبد از باد و من انگارم که چون جنبیده مهر
گشته از فریاد مرغان چمن بیدار گل

چون نارزد شاخ گل بر خویش چون بیند که باد
از وی افشاند بپای حیدر کرار گل

آن که در معراج از ذوق رخ زیبای او
خواجه را در چشم حق بین بود خالی جای او

صبح سرمستانه پیر خانقه را در زدم
او سخن سر کرد از حق من دم از حیدر زدم

---

۱ - دیوان طبع اول دهلی ''برکشد -'' فاضل-

شیخ حیران ماند در کار من و غافل که من
بوسه‌ها از ذوق پای خواجه بر منبر زدم
کرد یادش در صف او باش دوشم شرمسار
خشت از خم کنده را بر شیشه و ساغر زدم

بزم شوقش را نوائین شمع وخوش پروانه ایست
بسکه بیتابانه خود را بر دم خنجر زدم
یافتم خاکی ز راهش اشک شادی ریختم
خواست از من بادشاهش خنده بر افسر زدم

عذر از حق خواستم تا خواجه را گفتم ثنا
رشته از جان تاقتم تا صفحه را مسطر زدم
محضری آورده قاصد از علی اللهیان
پیش ازان کز خویش پرسم مهر بر محضر زدم

ذوق پابوسش جگر را تشنه تر دارد بوصل
در بهشت از گرمی دل غوطه در کوثر زدم
بر نتابم آرزوی چاره در دل خستگی
تکیه کردم بر علی تا تکیه بر بستر زدم

ناتوانی را که لطفش طرح نیرو افگند
فربهی حرز فسون سازان ز بازو افگند

در عدم پندار پیدائی سلیمان زاستی
آه ازین عالم گرش در چشم موری جاستی
هستی ایزد را و عالم سیمیای ایزدی ست
لاجرم هر ذره را آن فره در سیماستی
هر نوا نام دگر دارد ز فرق زیرو بم
ورنه خود یک زخمه و یک تار و یک اواستی

در تماشاگه جمع الجمع بر وفق نمود
قطره ها سرچشمه و سرچشمه ها دریاستی

گر صمد گویند ور حق کثرت اندر ذات نیست
ما علی گفتیم و آنهم اسمی از اسماستی

جنبش هر شی به آئین است کان شی در وجود
هم بدان ساز است گر پنهان و گر پیداستی

نطق من گر صورت شاهد گرفتی فی المثل
جای گرد از رهگزارش بوی گل برخاستی

دین حق دارم معاذ الله نصیری نیستم
گر نداند عیب جو ، باری خدا داناستی

با علی ویرا ست عهد حق پرستی بسته ام
وان به روزی بود کش روز ازل فرداستی

حرف حق از خواجه یادم بود تا گفتم بلی
ذوق ایمان در نهادم بود تا گفتم بلی

مرد نبود گر[۱] ستم بر خاطرش باری رسد
هم ز خود رنجم گرم از دشمن آزاری رسد

در ره یارم ز رشک پای ره پیمای خود
خون فتد در دل ز زخمی کز سرخاری رسد

یخ فروشم در تموز و کلبه دور از چار سوست
میرود سرمایه از کف تا خریداری رسد

راحت مارا ز بیرنگی برات آورده اند
بت پرستان را سلام از نقش دیواری رسد

دانش آن باشد که چشم دل بحق بینا شود
نی گمان باطلی کز وهم و پنداری رسد

۱- کلیات طبع نول کشور "کز ستم بر -"

طور و نخل طور نبود گرچه در خرگاه خویش
هر کس افروزد چراغی چون شب تاری رسد

از دم باد سحرگاهی دل آساید ولی
جانفزا تر باشد آن کز یاسمن زاری رسد

خوش بود دریوزهٔ فیض الٰهی از علی
گرچه از هر در نصیب هر طلبگاری رسد

کهنه دانم گر دهندم طیلسان مشتری
تازه گردم از ردای خواجه گر تاری رسد

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانه ام
هوشیارم با خدا و با علی دیوانه ام

غالبا! حسن عقیدت بر نتابم بیش ازین
هم ز خود بر خویش منت برنتابم بیش ازین

نیست ز اسمای الٰهی بر زبانم جز علی
بیخودم پاس محبت برنتابم بیش ازین

بسته ام دل در هوای ساقی کوثر بخلد
طعنه از حوران جنت برنتابم بیش ازین

خاصه از بهر نثار بادشه خواهم همی
آبروی دین و دولت برنتابم بیش ازین

در نجف وقت نماز آرم بسوی کعبه روی
قید قانون شریعت برنتابم بیش ازین

باده در خلوت بعشق ساقی کوثر خورم
نازش ناموس نسبت برنتابم بیش ازین

عاشق شاهم نه کافر، عشق شاهان کفر نیست
از غلط فهمان شماتت برنتابم بیش ازین

چون بخوابم روی ننماید بهم بر مرگ دل
جانگدازیهای حسرت برنتابم بیش ازین
بوده ام رنجور تا ذوق سلوکم روی داد
لاجرم رنج ریاضت برنتابم بیش ازین
از فنا فی‌الشیخ مشهودم فنا فی‌الله باد
محو گشتم در علی دیگر سخن کوتاه باد

ترکیب[۱] بند در مرثیه مرزا فرخنده شاه ابن بهادر شاه بادشاه

ای دل بچشم زخم حوادث فگار شو
ای چشم از تراوش دل اشکبار شو
ای خون بدیده درد گداز جگر فرست
ای دم بسینه دود چراغ مزار شو
ای لب بنوحه نالهٔ جانکاه ساز ده
ای سر بغصه خاک سر رهگزار شو
ای خاک چرخ گرنتوان زد ز جا درآی
ای چرخ خاک گرنتوان شد غبار شو
ای نوبهار چون تن بسمل بخون بغلت
ای روزگار چون شب بیماه تار شو
ای ماهتاب روی به سیلی کبود کن
ای آفتاب داغ دل روزگار شو
ای فتنه باد صبح وزید اینقدر مخسپ
ای رستخیز وقت رسید آشکار شو
آه این چه سیل بود که ماراز سر گزشت
تنها ز سر مگو که ز دیوار و در گزشت

۱۔ طبع اول لول کشور "ترکیب بند ۲-" دیوان طبع دهلی سے عنوان نقل کیا ھے

بگزر که بر من و تو جفا کرد روزگار
با بادشاه عهد چها کرد روزگار

شاه سخن سرای سخنور نواز را
در بزم عیش نوحه سرا کرد روزگار

شاخیکه بود موسم آتش که بر دهد
از نخل عمر شاه جدا کرد روزگار

مرگ اینچنین رخ وتن نازک ندیده بود
کام اجل بهدیه روا کرد روزگار

شهزاده خرد سال و بود روزگار پیر
شوخی بشاهزاده چرا کرد روزگار

فرزند بادشه نشناسد معانقه
آغوش گور بهر چه وا کرد روزگار

ای آنکسان که خاک ره شهریار را
توجیه آبروی شما کرد روزگار

هرچند بی اجل نتوان هیچگاه مرد
آتش بخود زنید که فرخنده شاه مرد

ای قوم خویش رابشکیب امتحان کنید
این کار را بشیوۂ کار آگهان کنید

طفل است شاهزاده و در ره خطر بسی ست
منعش ز عزم رهروی آنجهان کنید

ازمیوه و گل آنچه دلش خواهد آن دهید
از حیله انچه رای شما باشد آن کنید

هر حرف دل نشین که بگوئید و نشنود
آن گفته را بعربده خاطر نشان کنید

ورخود ز رفتنش نتوانید باز داشت
بیخود شوید و جامه درید و فغان کنید

گیرید دشنه درکف وهم بر جگر زنید
تاسینه را ز دیده فزون خونچکان کنید

زنهار پیش شاه مگوئید و بیخبر
تابوت را بجانب مرقد روان کنید

ای اهل شهر مدفن این دودمان کجاست؟
خاکم بفرق خوابگه خسروان کجاست؟

زان سبز خط که بر رخ او نادمیده ماند
گردی بدل نشست و غباری بدیده ماند

بستانیان بماتم شهزاده بیخود اند
زین رو بود که پیرهن گل دریده ماند

خون گشت و در دل و جگردوستان فتاد
آن باده‌های ناب کزو ناکشیده ماند

در مدح شاهزاده سخنهای دل پذیر
دردا که هم نگفته و هم ناشنیده ماند

در وادی عدم نتوان رفت باحشم
ماند انچه بود و صاحب عالم جریده ماند

زان گلبنی که صرصر بادش ز پافگند
خاری بیادگار بدلها خلیده ماند

اخلاق شاهزاده بود دلنشین خلق
بوی ازان شگفته گل نو رسیده ماند

آن سرو سایه دار که بارش نبود کو؟
وان نو گل شگفته که خارش نبود کو؟

دستی است ای سپهر ترا در ستمگری
باری برم ز جور تو پیش که داوری
نیرنگ ساز چرخ که بیداد خوی اوست
با گل کند سمومی و با شاخ صرصری

داغم ز روزگار که شهزاده بر نخورد
از خوبی و جوانی و فرخنده گوهری
حیف است مردنش که در ایام کودکی
بود اوستاد قاعدهٔ بنده پروری

شه در ده دو سالگیش کرده کد خدا
با فرّ خسروانی و فرتاب قیصری
ناگاه روزنامهٔ عمرش دریده شد
امضا پزیر ناشده توقیع شوهری

جز نو عروس صاحب عالم نیافتند
دوشیزهٔ که بیوه کنندش بدختری

زیبائی و جوانی فرخنده شاه حیف
آن نونهال سرو قد کجلاه حیف

ای ره نورد عالم بالا ! چگونهٔ؟
ما بی‌تو درهمیم تو بی ما چگونهٔ؟
از سایه در غم تو سیه پوش شد هما
ای خفته در نشیمن عنقا ، چگونهٔ؟

زان پس که با توآب‌وهوای جهان‌نساخت
در روضهٔ جنان بتماشا ، چگونهٔ ؟
با گلرخان دهر وفای نداشتی
با حوریان آئینه سیما ، چگونهٔ؟

ما بیخودان بحلقهٔ ماتم نشسته ایم
از خویشتن بگوی که تنها چگونهٔ ؟

بی مطرب و ندیم و غلامان خرد سال
بی باغ و قلعهٔ و لب دریا چگونهٔ ؟

بعد از تو شاه خیل ترا برقرار داشت
اینجا عزیز بودهٔ ، آنجا چگونهٔ؟

ای بعد مرگ راتبه خوار تو عالمی
پروانهٔ چراغ مزار تو عالمی

گفتار را بنوحه گری چیده ام اساس
در نوحه شاعری مکنید از من التماس

در پرده سنجی از دم خویشم رسد گزند
در رهروی ز سایهٔ خویشم بود هراس

من میهمان و چرخ سیه کاسه میزبان
دردی خور هلاکم و تلخابه نوش یاس

باقی نمانده اشک چه گریم[۱] به های های
ازکار رفته دست ، چه برتن درم لباس

سر حلقهٔ پلاس نشینان ماتمم
اندوه همدمان شه از خود کنم قیاس

چون بود بزم ماتم شهزاده بیخروش
من دم زدم ز تلخ نوای برین پلاس

ازنوحه عرض لطف سخن می توان گرفت
غالب سخن سرای و شهنشه سخن شناس

۱- طبع اول دهلی " چه گویم به هائی هائی" - نول کشور " چه گریم"

یارب جہان ز فیض تو بابرگ و ساز باد
عمر ابوظفر شہ غازی دراز باد[1]

۲

ترکیب[2] بند

زین خرابی که در جہان افتاد
بگزر از خاک ، کآسمان افتاد

چشم و دل غرق خون یکدگر است
زین کشاکش که درمیان افتاد

می کشد بی سنان و دشنہ و تیر
غم بر احباب مہربان افتاد

شعلہ در چرخ ناگرفت ، گرفت
لرزہ بر عرش ناگہان افتاد

جست از سدرہ طائر قدسی
کش ازان نخل آشیان افتاد

زین قیامت کہ نی ہنگام است
در حرم شور الامان افتاد

آنچنان جوش خورد از تف غم
کاب زمزم ز ناودان افتاد

۱- دیوان طبع اول دهلی میں اس کے بعد قصائد اور طبع نول کشور میں اس کے بعد ایک ترکیب بند اور ایک ترجیع بند ہے۔

۲- جناب سیدالعلما مولانا سید حسین بن سید دلدار علی غفرانماب کا مرثیہ - موصوف نے ۱۸ صفر ۱۲۷۳ھ لکھنو میں انتقال کیا اور اپنے والد کے امام باڑے میں قبر پائی (دیکھیے ''ورثۃ الانبیا'' تذکرۂ بے بہا) یہ ترکیب بند دیوان طبع دهلی میں نہیں ہے - ہم کلیات طبع نول کشور سے نقل کر رہے ہیں -

از فراز فلک گزار مسیح
سوی این پست خاکدان افتاد

مردن خواجه چون به کعبه شنید
مرده آسا ز نردبان افتاد

خون زغم در دل کلیم افسرد
لاجرم عقده بر زبان افتاد

گر فرو افتد آسمان بزمین
با قضا در نمیتوان افتاد

گشت داغ غم حسین علی
تازه در ماتم ،،حسین علی،،

از زبانها ، بمعرض آثار
خون فرو می چکد ، دم گفتار

عالمی را ست در نهان و عیان
دل غم اندوز و دیده دریا بار

درد این سو فشرده پا در دل
اشک آن سو دویده بر رخسار

ماجرا از خرد پژوهش رفت
گفت می بین و دم مزن زنهار !

دیده باشی که خواجه چون می زیست
لختی آن فرّ و فرخی یاد آر

رگ برگی ازو نیافت گزند
دل موری ازو نه دید آزار

داد تن چون بخواب باز پسین
با دل شاد و دیدۀ بیدار

برّد الله ، گرد مضجع او
نقش بستند بر در و دیوار
می نه سوزد ز تاب شعلهٔ شمع
بال پروانهٔ چراغ مزار

مرگ سید حسین آسان نیست
دهر آرد چنین کسی دشوار

از صفر روز رفت چون ده و هفت
شب شنبه بزاد روز شمار

ماه و تاریخ کز امام رضا ست
ماه و تاریخ ''سید العلما ست''
آن امام همام یزدان دان
قهرمان قلمرو ایمان

آنکه گر نطق او نشان ندهد
نرسد کس بمعنی قرآن
آنکه گردون بدین توانائی
باشدش گوی در خم چوگان

آنکه باوی بهشت و دوزخ را
چاره نبود ز بردن فرمان

صفت ذات وی بشرط وجوب
در نگنجد به حیّز امکان

جوهرش را عرض بود اسلام
این نپاید ، اگر نباشد آن

از ''اولی الامر'' ثامن و ضامن
که نجات نفوس را ست ضمان

حسب دعوت بمامن مامون
گشت مهر سپهر دین مهمان
آن ستم پیشه را همی بایست
که کند خدمت از بن دندان

بریا و نفاق و خدعه و زرق
کرد لطف و مروت و احسان
به ولی عهدیش فریفت مگر
می ندانست پایهٔ سلطان

خیره سر بین که در حمایت عهد
پادشه را دهد ولایت عهد

گفت مامون شبی بچند غلام
که همیدون درین شبا هنگام
پای از سر کنید و بشتابید
سوی بنگاه قبله گه انام

گر بود در فراز ، زود ازو
باید آمد فرود از ره بام
پس بدان پای ، کش صدا نبود
جانب خوابگه کنید خرام

یکسره بر سرش فرود آرید
تیغهای بر آمده ز نیام
اهرمن گوهران تیره درون
خانه زاد سواد ظلمت شام

شاه را یافتند تا جستند
صحن و ایوان آن خجسته مقام

بود آن دم درون حجرهٔ خاص
بر نهالی ، برخت خواب ، امام
اوصیا را ست از نهایت قرب
جامهٔ خواب جامهٔ احرام

تیغها بر سرش فرود آمد
هم چنان کز خدا درود و سلام
همه باز آمدند و دانستند
کار ماه تمام گشت تمام

بستر از خون پاک نم نگرفت
بر تنش هیچ موی خم نگرفت

پیکر خواجه بود چشمهٔ نور
چشم بد باد از نکویان دور
نور دیدی ، شود بتیغ دو نیم؟
خون شنیدی ، چکد زرخشان هور؟

تو و یزدان بود چنین پیکر
درخور زخم دشنهٔ ساطور ؟
نه پیمبر گزاشت در گیتی
اهل بیت و کلام رب غفور؟

پایهٔ اهل بیت ، تادانی
هست توأم به ایزدی منشور
گر نه خفاش تیره روزستی
روزماندی ازو چرا مستور

کی فروزد ظهور نور ، دلش
آنکه دزدد نگه ز نور ظهور

دیده باشی که نور در سرسام
برنتابد طبیعت رنجور

حاسدان را ازین مشاهده شد
سینه ها ریش و ریشها ناسور

ور خلاف خلافت از ره کین
بود چون کشتن امام ضرور

عاقبت میزبان مهمان کش
شاه را زهر داد در انگور

زائران را کنون به مشهد طوس
آسمان آید از پئی پابوس

قصهٔ سینه سوز و زهره گداز
گفته آمد بشیوهٔ ایجاز

ناز پروردهٔ نیازی هست
عجز من در گزارش اعجاز

من بدان سوختن نساخته ام
که توانم شناخت سوز از ساز

ز آسمانم شکایت است عظیم
بر زبانم حکایت است دراز

اینت آشوب دل ز خون پر کن
اینت رنج تن از روان پرداز

مرد سید حسین و برد غمش
از دلم تاب و از لبم آواز

تا چها با رسول بودش روی
تا چها با خدای بودش راز

خاست در حاملان عرش عظیم
شور شیون ز شهپر پرواز

پایهٔ عرش هشته اند ز دست
تا گزارند بر جنازه نماز

در جهان مثال دارندش
میهمان بر بساط نعمت و ناز

بهر احیای رسم جهد و جهاد
خواجه همپای مهدی آید باز

آفرین بر روان پاکش باد
مهر از ذره‌های خاکش باد

دگر ای دل ! بخون شناور باش
آشنا روی دیدهٔ تر باش

کمتر از شمع در شمار نه‌ای
پای برجا در آب و آذر باش

خویشتن را فگن در آتش تیز
گر نه پروانه‌ای ، سمندر باش

تانیائی ز لاغری بنظر
تاری از تارهای بستر باش

گر گریبان ز تست چاکش کن
ور رگ جان ز تست ، نشتر باش

واحسینا ! بگوی و در گفتن
بفغان آی و شور محشر باش

دیده را گرد و خار و پیکان شو
سینه را تیغ و تیر و خنجر باش

غم میر اجل ، غم دین ست
غالب از غصه خاک بر سر باش
گفته باشی که زار و غمزده ام
لختی از خویشتن فزون تر باش
خیز و گرد مزار خواجه بگرد
با سپهر برین برابر باش
بیتی از خود بسینه می خلدم
می کنم مویه گو مکرر باش
گشت داغ غم حسین علی
تازه در ماتم حسین علی

۳
ترکیب بند[۱]

خواهم از بند به زندان سخن آغاز کنم
غم دل پرده دری کرد فغان ساز کنم
به نوای که ز مضراب چکاند خوناب
خویشتن را به سخن زمزمه پرداز کنم
در خرابی به جهان میکده بنیاد نهم
در اسیری به سخن دعوئ اعجاز کنم
بے مشقت نه بود قید ، به شعر آویزم
روزکی چند رسن تابئ آواز کنم
چون سرایم سخن انصاف ز محرم[۲] خواهم
چون نویسم غزل اندیشه ز غماز کنم
تاچه افسون بہ‌خود از هیبت صیاد دمم
تاچه خون درجگر از حسرت پرواز کنم

۱- یہ ترکیب بند ''سبد چین'' میں، پھر ''باغ دودر'' میں شائع ہوا۔
۲- سبد چین: ''انصاف ز مجرم'' اور ''باغ دودر'' : ''انصاف ز محرم۔''

یار دیرینه قدم رنجه مفرما کاینجا
آن نگنجد که تو در کوبی و من باز کنم

های ناسازی طالع که به من گردد باز
باخرد شکوه گر از طالع ناساز کنم

اهل زندان بسروچشم خودم جا دادند
تابدین صدر نشینی چه قدر ناز کنم
هله دزدان گرفتار ، وفا نیست بشهر
خویشتن را به شما همدم و همراز کنم

من گرفتارم و این دائره دوزخ ، تن زن
در سخن پیروی شیوهٔ ایجاز کنم
گرچه توقیع گرفتاری جا ویدم نیست
لیکن از دهر دگر خوشدلی امیدم نیست

شمع هرچند بهر زاویه آسان سوزد
خوشتر آنست که برنطع در ایوان سوزد

عود من هرزه مسوزید وگر سوختنی ست
بگزارید که در مجمر سلطان سوزد

خانه ام ز آتش بیداد عدو سوخت دریغ
سوختن داشت زشمعیکه شبستان سوزد

منم آن خسته که گر زخم جگر بنمایم
برمن از مهر دل گبر و مسلمان سوزد
منم آن سوخته خرمن که ز افسانهٔ من
نفس راهرو و رهزن و دهقان سوزد
منم آن قیس که گر سوی من آید لیلی
محمل از شعلهٔ آواز حدی‌خوان سوزد

تاچسانم گزرد روز به شبہا دریاب
از چراغی که عسس بردر زندان سوزد

تنم از بند در انبوه رقیبان لرزد
دلم از درد بر اندوه اسیران سوزد

از نم دیدۂ من فتنۂ طوفان خیزد
از تف نالۂ من جوهر کیوان سوزد

آه ازین خانه که روشن نشود درشب تار
جزبدان خواب که درچشم نگہبان سوزد ۱

آه ازیں خانه که دروی نتوان یافت هوا
جز سموسی که خس و خار بیابان سوزد

ای که در زاویه شبہا بچراغم شمری
دلم از سینه برون آرکه داغم شمری

پاسبانان بہم آئید که من می آیم
در زندان بکشائید که من می آیم

هر که دیدی بدر خویش سپاسم گفتی
خیر مقدم بسرائید که من می آیم

جاده نشناسم و ز انبوه شما می‌ترسم
راهم از دور نمائید که من می آیم

رهرو جادۂ تسلیم درشتی نه کند
سخت گیرنده چرائید که من می آیم

خست تن در ره و تعذیب ۲ ضرورست اینجا
نمک آرید و بسائید که من می‌آیم

۱- یه شعر ’’باغ دودر‘‘ : میں موجود نہیں ہے -
۲- ’’باغ دودر‘‘ - ’’تن در ره تعذیب-‘‘

عارض خاک بپاشیدن خون تازه کنید
رونق خانه فزائید که من می آیم

چون من آیم بشما شکوهٔ گردون نه رواست
زین سپس ژاژ مخائید که من می آیم

هان عزیزان که درین کلبه اقامت دارید
بخت خود را بستائید که من می آیم

تا بدروازهٔ زندان پیٔ آوردن من
قدمی رنجه نمائید که من می آیم

چون سخن‌سنجی وفرزانگی آئین من است
بهره از من بربائید که من می آیم

بخود از شوق ببالید که خود باز روید
بمن از مهر گرائید که من می‌آیم

بسکه خویشان شده بیگانه ز بدنامی من
غیر نشگفت ، خورد گر غم ناکامی من

آنچه فرداست هم امروز درآمد گوئی
آفتاب از جهت قبله برآمد گوئی

دل و دستیکه مرا بود فروماند ز کار
شب و روزیکه مرا بود سرآمد گوئی

سرگزشتم همه رنج و الم آرد گفتی
سرنوشتم همه خوف و خطر آمد گوئی

بهرهٔ اهل جهان چون زجهان دردوغم است
بهرهٔ من ز جهان بیش تر آمد گوئی

خستن وبستن من حد عسس نیست برو
بر من اینها ز قضا و قدر آمد گوئی

هنرم را نتوان کرد به خستن ضایع
خستگی غازهٔ روی هنر آمد گوئی

غم دل داشتم اینک غم جانم دادند
زخم را زخم دگر بر اثر آمد گوئی

چرخ یک مرد گرانمایه بزندان خواهد
یوسف از قید زلیخا بدرآمد گوئی

مژه امشب ز کجا اینهمه خوناب آورد
این چنین گرم ز زخم جگر آمد گوئی

خود چرا خون خورم از غم که بغمخواری من
رحمت حق به لباس بشر آمد گوئی

خواجهٔ هست درین شهر که از پرسش وی
پایهٔ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفی خان که درین واقعه غمخوار من است
گر بمیرم چه غم از مرگ، عزادار من است

خواجه دانم که بسی روز نمانم در بند
لیک دانی که شب از روز ندانم در بند

نه پسندم که کس آید، نتوانم که روم
جانب در بچه حسرت نگرانم دربند

خسته‌ام خسته من و دعوئ تمکین حاشا
بند سخت است، تپیدن نتوانم دربند

شادم از بند که از بند معاش آزادم
از کف شحنه رسد جامه و نانم دربند

آمه و خامه بیارید و سجل بنویسید
خواب از بخت همی وام ستانم دربند

یارب این گوهر معنی که فشانم زکجاست
بند بردل بود و نیست زبانم دربند

هرکس از بندگران نالد و ناکس که منم
نالم از خویش که بر خویش گرانم دربند

خوی خوش بہرمصیبت زده رنجی دگراست
رنجه از دیدن رنج دگرانم دربند

رفته دربارۂ من حکم که با درد و دریغ
شش مه از عمر گرامی گزرانم دربند

اگر این است خود آنست که عیدالضحیٰ
گزرد نیز چو عید رمضانم دربند

مدت قید اگر در نظرم نیست چرا
خون دل از مژه بے صرفه چکانم دربند

نیستم طفل که دربند رهائی باشم
هم ز ذوق ست که در سلسله خائی باشم

من نه آنم که ازین سلسله ننگم نبود
چکنم چون بقضا زهرۂ جنگم نبود

زین دو رنگ آمده صد رنگ خرابی بظهور
گلۂ نیست که از بخت دورنگم نبود

راز دانا ، غم رسوائی جاوید بلاست
بهر آزار غم ازقید فرنگم نبود

لرزم ازخوف درین حجره که ازخشت وگل است
ورنه در دل خطر از کام نهنگم نبود

زیں دو سرهنگ که پویند بهم ، می ترسم
بیمی از شیر و هراسی ز پلنگم نبود

منم آئینه و این حادثه زنگ ست ولی
تاب بدنامیٔ آلائش زنگم نبود

آه ازان دم که سرایند ز زندان آمد
اندرین دایره گیرم که درنگم نبود

همدمان دار دم امید رهائی دربند
دامن از بعد رهائی ته سنگم نبود

جور اعدا رود از دل برهائی لیکن
طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

به شگاف قلم از سینه برون می ریزم
بسکه گنجائی غم در دل تنگم نبود

حاش لله که درین سلسله باشم خوشنود
چکنم چوں سر این رشته بچنگم نبود

بصریر قلم خویش بود مستیٔ من
اندرین بند گران بین و سبکدستیٔ من

همدمان در دلم از دیده نهانید همه
غالب غمزده را روح و روانید همه

لله الحمد که در عیش و نشاطید همه
لله الشکر که با شوکت و شانید همه

هم در آئین نظر سحر طرازید همه
هم در اقلیم سخن شاه نشانید همه

چشم بد دور که فرخنده لقائید همه
شاد باشید که فرّخ گهرانید همه

سود بینید وفا دیده و نورید همه
زندہ مانید صفا[1] قالب و جانید همه
من بخون خفته و بینم همه بینید همه
من جگر خسته و دانم همه دانید همه
درمیان ضابطۂ مہر و وفائی بودست
من برینم که هر آئینه برآنید همه
روزی ازمہر نگفتید''فلانی چون است''
باری از لطف بگوئید ، چسانید همه؟
گر نباشم بجہان خار و خسی کم گیرید
ایکه سرو و سمن باغ جہانید همه
چارۂ گر نتوان کرد دعائی کافی‌ست
دل اگر نیست خداوند زبانید همه
هفت بند است که دربند رقم ساخته ام
بنویسید و بہ‌بینید و بخوانید همه
آں نباشم که بہر بزم ز من یاد آرید
دارم آمید که در بزم سخن یاد آرید

۲
ترجیع بند[2]

باز برآیم که نیاز آورم
رخ بتماشا گه ناز آورم
دیدۂ و دل را پئی نقل متاع
بر در گنجینۂ راز آورم

۱- باغ دودر میں—''جفا'' قالب ہے -
۲- یہ ترجیع بند دیوانِ طبع دہلی میں نہیں ہے - کلیات طبع نول کشور میں شائع ہوا ہے - غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد کسی عیدالفطر کے موقع پر بادشاہ کو ہدیہ پیش کیا گیا ہے -

هرچه نه نو بوده فرود افگنم
هرچه نه فرسوده ، فراز آورم

ساز دهم کهنه مشو هیکلی
سیم کواکب بگداز آورم

از پس زرکوبی مهر منیر
آن ورق اندر دم گاز آورم

وز پئی آویختنش در گلو
سلسله از عمر دراز آورم

این گهرین هیکل قدسی طراز
پیش شه بنده نواز آورم

تکیه گه دولت و دین ، بوظفر
خضر ره علم و یقین ، بوظفر

خامه دگر رهروی از سر گرفت
تیزی گام از دم خنجر گرفت

از نی کلکم شجر طور رست
بسکه ز سوز نفسم در گرفت

از چه سخن میرود از طور و نور
گرچه نه جهان صورت دیگر گرفت

جلوه گه وجه طرب گشت دهر
عید مگر پرده ز رخ بر گرفت

برد ، دگر نام شهنشه خطیب
عرض سر افرازی منبر گرفت

ترک فلک بین که ز برجیس و تیر
بیعت خاقان سخنور گرفت

آنکه درین دائرهٔ لاجورد
تاج زر از خسرو خاور گرفت
تکیه گه دولت و دین ، بوظفر
خضر ره علم و یقین ، بوظفر

کوکبه بین و علم و کوس و نای
پرچم رقصنده بفرق لوای
حاجب و سرهنگ دوان پیش پیش
فوج روان از پس کشور کشای

چشم قسم خورده برفتار پیل
گوش ز خود رفته ببانگ درای
غرّهٔ شوال گرفتم که هست
روز دل افروز مسرّت فزای

پیل براه از چه درین روز بست
نقش مه چارده از نقش پای
ماه تمامی که ز بس پُر شدن
می نتواند که بجنبد ز جای

بو ، که درین روز گراید بمن
شاه عدو بند ، قلمرو کشای
تکیه گه دولت و دین ، بوظفر
خضر ره علم و یقین ، بوظفر

در نظرم روی به از مه خوش است
باده بدین وجه موجه خوش است
وقت پی باده چه جوئی همی
هم بشب و هم بسحرگه خوش ست

نغمه چو می هوش ز سر می برد
ره زدن مطرب ازین ره خوش ست

بگزر و تن زن که ز ما تا بدوست
راز دراز آمد و کوته خوش ست

خرده به بدمستی غالب مگیر
کان بغرور دل آگه خوش ست

دید که گر خسته و گر بی خودم
روی سخن سوی شهنشه خوش ست

تکیه گه دولت و دین ، بوظفر
خضر ره علم و یقین ، بوظفر

ای به هنر ، انجمن آرای ملک
وی به اثر ، رونق سیمای ملک

عدل تو ، سرمایهٔ آرام خلق
بذل تو ، پیرایهٔ لیلای ملک

آئینهٔ رای تو ، در دست دین
سلسله حکم تو ، بر پای ملک

میکدهٔ راز تو ، دریای علم
زمزمه ساز تو ، غوغای ملک

در عرفا اسم تو "ذوالنون وقت"
در خلفا نام تو ، دارای ملک

فائده بخشیده به اعیان دهر
مائده گسترده به پهنای ملک

سینه منور بتمنای حق
دیده مکحل بتماشای ملک

تکیه گه دولت و دین ، بوظفر
خضر ره علم و یقین ، بوظفر

نطق من ، آئینه زداید همی
تاچه دگر روی نماید همی
مائده آرای معانی سخن
از نفسم زله رباید همی

ناطقه ، آن لیلی شیرین ادا
سوی من از مهر گراید همی
ناز سخن بر گهر من رواست
بر سخنم ، ناز نشاید همی

تا ز شکوه که سخن می رود
چرخ بره ناصیه ساید همی
دل ز زبان آمده منت پزیر
تا بزبان نام که آید همی

هست ز دستوری دل گر زبان
مدح شهنشاه سراید همی
تکیه گه دولت و دین ، بوظفر
خضر ره علم و یقین ، بوظفر

همدم شه ، طالع بیدار باد
دولت جاوید ، پرستار باد
ظل لوای تو فتد هر کجا
رایت بدخواه نگونسار باد

مهر ندارد نظری سوی او
روز عدوی تو شب تار باد

کار تو سعی ست در آرام خلق
سعی تو مشکور درین کار باد

پایهٔ والای تو بالاتر ست
از من و از مدح منت عار باد

ابر فرو بارد و باز ایستد
دست تو پیوسته گہر بار باد

ختم ثنا به که بود بر دعا
باد درین عالم و بسیار باد

تکیه گه دولت و دین ، بوظفر
خضر ره علم و یقین ، بوظفر

۳

ترجیع بند[1]

ورود سرور سلطان نشان مبارک باد
به شہر مقدم نوشیروان مبارک باد

سرور و خوشدلی و انبساط و آسایش
نشاط و شادیو امن واماں مبارک باد

نه این دیارکه شہریست درقلمرو ہند
بملک ہند کران تا کران مبارک باد

ز طبع خلق بدربرد عدل ناسازی
دوام رابطهٔ جسم و جان مبارک باد

وفور عیش بدارای خلق ارزانی
ہجوم خلق بر آن آستان مبارک باد

ذریعهٔ شرف و عز و جاه شہر آمد
وزیر پادشه و پادشاه شہر آمد

۱- یہ ترجیع بند پہلی مرتبہ ''سبد چین'' پھر ''باغ دودر'' میں شائع ہوا ہے -

به اهل شهر بگو تا به خویشتن نازند
نشاط و شادی و سور و سرور آغازند
بساطهای گرانمایه در فضای چمن
بگسترند و بهم طرح بزم اندازند
زخیمه‌ها و سراپرده های رنگارنگ
سپهر های دگر بر زمین بیفرازند
دمیکه این همه آئین شهر بر بندند
ز خانه بهر پذیره شدن بدر تازند
چو روی دیده فروز خدایگان نگرند
بدین لوای دل آویز نغمه پردازند
ذریعهٔ شرف و عز و جاه شهر آمد
وزیر پادشه و پادشاه شهر آمد
جمال کوکبهٔ شهریار می بینم
فروغ بخت درین روزگار می بینم
هزار و هشت صد و شصت و شش [1] زسال مسیح
بهار تازه بفصل بهار می‌بینم
زمانه در پی قطع امید و من بخیال
خوشم که روی خداوندگار می بینم
ببارگه چو سکندر دویست می نگرم
بخاک ره چو ارسطو هزار می بینم
ندیده بلبل بی بال و پر بجانب باغ
بحیرتی که سوی رهگزار می بینم
ذریعهٔ شرف و عز و جاه شهر آمد
وزیر پادشه و پادشاه شهر آمد

۱- ۱۸۶۶ء

رخ نکوی ترا ماه آسمان گویم
قد بلند ترا سرو بوستان گویم

حدیث مدح تو برتر بود ز منطق من
مگر به تهنیت طالع زبان گویم

گورنری نه ز شاهی کم است میدانم
تو هرچه نام نہی خویش را چنان گویم

به پیرهن اگر افشانده غم شرر گله نیست
سخن ز سوختن مغز استخوان گویم

ز زندگی که بسی نیست هم بدان شادم
که دوستان بمن و من بدوستان گویم

ذریعهٔ شرف و عز و جاه شهر آمد
وزیر پادشه و پادشاه شهر آمد

همیشه بر نمط داد در جهانبانی
تو آصفی کن و وکتوریا سلیمانی

رخ تو مهر درخشان بعالم افروزی
کف تو ابر بهاران بگوهر افشانی

نہان به طبع تو اسرار علم اشراقی
عیان ز روی تو انوار فر یزدانی

به حلم و لطف ترا شیوهٔ ملک شاهی
ببذل و جود ترا دستگاه قاآنی

ببین هر آئینه ترجیع بند غالب را
که آیتی است گرانمایه در ثناخوانی

ذریعهٔ شرف و عز و جاه شهر آمد
وزیر پادشه و پادشاه شهر آمد

مثنوی

جواب نامه جواهر سنگھ

وفا جو هرا ! از تو غم دور باد
دلت سر خوش بادهٔ سور باد
رسید از تو الفت فزا نامهٔ
روان تازه کن دلکشا نامهٔ
نخوا هم که در عرصه روز گار
نشیند ترا بر دل از غم غبار
ز رنجوری من مخور غم که من
ندارم غم هستی خویشتن
نه جان از منست و نه جسم آن من
خود از مردن من چه نقصان من
حدیثی است شایسته و سودمند
ز شایستگی بوده دانا پسند
گر از من نباشی نکوئی شنو
از آنکس که فرزند اوئی شنو
چنین داده فرمان که در ساز راه
نه پاشی به حیلت گری عذر خواه
عزیزان رهرو گرامی کسند
به شا دی دران ناحیت می رسند
به شادی بدین جمع انباز گرد
چو گردند اینان تو هم باز گرد
الا تا نه سنجی که این زان به است
چنین خواستست آنکه فرمانده است

مشو سخت کوش و مشو سخت گیر
درین آمدن باش فرمان پذیر

بحکم پدر چون گزیدی سفر
بگرد از سفر هم بحکم پدر
درین رفتن و آمدن شاد باش
به تبعیت از طعنه آزاد باش

ز هجر تو مادر به تاب اندر است
گدازان چو شکر به آب اندر است
پدر نیز مشتاق دیدار تست
بصد گونه خواهش طلبگار تست

ترا خواهد ، از بسکه خواهد ترا
نخواهد گر او پس که خواهد ترا ؟
بیا و دو خونین جگر را ببین
بمادر نشین و پدر را ببین

د گر من ، چراغ سحر گاهیم
قدم نه براه هوا خواهیم
بیا تا بینی که چون می تپم
چسان دیده تا دل بخون می تپم

بیا ، تا تنم غرق خون بنگری
درون مرا از برون بنگری
بیا ، تا بینی که از روزگار
کنو نم بجائی رسید ست کار

که می نوشم از خستگی نز و رع
بجای می ناب ماء القرع

بیا و بیا و بیا و بیا
سر آمد سخن و الدعا و الدعا

بخواں چوں بخوانی ورق را تمام
ز نیر سلام و ز عارف سلام[۱]

جواب نامه[۲] و سپاسگزاری از الکزنڈر اسکنر

از دوست بهر بنده رهی شیشه های می
از بنده سوی دوست بهر شیشه یک سلام

می هم فزوں و هم باثر زندگی فزای
آن عمر جاوداں که خود اسمش بود مدام

دارم یقین که عمر من و آں شراب ناب
تاروز رستخیر نخواهد شدن تمام

ماناد دوستی که فرستاده آب خضر
از بهر تفته جاں، اسد الله تشنه کام

۱- از ۱۸۴۸ء تا ۱۸۴۹ء عروسی هیرا سنگ است نیز غالب دریں ایام نا خوش و مریض بنظر می اید - مجموعه مکاتیب باغ دودر شاهد دعوی ست بنا برین این نامه هم مربوط به این سنین می باشد ـ (فاضل)

۲- سبد چین، باغ دودر، مالک رام در حاشیه سبد چین نوشته که الکزنڈر اسکنر غالب را شراب ویک نامه منظوم از علاءالدین خاں علائی گرفته، فرستاد آغاز آں نامه باین شعر است

بنام نامی غالب همی رود نامه
ز اسکنر که ارادت گزیں دیرین ست

رجوع شود به سبد چین، صفحه ۵۳ ببعد و رومان لاهور، فروری ۱۹۳۷ء -

آن دوست کش بقوت اقبال بیز وال
از مہرومہ سلام رسانند صبح و شام
آن دوست کش بود بتقاضای فر بخت
زینت فزای ناصیهٔ آفتاب نام
سلطان شکوه مستر الگزندر اسکنر
آں آسماں عزو شرف رامه تمام
از نام اوست جاں ستم دیده را نشاط
در مدح اوست کلک هنر پیشه را خرام
از روی لطف چوں دوسه سطری رقم زند
دانی که ماهتاب در خشید از غمام
در وقت قہر از دهنش حرف چوں جهد
گوئی که تیغ تیز بروں آمد از نیام
جم رتبه ، صاحبا ، نفسی سوی من گرای
تا یا بم از تو داد نو آئینی کلام
می ساز گار طبع ، ولی دستگاه کو
هر روز شغل باده بود عادت کرام
خواهم که تا ز مرگ امانم بود بدهر
ته جرعه نوش جام تو باشم علی الدوام
از اولڈ ٹام ، کاس ٹلن ، راضیم ولی
نه از پوٹ وین ، آنکه شرابست لعل فام
دیگر بجز دعاچه بود تا رقم کند
فرماں پذیر باد سپهر و زمانه رام

نامہ[1] بنواب وزیر الدولہ والی ٹونک

گفتم بخرد بخلوت انس
کای شمع و چراغ هفت ایوان
آیا ز چه رو بود که نواب
ننوشت جواب نامه ام ، هان

آن گونه عریضهٔ که دانی
درویش نوشته سوے سلطان
آن گونه قصیدهٔ که گوئی
از صفحه دمیده سنبلستان

این هر دو رسید و نیست پیدا
ز انسو اثری بهیچ عنوان
رنجید مگر ز مدح نواب
ای کاش نگشتمی ثنا خوان

هیهات ! چه گفته ام که باشم
از گفتهٔ خویشتن پشیمان
عقلم بجواب گفت : غالب
زنهار مخور فریب شیطان
نواب بفکر ارمغان است
تا نامه فرستدت بسامان

۱- کلیات فارسی ، طبع اول ، نول کشور کے ایک نسخہ پر کسی زین العابدین کے قلم سے یہ قطعہ لکھا ہوا دیکھا ہے - جس کی روایت سبد چین اور باغ دودر سے مختلف ہے - اشعار سے پہلے یہ عبارت ہے : ''قطعہ بحسن طاب ، بنواب وزیرالدولہ والی ریاست ٹونک ، موصولہ ۶ مئی ۱۹۱۱ء از مقام چھبڑہ علاقہ ٹونک'' -
نیز انشائی نور چشم ، طبع نظامی پریس کانپور ۱۲۸۹ھ صفحہ ۴۸ -

و انها که بخاطرش گذشت ست
زود است که داده است فرمان

تا راه روان بحرو بر گرد
آرند بکوشش فراوان

دیباز دمشق و مخمل از روم
الماس[1] ز معدن و زر از کان

فیل از دکن و زمرد از کوه
تو سن ز عراق و در ز عمان

فیروزهٔ نغز از نشا پور
یاقوت گزیده از بدخشان

جمازهٔ تیز رو ز بغداد
شمشیر برنده از صفاهان

پشمینه قیمتی ز کشمیر
زر بفت گران بها ز ایران

بالجمله درنگ چون ازیں دوست
بر رنج و ملال نیست برهان

چون پیر خرد بدل فریبی
گفت ایں همه راز های پنہان

۱- کلیات فارسی کے قلمی حاشیہ مذکور پر یہ اشعار کسی قدر اختلاف کے ساتھ درج ھیں :

دیباز دمشق و مخمل از روم — زر بفت گران بہا ز ایران
پشمینه قیمتی ز کشمیر — الماس ز معدن و زر از کان
فیروزه نغزاز نشاپور — یاقوت گزیده از صفاهان
فیل از دکن...... — توسن ز عراق......
جمازهٔ ...... — شمشیر .....

گشتم بدم امید واری
مرهم نه زخم یاس و حرمان
گفتم که چو با من این کرم کرد
آن قبله و قبله گاه اعیان
نا چار ز راه حق گزاری
تا کرده شود تلافی آن
من نیز طلب کنم برایش
این خواهش اگرچه نیست آسان
آئینه و تاج از سکندر
انگشتر و تخت از سلیمان
از عالم غیب جام جمشید
از چشمۂ خضر آب حیوان
عمر ابد و نشاط جاوید
نیروی دل و ثبات ایمان
توفیق[۱] جواب نامۂ خویش
توقیع عطا و بذل و احسان

دربارۂ[۲] وام طلبان

گیر که در روز حشر چون بیفتی
بر سر دوزخ نهند تیره نهنبن
دان که نباشد دران مضیق مصیبت
در طلب نان و جامه کشمکش از زن
دان که نباشد دران مقام صعوبت
شور تقاضای نا روای مهاجن[۳]

۱- حاشیه کلیات مذکوره—تعجیل جواب نامۂ خویش-
۲- این قطعات مربوط به صفحه ۲۳۴ ' است که در الجا چاپ نه شد-
۳- اردوے معلے - سبد چین-

بی زری[1]

صبحدم با ابوالبشر گفتم
پارهٔ زر بده که زر داری
حیف باشد که از چو من پسری
خاک رنگین عزیز تر داری

گفت حیف است از تو خواهش زر
که تو گنجینهٔ گہر داری
گنجدان سخن حوالهٔ تست
خود ببین تا چه ای پسر داری

پیش من از کجاست جان پدر
ببری هر چه در نظر داری
گفتم اینک ببند پیمانی
زر بمن می دهی اگر داری

سر زنبیل آن عمرو عیار
که ز عیاریش خبر داری
بکشا زود وزر بریزو بگو
که همین مدعا مگر داری

گفت بابا ، فسانهٔ بود ست
چه فرو ریزم و چه برداری

خطاب به منجم[2]

الا ای شناسندهٔ هندسه !
نباید که موجود فهمی مرا

۱، ۲- باغ دودر - سبد چین - اردوئے معلی -

وجودیست خارج ز من آنچنان
که در جدی طا، هست و در حوت 'یا'

مهندس اشارات دارد بسی،
نه در حوت یای و نه در جدی طا [1]

مسرت بناکامی وزد

مفلس اگرش مال نباشد، چه کمست این
کز هیچ کس اندیشهٔ آزار ندارد
بردار و بدو کیسه برد دزد سیه دل
با مرد تهیدست سروکار ندارد

نقاب چسان عرضه دهد صنعت خود را
در خانهٔ شطرنج که دیوار ندارد[2]

تهنیت عید[3]

تا بود چار عید در عالم
بر تو یارب خجسته باد و هجیر
عید شوال و عید ذوالحجه
عید بابا شجاع و عید غدیر

در معراج[4]

سه تن ز پیمبران مرسل
گشتند بقرب حق مشرف
عیسے ز صلیب و موسی از طور
ختم الرسل از براق و رفرف

۱، ۲، ۳، ۴- سبد چین و باغ دودر۔

خبری درباره شراب

بحق باده چنین حکم داد حاکم شهر
که نی برند ز شهر و نیاورند به شهر
بیا ، بشام و بیا شام و سوی خانه خرام
فقیر لایق لطفست نی فرا خور قهر[1]

توبه و ترک توبه از شراب

با خرد گفتم ار تو فرمائی
شویم از دل خیال بادهٔ ناب
گفت ، صد آفرین ولی نتوان
شستن این خیال جز بشراب[2]

توبه و طلب مغفرت

بروز حشر الهی چو نامهٔ عملم
کنند باز که آن روز باز خواه من است
بکن مقابله آنرازسر نوشت ازل
اگر زیاده و کم باشد آن گناه من است[3]

ترک بادهٔ نوشی[4]

هر شب بقدح ریختمی بادهٔ گلفام
آری ز دوسی سال مرا قاعده این بود
شش روز شد اینک که بمی دست رسم نیست
شد غمزده تر دل که ازین پیش حزین بود

---

۱ ، ۲ - سبد چین و باغ دودر-
۳- تذکره غوثیه ، سبد چین ۴- باغ دودر-

امشب چه سرایم که شب اول گورست
ششن روز به بیتابی و تلواسه جنین بود

ناگاه در آن وقت که در قطع ره عمر
از من دو قدم تا بدم باز پسین بود

یکره دو تن از شرب میم منع نوشتند
وان منع نه از بغض بل از غیرت دیں بود

هر چند بدان منع، من از می نگزشتم
امادم گیرای عزیزاں بکمین بود

دانی که چه شد چوں زر سوداگر صهبا
کش داد وستد بامن ویرانه نشین بود

بگذشت ز اندازۂ بایست، بمن گفت
دیگر ندهم باده که معمول نه این بود

با کاسهٔ خالی چه کند کیسهٔ خالی
نا خواسته ور خواسته، دل صبر گزین بود

گرزر بود از جائی دگر می طلبیدم
کو نقد دران دست که پشتش بزمین بود

در غرۂ شعبان چو ز من باده گرفتند
خود 'غالب پژ مرده' نشانی ز سنین بود

روشش بدر آر از مه شعبان که درینجا
مقصود من از تخرجه البته همیں بود

معذرت از سفر

خواندی بنو بهار مرا جانب چمن
زین برگهای سبز چه گرد آورم نوا

گفتی گل است کی زر گل را توان فروخت
گفتی هو است گنج نمی بارد از هوا

گفتی می مست می نکند جوع را علاج
گفتی غنا، غنی نتوان شد بدین غنا
گفتی بتان سیم تن گوهرین پرند
طاؤس وار جلوه طرازند جا بجا
آن روی و موی و سینه و ساعد ازان تو
پیرایه هر چه از گهر و زر بود، مرا[1]

هجو کسی[2]

روزی زره ستم ظریفی
بر لاشهٔ جعفر چهارم
در خواهش پاسخ سوالات
صد بار فغان ز دم که قُم قُم
از زیست نیافتم نشانی
جز یک دوسه باره جنبش دم
از دیدن این شگرف روداد
گشتند بعرصه جمع مردم
زان ز مره یکی بمن رخ آورد
کای کرده طریقهٔ خرد گم
این پیکر خاص را به طنبور
البته روا بود ترنم
جز جنبش گوش و دم چه خواهی
از جعفر چارمین تکلم
ور بانگ زند حذر که جمهور
دانند نهیق را بسی شم

۱، ۲- معبد چین، باغ دودر-

این گونه کسان چه آفرینی
ای خالق آسمان و انجم

درباره عروسی میرزا یوسف

طراز انجمن طوی میرزا یوسف
قرار یافت دریں مه بحکم رب و دود

دو شنبه بست و دوم روز از مه شعبان
د میکه مهر نهد سوی قبله سر بسجود

کرم کنند و فزایند زیب بزم نشاط
بفر فرخ فرخندگی فزای ورود

بسر برند شب این جاکه تا سفیدۂ صبح
همین نظارۂ رقص است و استماع سرود

سپیده دم که ز فیض شمول نکهت گل
دم نسیم سحر مشکبار خواهد بود

شوند جانب کاشانۂ عروس روان
بشادمانی بخت مبارک و مسعود

سپس بهمرهی جمع وقت برگشتن
سپاس بنده نوازی همی توان افزود

تهنیت نوروز بنواب رام پور

نوروز و دو عید از دو جانب امسال
خوبست زروی وضع و نیک ست بفال

امید که این سه عید نذر نواب
آرند دوم عمر و عز و اقبال[۱]

۱- مکاتیب غالب طبع ۱۸۴۵ء صفحه ٦٨ سبد چین -

تهنیت عید بنواب رام پور

داد و دهش تو روز افزون بادا
بر دولت تو زمانه مفتون بادا
این عید و دو صد هزار عید دیگر
بر ذات تو فرخ و همایون بادا

تاریخ معاودت نواب رام پور از کلکته برامپور

چو نواب از بهر اجلاس کونسل
بکلکته از رام‌پور آورد رخ
عدو رابگیر و بکش زود ویرا
بجو سال اجلاس از بخت فرخ
چو گویند کز گشتن وی چه خواهی
بگو رفع اعداد وی اینت پاسخ

اعتذار بحضور نواب رام پور

هزارو دو صد وهشتاد و دو شمار کنند
بحسب ضابطه از هجرت رسول الله
چهار شنبه آخر بود ز ماه صفر
که می در آوردم این قطعه را بنظم پگاه
سفیدهٔ سحری کاغذ است و من راقم
سواد صفحه نمط روی بد سگال سیاه
همی نویسم و وقت نوشتنم باشد
دلی ز بیم لبالب چو لب ز عذر گناه
خدا کند که مشرف شود چو این قرطاس
بپیش مسند عالی ز بندهٔ در گاه

امیر کلب علی خان بہادر، از رہ لطف
بسوی غالب خونین جگر کنند نگاہ
که این فلک زده گر عرض کردا مصلحتی
بزعم بنده ز اخلاص بود ور ناگاه
خلاف طبع مبارک فتاده آن تقریر
بسی خطا رود از بندگان دولت خواه
تو پادشاه و شهنشاه تاجدار فرنگ
خطاب می طلبد بادشه ز شاهنشاه
چورای من نه پذیری ز جرم من بگذر
بحق اشهد ان لا الـه الا الله

در توصیف گورنر بعد خلعت یابی

پس از ادای سپاس خدای عز و جل
ثنای حضرت نواب می کنم انشا
امیر شاه نشان بلکه شاه والا جاه
چنانکه عز و علا را از وست عز و علا
چو خویش را هجهان بادشه نگو یاند
بنا گزیر تواں گفت اعظم الا مرا
فرا خور شرفش نیست این چنین تحسین
مگر بواسطه رحم و علم و حلم و حیا

۱- مرزا غالب نے نواب کلب علی خان کی خدمت میں لکھا تھا، کہ انگریزوں سے " مخلص الدولہ ۔ شمس الملک، بہرام جنگ " کا خطاب مانگیں (مکاتیب غالب طبع ۱۹۴۵ء صفحہ ۳۸ ' اس کے جواب میں نواب صاحب نے لکھا کہ ہمارا دستور خطاب طلبی نہیں' مرزا غالب سمجھ گئے کہ میرا مشورہ ناگوار گزرا لہذا یہ قطعہ لکھ کر معذرت کی ۔ جون یا جولائی ۱۸۶۵ء سے متعلق ہے۔
قطعہ حواشی مکاتیب ' سبد چین اور باغ دودر میں موجود ہے۔

توان شمرد مراورا ز اولیاء الله
زهی انیس مسیح و زهی ولی خدا

خیال مدحت ممدوح دانم و دارم
که حق مدح نخواهد شدن ز بنده ادا

چو حد نطق من این ست از مکارم مدح
به آنکه صرف شود حرف در سپاس عطا

زهی عطای گران مایهٔ گرامی قدر
که سود تارک من از شرف باوج سما

توان فگند بگیتی بنای هشت بهشت
ز هفت پارچه کان هر یکیست بیش بها

ز هفت جز و چسان هشت جز و بر سازند
مگر بمیمنت فرط خوبی اجزا

حمایل گہر و جیغه و دگر سر پیچ
چو روشنان فلک با فروغ و فرّ ضیا

بود مشاهده مہر و ماه و کاهکشان
شگفت بین که ببینند مہر و مه یکجا

چو بی طلب بمن اینہا رسیده است بود
ز بہر مطلب خویشم توقع امضا

توقع آنکه یکی ساڑی فکٹ یا بم
ز پیشگاه عنایات والی والا

سپہر مرتبه دارای دهلی و پنجاب
که پرچم علم اوست آسمان فرسا

بسر بلندی عالمی نظر دارد
از آنکه همره سر شد بلند دست دعا

حساب وسعت ملک تو باد روز افزون
شمار مدت عمر تو باد لا تحصی

در توصیف نمایش گاه رام پور

نمایشگهی در خور شان خویش
بر آرا ست نواب عالی جناب

بشب زهره و مه قنادیل سقف
بود پیشکارش بروز آفتاب

ز غالب چو پرسیده شد سال آن
چنین گفت آن رند خانه خراب

ازان رو که در بزم عیش و نشاط
ز بخشش جهانی شود کامیاب

چوبینی طرب را نهایت نماند
بود سال آن بخشش بیحساب [۱]

خدایا ! پسندد خداوند گار
که از طبع غالب رود پیچ و تاب

تاریخ دبستان نشینی دختر نواب رام پور

خجسته جشن دبستان نشینی بیگم
بفیض همت نواب و یمن اقبالش

چو از پی ادب آموزیست خوش باشد
اگر خجسته بهار ادب بود سالش [۲]

۱- سبد چین — باغ دودر - شعر آخر از مکاتیب غالب اضافه شده است -
۲- مکاتیب غالب -

تاریخ وفات رای چهجمل

گویند رای چهجمل شیرین کلام مرد
دیرینه دوست رفت ازین تنگنا دریغ
گفتم کس ز سال و فاتش نشان دهد
غالب شنید و گفت ، چه گویم ، بسا دریغ ،[۱]

تاریخ وفات ذوق

گویند رفت ذوق ز دنیا ، ستم بود
کاں گوهر گراں به ته خشت و گل نهند
تاریخ فوت شیخ بود ' ذوق جنتی ،
بر قول من رواست که احباب دل نهند[۲]

دیگر

تاریخ وفات ذوق ، غالب
با خاطر درد مند مایوس
خون شد دل زار تا نوشتم
خاقانی هند مرد افسوس[۳]

تاریخ وفات ناظر وحیدالدین

کرد چوں ناظر وحیدالدین ز دنیا انتقال
گفتم ، آیا بر کدام آئین بود سال وفات
گفت غالب کز سر زاری اگر نامش برند
خود همین ناظر وحیدالدین بود سال وفات[۴]

۱- باغ دودر -
۲- مبد چین ، باغ دودر -
۳- باغ دودر -
۴- باغ دودر -

تاریخ وفات سیدالعلما سید حسین رح

حسین ابن علی آبروی علم و عملی
که سید العلماء نقش خاتمش بودی

نماند و ماندی اگر بودی پنج سال دگر
غم حسین علی سال ماتمش بودی۱

تاریخ وفات نواب میر اصغر علی خان

گردید نہان مہر جہان تاب دریغ
شد تیره جہان بچشم احباب دریغ

این واقعه را زروی زاری غالب
تاریخ رقم کرد که نواب دریغ۲

تاریخ وفات نبی بخش

شیخ نبی بخش که با حسن خلق
داشت مذاق سخن و فہم تیز

سال و فاتش ز پئی یادگار
با دل زار و مژهٔ دجله ریز

خواستم از غالب آشفته سر
گفت مده طول وبگو رستخیز۳

۱- سبد چین ، اردوی معلی صفحه ۲۳۲ -
۲- سبد چین ، اردوی معلی صفحه ٦ -
۳- اردوے معلی و خطوط غالب مہیش پرشاد مکتوب بنام تفته ۱۸٦۰ع ۱۲۷۷ھ -

تاریخ وفات فتح‌النساء بیگم، جناب عالیه

جناب عالیه از بخشش حق
بفردوس برین چون کرد آرام
سخن پرداز غالب سال رحلت
''خلود خلد،، گفت از روی الهام[1]

۱۲۷۵ھ

تاریخ وفات زوجه نواب کلب علی خان

دریغا که ماند تہی قصر دولت
ز خاتون نامی سکندر زمانی
چو سیار روضه بود سال فوتش
سپس اسم وی باد جنت مکانی

تاریخ ولادت فرزند کسی

اندازه اسم و سال مولود
معلوم کن از خجسته فرزند
چون یکصد و بست و چار ماند
اینست شمار عمر دل بند

تاریخ ولادت فرزند

دربارهٔ اسم و سال مولود سعید
رفتست ز غالب سخنور توضیح
ارشاد حسین خان، سنین هجری ست
بنگر که خجسته رخ بود سال مسیح

۱- سبد چین، مکاتیب غالب صفحه ۶۴ -

تاریخ کامیابی سید غلام بابا خان

فتح سید غلام بابا خان
خود نشان دوام اقبالست

هم ازین رو بود که غالب گفت
که ظفر نامهٔ ابد سالست[۱]

تاریخ ولادت فرزند میر غلام بابا خان بهادر

میر بابا یافت فرزندی که ماه چارده
بر فراز لوح گردد گردهٔ تمثال اوست

فرخی بینی و یابی بهره از ناز و طرب
از سر ناز و طرب فرزند فرخ سال اوست[۲]

تاریخ ولادت فرزند میرزا باقر

بمن ز مقدم فرزند میرزا باقر
سروش تهنیت زبدهٔ مطالب گفت

چون قصد شد متعلق بگفتن تاریخ
طریق تعمیه ورزید و جان غالب گفت[۳]

آفرین بآمرزش تقصیر پسر

امروز شنیده ام که از مهر
تقصیر پسر معاف کردی

در جلد وی این چنین نکوئی
جان نذر کنم که نیک مردی

۱- باغ دودر، سبد چین۔
۲- سبد چین، اردوی معلی۔
۳- سبد چین۔

دربارۂ صلح مابین پدر و پسر

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد
حوریان رقص کنان ساغر شکرانہ زدند

قدسیان بہر دعاے تو و والا پدرت
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند[1]

اعتذار بنواب علاء الدین خان از سفر

خوانی بسوی خویش و ندانی کہ مردہ ام
دانی کہ مردہ را رہ و رسم خرام نیست

نی شیخ سدوام ، نہ الہ بخش مرگ من
از عالم جنابت و مرگ حرام نیست[2]

برائے گلستان خطی مہاراجہ الور

فرزانۂ یگانہ مہاراجہ راجہ راو
بادا بقایٔ دولت و اقبال جاودان

مہرش یکی ز کارگزاران بارگاہ
ماہش یکی ز ناصیہ سایان آستان

فرمود تا طراز گلستان کنند نو
زانسان کہ در بہار شود تازہ بوستان

آغا کہ حق سپردہ بدستش کلید گنج
تا کرد خامہ را بنگارش گہر فشان

۱- اردوے معلی بنام علائی مکتوب اکتوبر ۱۸۶۵ء -
۲- دیوان غالب عرشی ایڈیشن صفحہ ۳۶۴ مبد چین -

رخشید حسن جوهر الفاظ از مداد
ز انسان که در سواد شب انجم شود عیان
غالب طراز سال بدینگونه نقش بست
از روی طرز تعمیه در معرض بیان

هر کس که خواهد آگهی از سال اختتام
باید که دل نهد به گلستان بی خزان[۱]

دعا و سپاس بکر نیل هملٹن

کرنیل جارج ولیم هملٹن
فرخنده حاکم فرزانه داور
صبح طرب را مہر درخشان
شام شرف را ماه منور

در باغ دانش سر سبز گلشن
در بحر بینش یکدانه گوهر
صیت کمالش بر هفت گردون
ذکر جمیلش در هفت کشور

یا رب بگیتی با فرو شوکت
پیوسته بادا این داد گستر

مدح ڈپٹی کمشنر

کرم پیشه ڈپٹی کمشنر بہادر
که نقش نگین دل ماست نامش
دران بزم همچون منی را چه یارا
که خم گشته گردون ز بهر سلامش

---

۱ - سبد چین -

در سپاس گذاری و یاد آوری به عالی خدمت جناب آغا احمد علی صاحب جهانگیر نگری از جانب پوزشخواه بیراهه روی اسدالله خان غالب دهلوی

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخه ای
در خصوص گفتگوی پارس انشا کرده است

کیچ و مکران را که در سندست واز ایران جدا
شامل اقلیم ایران بیمحابا کرده است

قوم برہج را به ایرانی نژادان داده خلط
ترک ترکان سمر قند و بخارا کرده است

در جهان توأم بود روی وی و پشت قتیل
پیشوای خویش هندوزادهٔ را کرده است

هندیان را در زبان دانی مسلم داشته
تا چه اندر خاطر والای او جا کرده است

خوش بر آمد با همه هندوستان زایان چه خوش
تکیه آری بر ولادت گاه آباء کرده است

هر که بینی بازبان مولد خود آشناست
ساز نطق موطن اجداد بیجا کرده است

خواجه را از اصفهانی بودن آباء چه سود ؟
خالقش در کشور بنگاله پیدا کرده است

داوری گاهی بنا فرمود و دروی هرسه را
منصف و صدر امین و صدر اعلی کرده است

گر چنیں با هندیان دارد تولا در سخن
من هم از هندم چرا از من تبرا کرده است

کرده است از خوبی گفتار من قطع نظر
ظلم زین قطع نظر بر چشم بینا کرده است

میل او با هر کسی از هند ، و حیفش خاص من
حیف ومیلی بادو عالم شورو غوغا کرده است

مطلب از بد گفتن من چیست ، گوئی نیک مرد
مزد این کار از حق آمرزش تمنا کرده است

ورچنیں نبود ، چنان باشد که در عرض کمال
تا بر آرد نام این هنگامه برپا کرده است

صاحب علم و ادب وانگه ز افراط غضب
چون سفیهان دفتر نفرین و ذم وا کرده است

در جدل دشنام کار سوقیان باشد ، بلی
ننگ دارد علم زان کاری که آغا کرده است

انتقام جامع برهان قاطع می کشد
آنچه ما کردیم باوی ، خواجه باما کرده است

من سپاهی زاده ام گفتار من باید درشت
وای بروی گر بتقلید من اینها کرده است

زشت گفتم ، لیک داد بذله سنجی داده ام
شوخی طبعی که دارم ، این تقاضا کرده است

میکند تائید برهان لیک برهان ناپدید
نیست جز تسلیم قولش ، هر چه انشا کرده است

سستی طرز خرام خامه برهان نگار
یا نمیدانست یا دانسته اخفا کرده است

بهر من توهین و بهر خویش تحسین جا بجا
هم مرا هم خویش را در دهر رسوا کرده است

آید و بیند همان اندر کتاب ' مولوی ،
هر چه از هنگامه گیران کس تماشا کرده است

لغو و حشو وادعای محض و اطناب ممل
ماروموش و سوسمار و گربه یکجا کرده است

بگذر از معنی همین الفاظ برهم بسته بین
باده نبود شیشه و ساغر مهیا کرده است

یافتم از دیدن تاریخهائے آن کتاب
خود بدم گفت و به احباب خود ایما کرده است

غازیان همراه خویش آورد از بهر جهاد
تا نه پنداری که این بیکار تنها کرده است

جوش زد از غایت قهرو غضب چون درویش
تا زبانش را بدین کلپتره گویا کرده است

آتش خشمی که سوزد صاحب خود را نخست
دردلش همچون شرر در سنگ ماوا کرده است

چون نباشد باعث تشنیع جز رشک و حسد
باد غالب خسته تر گرخسته پروا کرده است

نظم

بر آنم به نیروی این تیغ تیز
که مغز عدو را کنم ریز ریز

عدو آنکه ''برهان قاطع،، نوشت
بگفتار سست و بهنجار زشت

اگر گفته آید که رو مرد و رفت
ز مغزش چه خواهی همی ای شگفت

زمغزش خرد جستم اما چه سود
که در زندگی نیز مغزش نبود

امید آنکه گفتار آن بی هنر
کنم هم بگفتار زیر و زبر

امید آنکه چون کار سازی کنم
بدیں نامه دشمن گدازی کنم

زہے نامه کز فر اقبال او
یکی ,,تیغ تیز،، آمده سال او

١٨٦٨ء